سلسلۂ مطبوعات
۱۹

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے

عروج و زوال کا اثر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

دسواں ایڈیشن

۱۴۰۱ھ - ۱۹۸۱ء

کتابت ——— مجاہد لکھنوی

طباعت ——— لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ (آفسٹ)

صفحات ——— ۴۸۲

قیمت ———

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع وناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(دارالعلوم ندوۃ العلماء)

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

(۱)	عربی	(کویت)	نواں ایڈیشن
(۲)	انگریزی	(لاہور، لکھنؤ)	چوتھا "
(۳)	اُردو	(لکھنؤ)	نواں "
(۴)	فارسی	(ایرانی)	دوسرا "
(۵)	ترکی	(انقرہ)	دوسرا "

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع پنجم

الحمد للہ کہ کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے پانچویں بار شائع ہونے کی نوبت آئی، علاوہ متعدد بار شائع ہونے کے اس کو اہلِ علم اور مصنفین کے حلقے میں جو قبولیت اور وقعت حاصل ہوئی ناچیز مصنف کو اس کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا، اصل عربی کتاب کے بھی پانچ ایڈیشن مصر میں نکل چکے ہیں، اور اگر مصر اور مشرق وسطیٰ کے حالات میں وہ شدید تغیر نہ ہوا ہوتا جو ۱۹۵۲ء سے مصر کے انقلاب کے بعد رونما ہوا تو اس سے کہیں زیادہ ایڈیشن نکل گئے ہوتے، مملکت سعودیہ کی وزارت تعلیم نے اس کتاب کو اپنے کلیات (کالجوں) کے نصاب میں داخل کیا ہے۔

کتاب کا انگریزی ترجمہ "ISLAM & THE WORLD" (اسلام اینڈ دی ورلڈ) کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اب انگلستان کا ایک موقر ادارہ " انگلش یونیورسٹیز پریس"

جو وہاں کے مختلف جامعات کا نمائندہ ہے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کرنے کی تیاری کر رہا ہے، اس سلسلہ میں قارئین کو یہ معلوم کرکے دلچسپی اور خوشی ہوگی کہ جب اس کتاب کو اس ادارہ نے اپنے علمی مشیروں اور ماہرین فن کے سامنے اظہار رائے کے لیے پیش کیا تو ڈاکٹر بکھنگم (لندن یونیورسٹی میں مڈل ایسٹ سکشن کے چیرمین) نے ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا کہ "کتاب کو برطانیہ سے شائع ہونا چاہیئے، کیونکہ اس صدی میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی جو کوشش بہتر سے بہتر طریقہ پر ہوئی ہے اس کا نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے" اس کے بالمقابل دوسرے ماہر فن سارجنٹ نے جو کیمبرج میں ڈاکٹر آربری کے معاون ہیں، یہ رائے دی کہ "اگر برطانیہ میں کسی کتاب کی درآمد پر پابندی لگانے کا رواج ہوتا تو میری سفارش یہ ہوتی کہ اس کتاب کے داخلہ پر پابندی عائد کی جائے، اس لیے کہ اس کتاب میں صرف مغربی تہذیب کی مذمت کی گئی ہے۔" ان دو متضاد آراء کے پیش نظر ادارہ نے اس کو ایک تیسرے صاحب نظر اور ماہر اسلامیات نامور مستشرق پروفیسر مونٹگمری واٹ صدر شعبۂ اسلامیات اڈنبرا یونیورسٹی کے حوالہ کیا کہ وہ اپنی فیصلہ کن رائے دیں، انھوں نے اس کتاب کو اشاعت کا مستحق قرار دیا اور اس کی طباعت کی تائید کی، گذشتہ سال ایران کے ایک سنجیدہ اور باوقار اسلامی ادارہ "جلسات علمی اسلام شناسی" (قم) نے اس کا فارسی ترجمہ "باضعف مسلمین دنیا در خطر سقوط"

کے نام سے شائع کیا ہے، معلوم ہوا ہے کہ وہ ایران میں شوق اور دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے، عرصہ ہوا بعض فاضل ترک دوستوں نے اسکے ترکی ترجمہ کی بھی تحریری اجازت حاصل کی تھی، اب تازہ اطلاع سے معلوم ہوا کہ وہ ترجمہ شائع ہو کر علمی حلقوں میں پہونچ گیا ہے۔

کتاب کی کمیابی کی وجہ سے کتاب کی جو طلب و خواہش پیدا ہو گئی تھی اُمید ہے کہ اس جدید اشاعت سے اس کی تکمیل ہوگی۔

ابوالحسن علی ندوی
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
ندوۃ العلماء لکھنؤ

دسمبر ۱۹۶۲ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کچھ کتاب کے متعلق

الحمد للہ رب العالمین، وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحابہ اجمعین
پیشِ نظر کتاب کا ابتدائی تخیل ایک مضمون سے زیادہ نہ تھا، ابتدا میں خیال تھا کہ اجمالی طور پر ان نقصانات کی نشان دہی کی جائے جو مسلمانوں کے تنزل و زوال اور دنیا کی قیادت و رہنمائی سے کنارہ کش ہو جانے سے انسانیت کو پہونچے اور دکھایا جائے کہ زندگی کے نقشہ میں ان کی جگہ اور قوموں کی صف میں ان کا مقام کیا ہے؟
اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو اس مجرمانہ کوتاہی کا احساس ہو جو انھوں نے انسانیت کے حق میں کی اور اس کی تلافی اور اصلاح حال کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو، اس کے ساتھ دنیا کو اپنی اس بدقسمتی کا کچھ علم ہو جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بنا پر دوچار ہونا پڑا، اور اس کو محسوس ہو کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا کی قیادت

مادہ پرست اور ناخدا ترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر ان خدا شناس اور خدا ترس انسانوں کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے، جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں کی ہدایات اور تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور انکے پاس آخری پیغمبر کی شریعت اور دین و دنیا کی رہنمائی کا مکمل دستور موجود ہے۔

اس مقصد کے لئے عام انسانی تاریخ نیز اسلامی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا گیا اور دکھایا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس جاہلی ماحول میں ہوئی، انسانیت کس پستی کو پہونچ چکی تھی، آپ کی دعوت اور تربیت نے کس طرح کی امت تیار کی، اس امت کے عقائد و اخلاق اور سیرت و تربیت کیا تھی، اس نے کس طرح دنیا کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی اسکے اقتدار اور امامت کا دنیا کی تہذیب اور زندگی اور لوگوں کے رجحانات اور کردار پر کیا اثر پڑا، کس طرح دنیا کا رخ ہمہ گیر خدا فراموشی اور مجموعی جاہلیت سے ہمہ گیر خدا پرستی اور اسلام کی طرف تبدیل ہوا، پھر کس طرح اس امت میں انحطاط اور زوال کا آغاز ہوا اور اس کو دنیا کی امامت اور قیادت سے علیحدہ ہونا پڑا، اور کس طرح یہ قیادت کمزور و غافل خدا شناسوں کے ہاتھ سے نکل کر طاقتور ناخدا شناس اور مادہ پرست یورپ کی طرف منتقل ہوئی، خود یورپ میں اس مادہ پرستی اور مذہب بیزاری کا کس طرح ظہور اور ارتقا ہوا، مغربی تہذیب کا اصلی مزاج کیا ہے اور اس کا خمیر کن عناصر و اجزا سے تیار ہوا ہے، یورپ کے اقتدار اور اسکی قیادت نے دنیا پر کیا اثر ڈالا اور زندگی کو کس طرح متاثر کیا، دنیا کا رخ کیا ہے اور مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے اور وہ اس ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

تحریک کے دوران ہی میں مصنف کو محسوس ہو گیا کہ یہ مضمون ایک مقالہ کا نہیں بلکہ مبسوط کتاب کا ہے اور اس کتاب کی تالیف وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، خود مسلمانوں کا ذہن اس بارہ میں صاف نہیں ہے وہ اپنا زندگی سے کوئی تعلق اور ربط محسوس نہیں کرتے، اور اس دنیا کی اپنے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمانوں کے زوال کو ایک قومی حادثہ اور مقامی واقعہ سمجھتے ہیں اور ان کو مطلقاً اس کا احساس نہیں کہ یہ کتنا بڑا عالمگیر سانحہ اور انسانیت کی کیسی بڑی بدقسمتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو نظرانداز کر کے ہم نہ اسلامی تاریخ کو سمجھ سکتے ہیں نہ انسانی تاریخ کو، نہ اس دور کی صحیح تشخیص کر سکتے ہیں جو آج بھی دنیا میں قائم ہے، نہ اس عالمگیر انقلاب کے صحیح اسباب معین کر سکتے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں رونما ہوا، اور وہ اسلامی انقلاب کے بعد سب سے بڑا انقلاب ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلا انقلاب شر سے خیر کی طرف تھا، یہ خیر سے شر کی طرف ہے۔ پہلا انقلاب بعثت محمدی اور دعوتِ اسلامی کے عروج کا نتیجہ تھا، دوسرا انقلاب امت محمدیہ کے انحطاط اور دعوتِ اسلامی سے تغافل کا نتیجہ ہے، مسلمانوں میں خود اعتمادی کی روح اسلام کی طرف بازگشت کا جذبہ اور جوش عمل پیدا کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ ان کو اپنا مقام یاد دلایا جائے اور بتلایا جائے کہ وہ دنیا کی تعمیر و تشکیل کے اہم اور نازک کام میں ایک موثر و فعال عنصر (FACTOR) ہیں کسی چلتی ہوئی مشین کا پرزہ اور کسی اسٹیج کے بازی گر اور نقال (ACTOR) نہیں ہیں۔

جس ملک و ماحول سے مصنف کا تعلق تھا اور جہاں اس کتاب کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا تھا اس کا اقتضا تھا کہ یہ کتاب اس ملک کی زبان (اردو) میں

تصنیف کی جائے لیکن ایک خاص خیال کے ماتحت اس کتاب کی تصنیف کے لئے اردو کے مقابلہ میں عربی کو ترجیح دی گئی۔

عربی زبان کی ترجیح و انتخاب کا محرک و باعث یہ احساس تھا کہ عرب ممالک اس احساس کمتری اور مرض خود فراموشی کا سب سے زیادہ شکار ہیں، دنیا نے اگرچہ انھیں سے نئی زندگی اور نیا ایمان پایا ہے لیکن آج انھیں کی فضا سب سے زیادہ خاموش اور انھیں کا سمندر سب سے زیادہ پُر سکون ہے، اقبال نے آج سے چند برس پہلے ان ملکوں کو دیکھ کر بجا نہیں کہا تھا کہ ؎

سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے | دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی | اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

یورپ کے قرب، مخصوص سیاسی حالات، اور ان دیوانوں کی کمی سے جو خوش قسمتی سے ہندوستان کی سرزمین میں برابر پیدا ہوتے رہے اور عرب کی مقدس سرزمین عرصہ سے ان کے وجود سے محروم تھی، عرب کو یورپ کی شیشہ گری اور فرزانگی کا آسانی سے شکار بن جانے دیا، شیخ حسن البنّاء مرحوم اور ان کی تحریک اور جماعت الاخوان المسلمون سے پہلے پورے مشرق اوسط میں کوئی طاقتور اسلامی تحریک اور جدوجہد نہیں تھی اور کہیں بے چینی اور اولوالعزمی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، لوگوں نے یا تو زمانہ سے صلح کر لی تھی یا مایوس ہو کر بیٹھ گئے تھے یا بہاؤ پر اپنی کشتی ڈال دی تھی، ان ممالک کے حالات پر نظر رکھنے والا اور ان کے ماضی و حال کا موازنہ کرنے والا بڑے درد و حسرت سے کہہ رہا تھا۔ ؎

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں | گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس تکلف دہ احساس نے قلم کا رُخ اردو سے عربی کی طرف موڑ دیا، عرب اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیہ کے اعتبار سے اسکے اہل ہیں کہ بین الاقوامی سیادت سنبھالیں اور پوری متمدن دنیا پر اثر ڈالیں، ان کے ممالک بحر احمر اور بحر متوسط کے کنارے واقع ہیں وہ مغرب اور مشرق بعید کے درمیان میں ہیں، نئے عالمگیر انقلاب اور اسلام کی نشأت ثانیہ کے لئے عرب ممالک اور مشرق اوسط سے زیادہ موزوں سرزمین کوئی اور نہیں ہو سکتی یہ سب اسباب و محرکات تھے جن کی بنا پر ہندی نژاد مصنف نے عربی زبان کو اس اہم موضوع کے لئے انتخاب کیا اور یہ کتاب سب سے پہلے عربی میں لکھی گئی جس کا نام "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" تھا۔

اسی عرصہ میں (۱۹۴۷ء میں) حجاز کا پہلا سفر پیش آیا وہاں پہلی بار مصنف کتاب کو اس ملک اور اہل ملک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جن کے لئے یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی، حجاز کے قیام اور عالم عربی کے لوگوں سے تعارف نے اس خیال کو اور تقویت پہونچائی اور اس کتاب کے جلد سے جلد شائع ہونے کی ضرورت کا احساس بشدت پیدا ہوا مکہ معظمہ کے دوران قیام میں مصنف کو محسوس ہوا کہ کتاب کا پہلا باب بہت تشنہ ہے، ضرورت ہے کہ جاہلیت کے خدوخال کو پوری وضاحت سے پیش کیا جائے اور پوری تفصیل سے دکھایا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی حالت کیا تھی اور وہ کیا دینی و اخلاقی، اجتماعی، سیاسی و معاشی ماحول تھا جس میں اسلام کی دعوت نمودار ہوئی، اسلامی انقلاب کی عظمت اور اس کا محیر العقول کارنامہ اس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا جبتک کہ جاہلیت کا پورا ماحول اور اس کا نقشہ سامنے نہ ہو، اسلئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جاہلیت کا

پورا مرقع پیش کیا جائے اس موقع پر یہ معلوم ہوا کہ جاہلیت کے متعلق بہت کم مواد یکجا ملتا ہے کچھ منتشر معلومات ہیں جو ہزاروں صفحات اور بیسوں کتابوں میں متفرق ہیں اس کو جمع کرنا اور ان منتشر و متفرق اجزا سے جاہلیت کا پورا مرقع تیار کرنا جس سے اس دور کی پوری زندگی سامنے آجائے سیرت نبوی کی بہت بڑی خدمت ہے مکہ معظمہ میں مصنف کو قدیم و جدید عربی مطبوعات کا ایسا ذخیرہ ملا جس سے اس مرقع کی تیاری میں بڑی مدد ملی، ہندوستان میں بھی مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ جاری رہا[1] اور یہ باب تکمیل کو پہونچ کر کتاب میں شامل ہوا اور اس سے کتاب میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال پیدا ہوا کہ بعثت محمدی کے اثرات اور دعوت اسلام کے امتیازات و خصوصیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے اس دعوت کا مزاج اور اس کا طریق کار کیا ہے، انبیاء علیہم السلام اپنے زمانہ کی بگڑی ہوئی دنیا کی کس طرح اصلاح کرتے ہیں، ان کی دعوت اور جد و جہد کا انداز دوسرے مصلحین و قائدین سے کس قدر مختلف ہے، ان کی دعوت کا ردعمل اور استقبال کس طرح ہوتا ہے جاہلیت کس طرح ان کے مقابلے میں آتی ہے اور کیا حربے استعمال کرتی ہے، وہ کس طرح اپنے متبعین کی تربیت کرتے ہیں پھر انکی دعوت کس طرح فتح حاصل کرتی ہے اور کس طرح کے اثرات و نتائج ظہور میں آتے ہیں ـــــــ

[1] مکہ معظمہ میں حاجی عبدالوہاب صاحب دہلوی کا قیمتی کتب خانہ اور ہندوستان میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا منتخب ذخیرۂ کتب اس باب کی ترتیب میں مصنف کے لئے بہت مددگار ثابت ہوا۔

یہ کتاب کا ایک ضروری باب ہے جس کے بغیر یہ کتاب نامکمل رہتی۔

مصنف کو اس کا انتظار اور اہتمام تھا کہ یہ کتاب مصر میں کسی وقیع ادارہ کی طرف سے شایع ہو اور اس کا شایان شان تعارف ہو تا کہ اس سے وہ مقصد حاصل ہو جو مصنف کے پیش نظر تھا عرصہ کے انتظار کے بعد کتاب کی اشاعت کے لئے "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" کو انتخاب کیا گیا جو مصر کا ایک سنجیدہ اور باوقار تصنیفی ادارہ اور دارالاشاعت ہے اور جو اپنی بلند پایہ علمی مطبوعات و تالیفات کی وجہ سے پورے مشرق اوسط میں شہرت اور وقعت حاصل کر چکا ہے، کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے اسی ادارہ کے صدر ڈاکٹر احمد امین (سابق پرنسپل کلیۃ الادب جامعۂ مصریہ) کو زحمت دی گئی جو اپنی مشہور تالیفات فجر الاسلام ضحی الاسلام کی بنا پر عالم گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں، مصنف کتاب پر ان کی سلامت فکر، دقت نظر اور اصابت رائے کا اچھا اثر تھا، کتاب کا مسودہ ان کی خدمت میں بھیجا گیا اور ان سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی گئی، انھوں نے کمیٹی سے اس کتاب کی اشاعت کی پر زور سفارش کی اور مصنف سے مقدمہ لکھنے کا وعدہ کیا کتاب کے اشاعت کے بعد معلوم ہوا کہ مصنف نے "مقدمہ نگار" کے انتخاب میں غلطی کی، کسی کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے مقدمہ نگار کا سلیم الفکر دقیق النظر اور وسیع المطالعہ ہونا کافی نہیں، اس کی بھی ضرورت ہے کہ مقدمہ نگار کو کتاب کے موضوع سے ہمدردی اور اس کے نتائج بحث سے اتفاق ہو اور وہ مصنف کے مقصد کا پرجوش داعی اور وکیل ہو، اس پر پورا الیقین رکھتا ہو اور اس کی کامیابی کا دل سے متمنی ہو، مقدمہ نگار میں اس خصوصیت کی کمی تھی وہ محض مصنف دمفکر اور

ایک کامیاب مؤرخ ہیں، اسلام کی نشأت ثانیہ اور اسکی عالمی قیادت کی طرف سے نہ کچھ زیادہ پُرامید نہیں، وہ اس کو بھی ایک علمی اور تاریخی مسئلہ کی طرح سوچ سکتے ہیں مگر اس کے لئے اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ اور ولولہ نہیں رکھتے، اس طرح اُن کو دراصل کتاب کی اصل روح سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا مقدمہ روح اور تاثیر سے خالی اور ایک ضابطہ کی خانہ پُری سے زیادہ نہ تھا، مصروشام و فلسطین و حجاز میں ہر جگہ یہ محسوس کیا گیا کہ مقدمہ نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کے بجائے اسکی روح کو نقصان پہونچایا ہے اور کتاب کو ہلکا کر دیا ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور مصنف کو اپنی غلطی کا احساس تھا، بایں ہمہ کتاب کا "لجنة التالیف والترجمة والنشر" کی طرف سے شائع ہو جانا کتاب کے لئے مفید ہوا کتاب ان حلقوں میں بھی پہونچ گئی جہاں خالص دینی کتابیں اور اسلامی دعوت کے سلسلہ کی چیزیں آسانی سے بار نہیں پاتیں، ۱۹۵۱ء میں جب مصنف کتاب کو شرق اوسط کی سیاحت کا موقع ملا تو اس کو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ کتاب بڑے شوق سے پڑھی گئی تھی اور بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال ہوا تھا، کتاب کی اشاعت کے دو تین مہینے کے اندر اندر وہ تمام عرب ملکوں میں پہونچ گئی تھی اسلامی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی اور اسلامی فکر کے حلقوں نے بطور خود اسکی اشاعت اور تبلیغ کی تھی مصر میں اخوان کے ذمہ داروں نے اس کو اپنی تعلیمی و تربیتی سلسلہ میں شامل کیا تھا اور مطالعہ و تربیت کے حلقوں سے لے کر جیل خانوں تک اس کی اشاعت کی تھی، عدالت کی بحثوں اور پارلیمنٹ کی

تقریروں تک میں اس سے استفادہ و اقتباس کیا گیا تھا، جدید و قدیم دونوں حلقوں نے اس کی پذیرائی کی، جہاں یہ بات مصنف کے لئے سرمایہ سعادت اور موجب شکر ہے وہاں یہ عربوں کی فراخدلی، عالی حوصلگی اور حق پرستی کا بین ثبوت ہو کتاب کی جو پذیرائی اور اس کے گمنام اور بعید الوطن مصنف کی جو حوصلہ افزائی ان عرب ملکوں میں ہوئی اسکی توقع اپنے ملک میں بھی نہیں کی جا سکتی۔

مصر کے دوران قیام ہی میں کتاب کی دوسری اشاعت کی نوبت آگئی اس موقع پر مصنف کے مخلص دوست اور کتاب کے خاص قدردان ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ (سابق استاذ جامع ازہر، مرحوم پروفیسر اسلامی قانون قاہرہ یونیورسٹی) نے اپنی کمیٹی "جماعۃ الازہر للنشر والتالیف" کی طرف سے طبع ثانی کی پیش کش کی، اور مصنف کے ایماسے ڈاکٹر احمد امین سے اسکی اجازت حاصل کر لی اس موقع پر سابق غلطی کی تلافی کا امکان پیدا ہوا، اب اس کا موقع تھا کہ مقدمہ کے لئے ایسے موزوں شخص کا انتخاب کیا جائے جو کتاب کے مقصد اور روح پر پورا یقین رکھتا ہو اور اس کا پرجوش وکیل اور داعی ہو، اس مقصد کے لئے موزوں ترین شخصیت سید قطب کی ہو سکتی تھی، سید قطب مصر جدید میں اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، ان کا قلم ادھر چند برسوں سے نوجوانوں میں اسلامی روح اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے وقف ہے، ان کی ذات میں وسیع النظر عالموں کا مطالعہ جدید ادیبوں کا زور قلم اور اسلوب، داعی کا جذبہ اور اخلاص اور نومسلموں کا جوش جمع ہے، وہ اپنے حالات کے لحاظ سے مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود نومسلم ہی ہیں، تعلیم و تربیت اور ماحول نے ان کو اسلام سے بہت دور

اور بیگانہ کر دیا تھا، قرآن مجید کے مطالعہ اور تفکر اور مغربی تہذیب کی ناکامی اور افلاس نے ان کو پھر اسلام کی طرف واپس کیا اور وہ نئے جوش و خروش اور اعتماد و یقین کے ساتھ اسلام کی طرف آئے، وہ دار العلوم مصر کے فاضل ہیں انکی ادبی زندگی تنقید ادب سے شروع ہوئی جس میں انھوں نے بہت جلد اپنا مقام پیدا کرلیا النقد الادبی اور التصویر الفنی فی القرآن اور مشاهد القیامة فی القرآن، اس زمانہ کی یادگار اور ادبی حلقوں کی مقبول اور کامیاب کتابیں ہیں، عرصہ تک محکمۂ تعلیم سے متعلق رہے اسی سلسلہ میں بعض تعلیمی نظریات کے مطالعہ کے لیے ان کو امریکہ میں کچھ عرصہ قیام کرنا پڑا، وہاں مغربی زندگی کے تاریک پہلو کھلے طریقہ پر انکی نظر کے سامنے آئے اور مغربی تہذیب اور فلسفۂ زندگی کی ناکامی کو انھوں نے بچشم خود دیکھ لیا اس سے انکے ایمان و یقین اور اسلام کے تعلق میں بڑا اضافہ ہوا اور اسلامی دعوت کا نیا جوش پیدا ہوا، امریکہ سے آنیکے بعد وہ اسلام کے ایک پرجوش داعی اور مغربی تہذیب کے مبصر ناقد بن گئے اور ہمہ تن جدید اسلامی ادب کی ترتیب میں منہمک ہوگئے، ان کے فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ابدی اور عالمگیر پیغام مانتے ہیں جس کے بغیر دنیا کی نجات اور سلامتی نہیں، انکے اسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معذرت اور مدافعت کے قائل نہیں، وہ مغربی تہذیب کی بنیادوں پر تیشہ چلاتے ہیں اور اپنے حریف پر بڑھ کر حملہ کرتے ہیں، انکو اسلام میں کوئی کمزوری اور کمی محسوس نہیں ہوتی اور وہ اسکو ایک مکمل اور جامع دستور حیات کی طرح پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس لئے ان کی تحریریں پڑھنے والوں میں اعتماد و یقین کی ایک نئی روح اور مغربی نظام فکر کی حقارت پیدا

کر دیتی ہیں اور نوجوان ان کی تصنیفات و مقالات سے بہت متاثر ہوتے ہیں، ان کی کتاب" العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام " (اگرچہ مصنف کو اسکے بعض مقامات سے اختلاف ہے) اس طرز فکر اور اس طرز تحریر کا کامیاب نمونہ ہے اور جدید اسلامی ادب میں خاص مقام رکھتی ہے۔

سید قطب نے کتاب کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا تھا اور انکی ہفتہ وار مجلس مذاکرہ میں اس کتاب کی تلخیص اور اس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا تھا جس میں مصنف کو بھی حصہ لینے کا اتفاق ہوا تھا، مقدمہ کی فرمائش کو انھوں نے بہ مسرت قبول کیا اور ایسا مقدمہ لکھا جس میں کتاب کی پوری روح کھینچ لی، یہ مقدمہ جو اب کتاب کی زینت ہو کتاب میں ایک مستقل باب کا اضافہ کرتا ہے اور اس کا ایک اچھا خلاصہ ہے، سید قطب کے فاضلانہ مقدمہ کے علاوہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مرحوم نے بھی از راہ کرم ایک مقدمہ یا پیش لفظ تحریر فرمایا جس میں کتاب کے متعلق اپنے قلبی تاثرات اور علمی خیالات کا اظہار کیا، علاوہ بریں مصنف کے بے تکلف دوست شیخ احمد الشرباصی (استاذ جامع ازہر) نے مصنف کی لاعلمی میں اپنے مخصوص انداز میں صاحب کتاب کا تعارف کرایا اور اس کے مختصر حالات زندگی لکھے، ان دونوں مقدموں کے ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں یہ خیال کر کے کہ اصل عربی کتاب کی اشاعت میں معلوم نہیں کتنی تاخیر ہو، خود مصنف نے اس کو اُردو میں منتقل کر دیا تھا، یہ ترجمہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" کے نام سے شایع بھی ہو گیا، اس کتاب کی کتابت و طباعت اور کاغذ موضوع کی اہمیت اور کتاب کی حیثیت کے شایان شان نہ تھا ....

....

اس میں ابتدائی دونوں باب "بعثت محمدی سے پہلے" اور "بعثت محمدی کے بعد" (جو ۱۹۶۱ء کے بعد اضافہ کئے گئے تھے) اور متعدد اہم اضافے جو عربی اصل کی اشاعت کے وقت تک مسودہ میں موجود نہیں تھے، اب جب کہ کتاب کے مصر میں دو اڈیشن نکل چکے ہیں اور تیسرے کی تیاری ہے اور کتاب اپنے مضامین اور اضافات کی بنا پر دوچند ہو چکی ہے اُردو میں اس کی از سرِ نو اشاعت کا خیال پیدا ہوا، ان نئے ابواب اور اضافوں کے ترجمے کی فرصت مصنف کتاب کو ملنی بہت مشکل تھی اسلئے یہ خدمت اس نے اپنے عزیز رفیقوں کے سپرد کی، خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے بڑی خوبی سے یہ خدمت انجام دی اس خدمت میں سب سے بڑا حصہ مولوی عبد اللہ صاحب عباس ندوی استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء اور ان کے بعد مولوی محمد رابع ندوی استاذ ادب دار العلوم کا ہے کچھ مضامین اور حصے برادر عزیز محمد حسنی سلمہ کے قلم سے ہیں، مصنف ان تینوں عزیزوں کا شکرگزار اور دعاگو ہے کہ ان کی محنت سے یہ کتاب اشاعت کے قابل ہوئی اور اب اُردو میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

مصنف اس کتاب میں کسی انکشاف، خاص تحقیق اور اجتہاد کا مدعی نہیں نہ اپنے بارہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہے، کتاب ایک دیانتدارانہ تاریخی جائزہ ہے اور ایک قدرتی سوال کا معقول اور علمی جواب ہے، ممکن ہے یہ سوال بہت سے دماغوں میں آیا ہو اور مختلف طریقوں پر اس کا جواب دیا گیا ہو، مصنف کا کام یہ ہے کہ اس نے اس سوال کو اُبھار دیا ہے اور اس کو ایک مستقل موضوع بنا کر اس پر تاریخی مواد جمع کر دیا ہے، اگر اس سے کسی ضمیر میں نیا شعور اور کسی

دل میں نئی خلش پیدا ہو جاتی ہے تو مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے، ہر صالح انقلاب اور نئی تعمیر کے لئے ضمیر کی بیداری اور ذہن کی تیاری ضروری ہے، اسکے لئے تاریخ کی با مقصد ترتیب اور ایسی کتابوں اور مباحث کی ضرورت ہے جو ایک طرف علمی اطمینان اور قلبی انشراح پیدا کریں دوسری طرف پڑھنے والوں میں نیا حوصلہ، نیا یقین اور جوش عمل پیدا کردیں، مبالغہ اور تواضع دونوں سے الگ ہوکر یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اس سلسلہ کی ایک مفید اور اہم کڑی بن سکتی ہے اور اس سے اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کے تمام حلقے بلا اختلاف فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، وما توفیقی إلا باللہ علیہ توکلت والیہ أنیب

ابو الحسن علی
۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ

مُقدّمہ

مصر کے نامور اہل قلم سید قطب کے قلم سے

عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے ان میں ماضی پر اعتماد مستقبل کے بارہ میں امید اور حوصلہ پیدا ہو، اس دین پر ان کا ایمان و یقین تازہ اور زندہ ہو جائے جس کا نام تو وہ لیتے ہیں لیکن اسکی حقیقت سے نا آشنا ہیں، ان کا تعلق اس دین سے زیادہ تر نسلی اور موروثی ہے اور انھوں نے اس کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جدید تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟) خاص مقام رکھتی ہے۔

اسلام کی تعلیم سرداری و جہانبانی کی تعلیم ہے اسکی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ دین اپنے ماننے والوں میں بغیر کسی شائبۂ تکبر کے خودداری، بغیر کسی فریب

نفس کے اعتماد و یقین، اور بغیر دوسروں پر اعتماد اور ضعف کے یقین و توکل کی روح پھونکتا ہے۔ یہ عقیدہ انھیں متنبہ کرتا ہے کہ ان کے کاندھوں پر پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے، روئے زمین پر بسنے والی انسانی جماعت کی تولیت (Trusteeship) ان کے سپرد ہے، اور ان کا فرض منصبی ہے کہ وہ بھٹکے ہوئے انسانی گلہ کی پاسبانی کریں اور انسانوں کو دین محکم اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کا فرض انجام دیں، اور اس روشنی اور ہدایت کے ذریعہ جو ان کو خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ۔ (آل عمران آیت ۱۱۰)	تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (البقرہ آیت ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک معتدل امت بنادیا ہے تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر

پیش نظر کتاب اپنے ناظرین کے دل میں انھیں تمام احساسات کو ابھارتی ہے اور ان تمام حقائق کو دل میں اتارتی چلی جاتی ہے، لیکن کتاب کا اسلوب یہ نہیں ہے کہ

کہ صرف جذبات ابھار دے یا عصبیت کا جوش پیدا کردے۔ اس میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا گیا ہے جو بیک وقت وجدان وشعور اور فکر ونظر دونوں کو اپیل کرتے ہیں تاریخی واقعات اور اس عصر کے احوال ومتعلقات ایسے منصفانہ طریقہ پر پیش کئے گئے ہیں جس میں مصنف کی روشن دماغی صاف جھلکتی ہے، پھر فیصلہ واقعیت وصداقت اور قلب وضمیر کی بصیرت کے سپرد کیا گیا ہو جس کی وجہ سے کتاب کے مباحث کی تمام کڑیاں مربوط اور ایک دوسرے پیوست نظر آتی ہیں، اور کہیں بھی کسی مسئلہ میں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے میں غیر واقعیت یا تکلف کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ اس کتاب کی اولین خصوصیت ہے۔

اسلام سے پہلے اس دنیا کا کیا حال تھا، شرق وغرب، شمال وجنوب کا کیا نقشہ تھا، چین وعرب اور ہندسے لے کر روم وفارس تک معاصر دنیا کا عقلی وفکری مزاج کیا تھا۔ اس وقت کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا؛ جن مذاہب پر دین سماوی کا پرتو تھا مثلاً یہودیت ونصرانیت۔ یا جو بت پرست مذاہب تھے مثلاً ہندومت، آتش پرست ان کا کیا حال تھا؟ ان تمام باتوں کی اس کتاب میں مختصر لیکن بہت جامع اور واضح تصویر کشی کی گئی ہے اور یہیں سے کتاب شروع ہوتی ہے۔

درحقیقت یہ بہت ہی جامع مرقع ہے جو خطۂ ارضی کے صحیح خدوخال نمایاں کرتا ہے۔ اس مرقع کی ترتیب میں مؤلف نے کسی خود رائی اور قصد کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ اپنے جلو میں غیر مسلم قدیم وجدید مصنفین کو بھی لئے ہوئے ہیں جو قدرتاً اسلام کے معاند اور اس کے اظہار کو بدنما کرکے پیش کرنے والے ہیں جو اسلام کو [illegible]

منسوب ہے، مؤلف اس دنیا کی تصویر پیش کرتے ہیں جس پر جاہلی روح مسلط تھی اور اس وقت کا انسانی ضمیر گندہ اور روح متعفن ہو چکی تھی، معیار اور قدریں بگڑ چکی تھیں غلامی اور ظلم کا دور دورہ تھا اور انسانیت کی جڑ ایک طرف مجرمانہ عشرت پسندی اور دوسری طرف نامرادی و مردمی کے ہاتھوں کھوکھلی ہو رہی تھی، مزید برآں کفر و جہالت اور ظلمت و ضلالت کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے، مذاہب لاچار و بے بس تھے، ادیان سماوی پہلے ہی سے تحریف کا شکار ہو چکے تھے اور ان کو گھن لگ چکا تھا، دلوں سے انکی عظمت نکل چکی تھی، یہ مذاہب (خصوصاً نصرانیت) مذہب کے ڈھانچے رہ گئے تھے جن میں نہ کوئی روح تھی نہ کوئی زندگی صرف چند بے جان، بے روح مراسم کا نام مذہب رہ گیا تھا۔

زمانۂ جاہلیت کے اس نقشہ کو پیش کرنے کے بعد مؤلف نے دکھایا ہے کہ تعمیر انسانیت کے سلسلہ میں اسلام نے کیا کارنامہ انجام دیا اور جب اس کو کچھ کرنے کا موقع ملا تو کس طرح انسانی روح کو اوہام و خرافات سے نجات دلائی، ذلت و غلامی سے کس طرح انسانیت کی گلوخلاصی کرائی، مرض و فساد، ناپاکیوں اور گندگیوں، کمزوریوں اور ناتوانیوں سے کس طرح انسان کو نکالا، اور اپنے وقت میں اسلام نے کس طرح انسانی معاشرے کو ظلم و سرکشی اور انسانی تہذیب کو انتشار اور تباہی سے بچایا، سماجی طبقہ واریت سے، سلاطین کے جور و ستم سے اور مذہبی طبقہ (Priest-hood) اور مہنتوں کی غلامی سے آزاد کیا، اسلام نے نئی بنیادوں پر دنیا کی تعمیر کی، عقیدہ، اخلاق و ضمیر کو طہارت و پاکیزگی عطا کی، تعمیر و ایجاد کی بلند قدریں بخشیں، حریت پسندی اور اختراعی صلاحیتیں پیدا کیں، یقین، معرفت

وثوق و اعتماد، عدل و انصاف اور خودداری عطا کی، اور دنیا کے صحیح نشو و نما اور متوازن ارتقا کے لئے عمل پیہم اور سعی مسلسل پر آمادہ کیا کہ زندگی کی پوشیدہ طاقتیں بروئے کار آئیں اور پھولیں پھلیں، صحیح مردم شناسی سے کام لے کر دنیا کی تعمیر و ترقی کے کام میں ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھا اور اس سے وہ کام لیا جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا۔

یہ سب اس وقت کی بات ہے جب کہ عالم کی زمام کار اسلام کے ہاتھوں میں تھی، اس کو اپنی مرضی کے مطابق اور اپنے ڈھنگ سے کام کرنے کا موقع حاصل تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے جوہر اسی وقت کھلتے ہیں جب اس کے ہاتھ میں قیادت ہو اس لئے کہ اسلام کا عقیدہ سروری و جہانبانی کا عقیدہ ہے، وہ قیادت کا ایک نظام ہے، وہ انسانی قافلے کی سربراہی کر سکتا ہے، کسی کا دریوزہ گر نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد وہ وقفہ آتا ہے جب زمام قیادت اسلام کے ہاتھوں سے نکل گئی جس کا سبب یہ تھا کہ خود مسلمانوں میں زوال آگیا اور وہ اس عالمی قیادت سے دستبردار ہوگئے، جس کی ذمہ داری ان پر اسلام کی طرف سے عائد ہوتی تھی اور انسانیت کی تولیت (TRUSTEESHIP) اور ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے جو ترکے کے طور پر ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔

اس جگہ مؤلف نے اس روحانی و مادی زوال کے اسباب بیان کئے ہیں اور ان نقصانات کو واضح کیا ہے جو خود مسلمانوں کو اٹھانے پڑے جب کہ وہ اپنے دین کے اصولوں سے منحرف ہوگئے اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہونے لگے یہیں اس مبارک

قیادت سے محروم ہونے اور پہلی جاہلیت کی زندگی اختیار کرلینے کے بعد دنیا پر کیسی گزری؟ یہاں مؤلف نے اس ہولناک پستی کی نشاندہی کی ہے جس کے سبب غار میں انسانیت اپنے سر کے بل گری، بدقسمتی سے اس پستی کا زمانہ وہی زمانہ ہے جس میں علم وفن کی راہیں کھلیں اور انسانیت نے مادی میدان میں بڑی ترقی حاصل کی۔ مؤلف محترم نے اس پستی کی نشاندہی کرنے میں آتش بیانی یا سنسنی پیدا کرنے والا طرز نہیں اختیار کیا ہے بلکہ بحث ونظر سے کام لیا ہے اور واقعات کو پیش کردیا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں جن حقائق کو پیش کیا ہے وہ خود ہر طرح کی مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی سے بے نیاز ہیں۔

اس تاریخی جائزہ کے وقت کتاب کا پڑھنے والا بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ موجودہ قیادت بدلنے کی سخت ضرورت ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انسانیت کو پھر اسی سرچشمۂ ہدایت پر لاکر کھڑا کردیا جائے، جس ہدایت کا منشا ہی یہ تھا کہ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف اور جاہلیت سے نجات دلاکر علم ومعرفت کی طرف لائے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس قیادت کی کیا عالمگیر اہمیت ہے اور اسے کھوکر انسانیت کو کتنا بڑا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے اور اس خسارہ میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا شریک ہے، کہ یہ اتنا وسیع خسارہ ہے جو ماضی وحال اور مستقبل قریب وبعید سب پر حاوی ہے، اس کے ساتھ ہی مسلمان کے دل میں ندامت وشرمندگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس نے کیسی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کا ارتکاب کیا، دوسری طرف اس کے اندر یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ اسے کیسی عظیم الشان صلاحیتیں بخشی گئی ہیں پھر اس عالمی قیادت کو

دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ بھی پیدا ہوتی ہے جو اس نے اپنی غفلت و ناقدری سے کھو دی ہے ۔

اس کتاب کی ایک قابل تعریف بات یہ ہے کہ مؤلف جہاں کہیں انسانیت کی پستی کا ذکر کرتے ہیں (وہ پستی جو تمام انسانوں پر محض اس وجہ سے آئی کہ مسلمان ان کی قیادت سے قاصر رہے) وہاں مؤلف اس پستی کو جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں، یہ اسلوب بیان بہت خوبی کے ساتھ مؤلف محترم کے انداز فکر کو واضح کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی روح اور اس مادہ پرستی کی روح (جو اسلام سے قبل دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور اسلام کی قیادت سے دستبرداری کے بعد آج بھی چھائی ہوئی ہے) کے درمیان کیا فرق ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جاہلیت اپنے مزاج اور روح کے اعتبار سے ایک ہی ہے، جاہلیت کسی محدود زمانہ کے کسی خاص وقفہ کا نام نہیں ہے، بلکہ عقل و فکر کی ایک خاص اور متعین ساخت کا نام ہے، وہ فکری ساخت اس وقت ابھرتی ہے جب کہ انسانی زندگی کے وہ حدود اور وہ معیار باقی نہیں رہتے جو خدا نے مقرر کئے ہیں اور ان کی جگہ بنائے ہوئے وہ مصنوعی معیار آجاتے ہیں جن کی بنیاد وقتی خواہشات پر ہوتی ہے، جس کو آج دنیا اپنے ارتقائی دور میں بھی اسی طرح جھیل رہی ہے جس طرح اپنے بربریت اور جہالت کے ابتدائی زمانہ میں جھیل رہی تھی، فاضل مؤلف کتاب کے آخری باب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

عالم اسلامی کا پیغام اللہ، رسول اور اسکی قیادت پر ایمان لانے کی دعوت دینا ہے اس کا صلہ یہ ملے گا کہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی

کی طرف، انسان کی عبادت سے نجات پاکر، اللہ کی عبادت
کی طرف، دنیا کی تنگنائی سے نکل کر عالم کی وسعت کی طرف،
مذاہب کے جور و ستم سے بچ کر عدل اسلامی کی طرف آنا نصیب ہوگا
اس پیغام کی اہمیت سامنے آچکی ہے اور اس زمانہ میں اس کا
سمجھنا دوسرے زمانہ کی بہ نسبت زیادہ آسان اور سہل ہے
آج جاہلیت سر بازار رسوا ہو چکی ہے، اس کے چھپے ڈھکے
عیب نگاہوں کے سامنے آگئے ہیں، دنیا اس سے عاجز
آچکی ہے لہذا جاہلی قیادت کو چھوڑ کر اسلامی قیادت کی
طرف منتقل ہونے کا یہ خاص وقت ہے، بشرطیکہ عالم اسلامی
اس کے لئے کھڑا ہو اور اس پیغام کو پورے عزم و اخلاص اور
جرأت و ہمت کے ساتھ اپنا لے اور اس پیغام کو دنیا کا نجات
دہندہ باور کرے اور یقین کرے کہ پستی و تباہی سے دنیا کو
صرف یہی پیغام نجات دلا سکتا ہے۔۔۔۔۔"

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے اس بنا پر نہ صرف یہ کتاب دینی و اجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہیئے۔

علمائے مغرب نے دنیا کی تاریخ مغربی نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور وہ قدرتاً اپنی مادی تربیت، مادی فلسفے اور پھر مذہبی و قومی تعصب کے اثرات سے خالی نہیں

تھے، چنانچہ دانستہ یا نادانستہ ان کی تاریخ میں اغلاط اور جا بجا بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں کیونکہ انھوں نے انسانی زندگی کی بہت سی اہم قدروں کو فراموش کر دیا ہے، حالاں کہ انسانی زندگی کی تاریخ ان کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی، اور نہ ان قدروں کے جانے بغیر واقعات کی صحیح توجیہ ممکن ہے اور نہ نتائج اخذ کرنا درست ہو سکتا ہے، نیز یوروپین مورخین عموماً اپنے قومی و مذہبی تعصب کی بنا پر دنیا کا مرکز یورپ ہی کو سمجھ لیتے ہیں اور زندگی کے دوسرے اہم موثرات اور محرکات کو صرف اس لئے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یوروپ ان کا ماخذ نہیں ہے یا کم از کم بہت گھٹا کر اور ان کی اہمیت کو کم کر کے پیش کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہم لوگ عرصہ سے اسکے عادی چلے آرہے ہیں کہ جس طرح دوسری اشیاء یوروپ سے منگاتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی یوروپ ہی کے ماحول حاصل کریں اور ان تمام کمزوریوں کے ساتھ اس کو جوں کا توں لے لیں، حالانکہ ان کا طریقہ تصنیف اور طریق فکر ہی سرے سے ناقص اور پُر از اغلاط ہے کیونکہ انھوں نے انسانی زندگی کو ایک محدود زاویہ سے دیکھا ہے اور اس غلط اور محدود زاویۂ نگاہ سے وہ غلط نتائج کا شکار ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے جب مقدمات ہی دُرست نہ ہوں گے تو نتیجہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

پیش نظر کتاب تاریخ کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ان تمام امور پر نگاہ رکھی گئی ہے اور تمام محرکات اور مختلف قدروں کا لحاظ رکھا گیا ہو، کتاب کے پڑھنے والے غالباً اس کے متوقع نہ ہوں گے کہ ایک صاحب ایمان مؤلف جو اسلام کی روحانی طاقت پر یقین کامل رکھتے ہیں اور عالمی قیادت کو اسلام

کے پیش کرنے کا پر جوش جذبہ اُن کے دل میں موجود ہے جہاں قیادت کی صلاحیتوں پر گفتگو کریں گے وہاں روحانی قوت کے ساتھ ساتھ صنعتی وحربی صلاحیت کا بھی تذکرہ کریں گے اور جدید تعلیمی نظام اور اقتصادی و تجارتی خود کفالتی پر بھی سیر حاصل بحث کرینگے لیکن بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔

بلاشبہ اس کتاب میں انسانی زندگی پر اثر ڈالنے والے تمام عوامل کا ایک مربوط اور منظم تصور ہے، اسی مربوط و منظم تصور کے ساتھ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور امت اسلامیہ کو ایسا مشورہ دیا گیا ہے جس میں پورا اعتدال اور تناسب پایا جاتا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر (جس میں ارتباط و توازن، امور غلط انصاف اور علمی تحقیق کی بالعموم کمی ہوتی ہی) تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیئے اور کس انداز سے اسکو مرتب کرنا چاہیئے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ پیش نظر کتاب کے بارہ میں اپنے ان تاثرات کے اظہار کا موقع ملا اور بڑی مسرت ہے کہ مجھے اس کتاب کا مطالعہ عربی زبان میں نصیب ہوا، اس لئے کہ فاضل مؤلف نے اسی زبان کو اپنی تصنیف کے لئے اختیار کیا ہے اور آج دوسری بار مصر میں اسکے شائع ہونے کی نوبت آرہی ہے۔

"اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْاَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ"

سید قطب (شہیدؒ)

حلوان (مصر)

بابُ اوّل

بعثتِ محمدیؐ سے پہلے

چھٹی صدی مسیحی کی دنیا

چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخ انسانی کا تاریک ترین و پست ترین دور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جارہی تھی اس کے آخری نقطہ کی طرف پہونچ گئی تھی، روئے زمین پر اس وقت کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں اس کو گرنے سے روک سکے، نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہورہی تھی، انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور برے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا، پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی، جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے وہ ہواؤں کے طوفان

میں یا تو بجھ چکے تھے یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے صرف چند خدا شناس دل روشن تھے، جو شہروں کو چھوڑ کر چند پورے پورے گھروں میں بھی اجالا نہیں کر سکتے تھے۔ دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے اور زندگی کی کشمکش، اس کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادیت کے معرکہ میں شکست کھا کر اپنے فرائض قیادت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں باقی رہ گئے تھے انھوں نے بادشاہوں اور اہل دنیا سے ساز باز کر لی تھی، اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظام سلطنت و معیشت میں ان کے دست راست اور باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔

رومی اور ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی زعامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے وہ دنیا کے لئے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار و ذمہ دار تھے، مختلف اجتماعی اور اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں، ان کے افراد تعیش و تکلفات کی زندگی اور مصنوعی تمدن کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے، بادشاہ اور حکام خواب غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے، کام و دہن کی لذت اور خواہشات نفس کی تسکین کے سوا انکو دنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی اور مشغلہ نہ تھا، زندگی کی ہوس

اور لذت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ اُن کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی متوسط طبقہ کے لوگ (ہر زمانہ کے دستور کے مطابق) اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے، اور اس کی نقالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے، باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بار میں ایسے دبے ہوئے، اور غلامی اور قانون کی زنجیروں اور بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپایوں سے ذرا مختلف نہ تھی، دوسروں کی راحت کے لئے محنت کرنے اور دوسروں کے عیش و عشرت کے لئے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جتے رہنے اور جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصہ نہ تھا کبھی اگر وہ اس خشک و بے مزہ زندگی اور اس کے یکساں پن سے اکتا جاتے تو نشہ آور چیزوں اور سستی تفریحات سے اپنا دل بہلا لیتے اور اگر کبھی زندگی کے اس عذاب سے ان کو سانس لینے کا موقع ملتا تو فاقہ زدہ اور ندیدہ انسان کی طرح مذہب و اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانی لذتوں پر آنکھیں بند کر کے گرتے۔

دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی دینی غفلت و خود فراموشی، اجتماعی بے نظمی و انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رونما تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔

اقوام و مذاہب پر ایک نظر

اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے، ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئی تھی کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان

مذاہب کے پیشوا دنیا میں آکر اپنے دین کا حال دیکھ سکیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکتے۔

تہذیب و تمدن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا، نظام حکومت میں حد درجہ ابتری تھی، حکام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں الجھ کر رہ گئی تھیں، دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لئے کوئی دعوت تھی، درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ان کی زندگی کا سوتا خشک ہو چکا تھا، ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظام حکومت کے لئے مستحکم و معقول اصول۔

مسیحیت چھٹی صدی عیسوی میں

مسیحی مذہب میں کبھی بھی اس درجہ تفصیل و وضاحت نہ تھی کہ جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جا سکیں یا اسکی بنیاد پر تمدن کی تعمیر ہو سکے، یا اس کے زیر ہدایت کوئی سلطنت چل سکے، جو کچھ تھا وہ صرف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا جس پر توحید کے سادہ عقیدہ کا کچھ پرتو تھا، مسیحیت کا یہ امتیاز بھی اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ یہ مذہب سینٹ پال کی دستبرد سے بچا رہا، اس نے تو اگر رہی سہی روشنی بھی گل کر دی کیونکہ جس بت پرستانہ ماحول میں اسکی پرورش ہوئی تھی اور جن جاہلی خرافات سے وہ نکل کر آیا تھا، اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کر دی، اس کے بعد قسطنطین کا زمانہ آیا جس نے اپنے دور حکومت میں رہی سہی اصلیت بھی کھو دی، غرض یہ کہ چوتھی صدی

ہی میں مسیحیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی، جس میں یونانی خرافات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت (Neo-Platonism) اور رہبانیت کے اجزا شامل تھے، حضرت مسیحؑ کی سادہ تعلیمات کا عنصر اس مجموعہ میں اس طرح گم ہو کر رہ گیا تھا جیسے کہ ایک قطرہ کا وجود سمندر میں گم ہو جاتا ہے، بالآخر مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام رہ گیا تھا جو نہ روح میں گداز پیدا کر سکتے تھے نہ عقل کی افزائش کا سبب بن سکتے تھے نہ جذبات کو حرکت میں لا سکتے تھے اور نہ ان میں اسکی صلاحیت تھی کہ زندگی کے اہم مسائل میں انسانی قافلہ کی رہبری کر سکیں، اس پر تحریف و تاویل کی معصیت مستزاد تھی، جس کا انجام یہ ہوا کہ بجائے اسکے کہ نصرانیت علم و فکر کے دروازے کھولتی، وہ خود علم و فکر کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی ہو گئی اور صدیوں کے مسلسل انحطاط کے باعث محض ایک بت پرستی کا مذہب بن کر رہ گئی، سیل (SALE) جس نے انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، چھٹی صدی عیسوی کے عیسائیوں کے بارے میں کہتا ہے "مسیحیوں نے بزرگوں اور حضرت مسیحؑ کے مجسموں کی پرستش میں اس درجہ غلو کیا کہ اس زمانہ کے رومن کیتھولک بھی اس حد کو نہیں پہونچے[۱]"

رومی سلطنت میں مذہبی خانہ جنگی

پھر نفس مذہب سے متعلق کلامی مباحث اہم نے اور بے نتیجہ اختلافات کی شورش نے قوم کو الجھا دیا جس میں ان کی ذہانتیں ضائع ہوئیں اور قوائے عملیہ شل ہو گئے۔

۱؎ Sale's Translation. P. 62 (1896)

بیشتر ان خانہ جنگیوں نے بڑے پیمانہ پر خونی معرکہ کی شکل اختیار کرلی، مدارس، کلیسا اور لوگوں کے مکانات حریف کیمپ بن گئے تھے اور پورے کا پورا ملک خانہ جنگی (Civil war AR) کا شکار تھا، بحث یہ تھی کہ حضرت مسیح کی فطرت کیا ہے اور اس میں الٰہی اور بشری جزو کس تناسب سے ہیں؟ روم وشام کے ملکانی (Malkite) عیسائیوں کا مذہب یہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت مرکب ہے، اس میں ایک جزو الٰہی ہے اور ایک بشری، لیکن مصر کے منوفیسٹی (Monophysite s) عیسائیوں کا اصرار تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت خالص الٰہی ہے اس میں ان کی فطرت بشری اس طرح فنا ہوگئی ہے جیسے سرکہ کا ایک قطرہ سمندر میں پڑکر اپنی ہستی کو گم کردیتا ہے، پہلا مسلک گویا حکومت کا سرکاری مسلک تھا، بازنطینی سلاطین و اہل حکومت نے اس کو عام کرنے اور پوری مملکت کا واحد مذہب بنانے میں پوری قوت صرف کی اور مخالفین مذہب (مبتدعین) کو سخت ترین سزائیں دیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں مگر اختلاف اور مذہبی کشاکش بڑھتی ہی رہی، دونوں فریق ایک دوسرے کو ایسا ہی خارج از مذہب اور بددین سمجھتے تھے جیسے دو متضاد مذہب کے پیرو[1]، قیرس Cyrus کی نیابت مصر کے دس سال (۶۳۱ء تا ۶۴۱ء) کی تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز

---

[1] Alfred J Butler: Arab s Conquest of Egypt and the Last Thirty Years of the Roman Dominion P 29-30
DOMINION. P. 29-30

مظالم کی داستانوں سے لبریز ہے۔[1]

روم کی مشرقی ریاست میں اجتماعی بدنظمی کی انتہا کو پہونچ گئی تھی باوجود اس کے کہ عام

اجتماعی بدنظمی اور معاشی بے چینی

رعایا بے شمار مصائب کا شکار تھی، ٹیکس اور محصول دو گنے چوگنے بڑھ گئے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باشندے حکومت سے نالاں تھے اور اپنے ملکی حکمرانوں پر بدیسی حکومتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اجارہ داریاں (Monopolies) اور ضبطیاں مصیبت بالائے مصیبت تھیں، ان اسباب کی بنا پر بڑے پیمانہ پر فسادات اور لغاوتیں رونما ہوئیں چنانچہ ۵۳۲ء کے فساد میں تیس ہزار اشراد دارالسلطنت میں ہلاک ہوئے۔[2] اور ہر چند کہ وقت اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا لیکن لوگ اسراف اور فضول خرچی سے باز نہیں آتے تھے، اور اخلاقی گراوٹ کی جو سب سے پست سطح ہو سکتی ہے اس حد تک پہونچ چکے تھے، صرف ایک ہی لگن سب کے دل سے لگی تھی کہ جس طرح ممکن ہو زیادہ سے زیادہ مال کمانا چاہیئے، اور اس کو فیشن پرستی، عیش پسندی اور اپنی من مانی خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے۔ انسانیت و شرافت کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل چکی تھیں، تہذیب و اخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ لوگ ازدواجی زندگی پر تجرد کی زندگی کو

---

[1] P 183-189

[2] Encyclopaedia Britannica chap, Justin

ترجیح دیتے تھے تاکہ آزادی سے انھیں کھیل کھیلنے کا موقع ملے[1]. انصاف کا حال یہ تھا کہ بقول سیل (SALE) جس طرح اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور ان کے دام ٹھیرائے جاتے ہیں اسی طرح انصاف بھی فروخت ہوتا، رشوت و خیانت کی ہمت افزائی خود قوم کی طرف سے ہوتی تھی[2]، گبن کہتا ہے "چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت کا زوال اور اسکی پستی انتہا پر تھی[3]، اس کی مثال اس تنے تناور اور گھنے درخت کی تھی جس کے سایہ میں دنیا کی قومیں کبھی پناہ لیتی تھیں اور اب اس کا صرف تنا رہ گیا ہو جو روز بروز سوکھتا جارہا ہو[4]"

"تاریخ عالم برائے مورخین" کے مصنفین لکھتے ہیں:۔

"بڑے بڑے شہر جن میں تیزی کے ساتھ بربادی آئی اور پھر وہ سنبھل نہ سکے اور نہ اس لائق ہو سکے کہ اپنی عظمت رفتہ کو پھر زندہ کر سکیں وہ گواہ ہیں کہ بازنطینی حکومت اس زمانہ میں انتہائی انحطاط و تنزل کے عالم میں تھی اور یہ تنزل ٹیکس اور محصول میں زیادتی، تجارت میں پستی، زراعت سے غفلت، شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھا[5]"

یورپ کی شمالی و مغربی قومیں | وہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں

---

[1] The History of the Decline and Fall of the Roman Empire V. 3 P. 327

[2] Sales Translation P. 72

[3] Gibbon. V. V. P. 31 [4] P. 31

[5] Historian's History of the World V. VII. p. 175.

آباد تھیں، جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں، وہ جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں ابھی تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ بجز اسلامی و عربی اندلس (Spain) اس وقت تک منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا کہ علم و تمدن سے روشناس کرائے، نیز مصائب و حوادث نے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں، غرض ہر طرح یہ قومیں تمدن انسانی کے قافلہ کی شاہراہ سے الگ تھلگ تھیں، بہت حد تک یہ دنیا سے بے خبر تھیں اور دنیا ان سے تقریباً ناآشنا تھی، مشرق و مغرب کے ممالک میں جو انقلاب انگیز واقعات و تغیرات پیش آ رہے تھے ان سے ان قوموں کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، عقائد کے لحاظ سے یہ قومیں نوخیز مسیحیت اور فرسودہ بت پرستی کے درمیان میں تھیں، نہ دین سے متعلق ان کے پاس کوئی پیغام تھا اور نہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی مقام تھا، ایچ، جی ویلز (H. G. Wells.) کا بیان ہے" اس زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر یکجہتی اور نظام کے کوئی آثار نہ تھے"[۱]

رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے:۔

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی، اس دور کی وحشت و بربریت زمانۂ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے

---

[۱] A Short History of the World

تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ چکے تھے، اور اس پر زوال کی چھاپ لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہونچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔[1]

یہود یورپ، ایشیا، افریقہ میں بسنے والی یہود نام کی قوم دنیا کی تمام قوموں میں اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ اسکے پاس دین کا بہت بڑا سرمایہ تھا اور اس میں دینی تعبیرات و اصطلاحات سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی، لیکن یہ یہودی، مذہب و تمدن یا سیاست میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں بلکہ اُن کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ ہمیشہ ان پر دوسرے لوگ حکومت کریں اور ہمیشہ ظلم و استبداد، سزا و جلا وطنی اور مصائب و مشقت کے ہدف بنے رہیں، عرصہ دراز تک غلام رہنے اور انواع و اقسام کی سختیاں اور سزائیں جھیلنے کے سبب ان کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا، قومی غرور، نسبی تکبر، حرص اور مال و دولت کی حد سے بڑھی ہوئی طمع مسلسل سود کے لین دین سے ان میں مخصوص ذہنیت و سیرت اور قومی خصائل و عادات پیدا ہو گئے تھے جن میں وہ ہمیشہ منفرد رہے، کمزور یا مغلوب ہونے کے وقت ذلت و خوشامد، اور غالب ہونے کی صورت میں انتہائی بے رحمی اور بد معاملگی اور عام حالات میں دغا بازی

[1] The Making of Humanity v. P. 164

اور نفاق، سنگدلی و خود غرضی، منفعت خوری و حرام خواری، راہِ حق سے لوگوں کو روکنا ان کا قومی کردار تھا، قرآن کریم نے ان کی اس صورتِ حال کا جو چھٹی اور ساتویں صدی میں تھی بہت واضح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے اور بتلایا ہے کہ اخلاقی انحطاط، انسانی پستی اور اجتماعی فساد میں وہ کس منزل میں تھے اور کیا اسباب تھے جن کی بنا پر وہ ہمیشہ کے لئے عالم کی قیادت اور اقوام کی امامت سے معزول کردیئے گئے۔

چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہم رقابت و منافرت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا، شہنشاہ فوقا (Phocas) نے ان کی سرکوبی کے لئے مشہور فوجی افسر بونوسوس (Bonosus) کو بھیجا اس نے پوری یہودی آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے، سیکڑوں کو دریا میں غرق کرکے، آگ میں جلاکر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کردیا، ۶۱۴ء میں جب ایرانیوں نے شام کو فتح کیا، تو یہود ہی کے مشورہ و ترغیب سے خسرو نے عیسائیوں پر وحشیانہ مظالم کئے اور بیشتر عیسائیوں کو تہ تیغ کیا، ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل Heraclius نے زخم خوردہ عیسائیوں کے مشورہ سے سنہ ۶۲۳ء میں یہودیوں سے سخت انتقام لیا اور ان کا اس طرح قتل عام کیا کہ رومی مملکت میں صرف وہ

یہودی بچ سکے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا کہیں چھپے رہے۔[1]

اس سفاکی و بربریت اور اس خوں آشام ذہنیت کے ساتھ جس کا مظاہرہ ساتویں صدی کے ان دو عظیم ترین مذاہب نے کیا۔ اس کی کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے دورِ حکومت میں انسانیت کے پاسبان ثابت ہوں گے اور حق و انصاف، امن و صلح کا پیغام دُنیا کو سنائیں گے۔

ایران اور وہاں کی تخریبی تحریکات

تمدن دنیا کی تولیت و انتظام میں ایران روم کا شریک تھا لیکن بدقسمتی سے وہ دشمن انسانیت افراد کی سرگرمیوں کا بڑا ناممرکز تھا وہاں کی اخلاقی بنیادیں زمانۂ دراز سے متزلزل چلی آرہی تھیں، جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے متمدن و معتدل علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں اور فطری طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں ایرانیوں کو ان کی حرمت و کراہت تسلیم نہیں تھی، یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے اس نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کردیا[2] بہرام چوبیں جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمراں تھا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الخطط المقریزیہ ج ۴ ص ۲۹۲ اور
The Ar8b'S Conquest of Egypt P 133-134

[2] HistHrish's History of the wolld V 8 P84

اس نے اپنی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا[1]، پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کے بیان کے مطابق اس قسم کا رشتہ ایران میں کوئی ناجائز فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک عبادت اور کار ثواب سمجھا جاتا تھا، مشہور چینی سیاح (ہیون سیانگ) کا بیان ہے کہ ایرانی قانون و معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لئے کسی رشتہ کا بھی استثنار نہ تھا۔[2]

تیسری صدی عیسوی میں مانی دنیا کے سامنے آیا اس کی تحریک دراصل ملک کے بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت ردعمل اور نور و ظلمت کی مفروضہ کش مکش کا (جو ایران کا قدیمی فلسفہ ہے) نتیجہ تھا، چنانچہ اس نے تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تاکہ دنیا سے شر و فساد کے جراثیم ناپید ہو جائیں، اس نے اعلان کیا کہ نور، ظلمت کا امتزاج ہی شر کا باعث ہے اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے اس بنا پر اس نے نکاح کو حرام قرار دیا کہ انسان جلد سے جلد فنا ہو جائے اور نسل انسانی منقطع ہو کر نور کو ظلمت پر دائمی فتح حاصل ہو، بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے قتل کر ڈالا کہ یہ شخص دنیا کی تباہی کی دعوت دیتا ہے اس لئے قبل اس کے کہ دنیا ختم ہو اور اس کا مقصد پورا ہو اس کو خود ہلاک ہونا چاہیے، لیکن بانی مذہب کے قتل کے باوجود اس کی تعلیمات عرصہ تک زندہ رہیں اور اسلامی فتح کے بعد تک ان کے اثرات باقی رہے۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۳۸ [2] ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۳۰

ایران کی افتاد طبع نے پھر ایک مرتبہ مانی کی دشمن فطرت تعلیمات کے خلاف بغاوت کی، یہ بغاوت مزدک (پیدائش ۴۸۷ء) کی دعوت کی شکل میں سامنے آئی، اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان یکساں طور پر پیدا ہوئے ہیں انکے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے لہٰذا ہر ایک کو دوسرے کی ملکیت میں مساوی حقوق حاصل ہیں اور چونکہ مال اور عورت ہی دو ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے لہٰذا انھیں میں مساوات و اشتراک کی سب سے زیادہ ضرورت ہے شہرستانی کا بیان ہے "مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لئے حلال قرار دے دیا اور مال و زن کو مثل آگ، پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کردیا[1]" نوجوانوں اور عیش پسندوں کی مراد بر آئی اور انھوں نے اس تحریک کا پرجوش خیر مقدم کیا طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ شاہ ایران قباذ نے اس کی سرپرستی قبول کرلی اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک آگ کی طرح ملک میں پھیل گئی، پورے کا پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا، طبرانی کا بیان ہے کہ:

"اوباش اور آوارہ مزاج لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مزدک اور مزدکیوں کے پرجوش ساتھی اور دست و بازو بن گئے، عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے، اس تحریک کا اتنا زور ہوا کہ جو جہاں جس کے گھر میں چاہتا گھس آتا اور مال و زن پر قبضہ کرلیتا اور صاحب مکان کچھ بھی نہ کرسکتا، ان مزدکیوں نے قباذ کو ابھارا اور اسکو معزولی کی دھمکی دیکر

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی ص ۸۶

تیار کر لیا کہ وہ بھی اس دعوت کو اپنا لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عالم ہو گیا کہ نہ باپ اپنے لڑکوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو، کسی کا بھی اپنی کسی ملکیت پر اختیار اور قبضہ نہیں تھا[1]۔

طبری کا بیان ہے کہ "اس تحریک سے پہلے قباذ ایران کے اچھے فرمانرواؤں میں تھا لیکن مزدک کی پیروی کی وجہ سے حدود مملکت اور سرحدوں میں پراگندگی اور ابتری پھیل گئی[2]"

ایران کی شاہ پرستی ایران کے سلاطین جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہوا کرتا تھا اس بات کے مدعی تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے اہل ایران بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں، ان کا اعتقاد تھا کہ ان سلاطین کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے ان کی الوہیت کے ترانے گاتے اور انھیں قانون سے، تنقید سے، بلکہ بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے، فرط ادب سے ان سلاطین کے نام بھی اپنی زبان پر نہ لاتے اور نہ کوئی شخص ان کی مجلس میں بیٹھنے کی ہمت کر سکتا تھا، اہل ایران کا عقیدہ تھا کہ ان سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق ہے، اور کسی انسان کا ان سلاطین پر حق نہیں، شاہ ایران اپنی دولت میں سے جو تھوڑا بہت کسی کو دے دے یا اپنے دسترخوان سے کوئی ٹکڑا اٹھا کر کسی کو عطا کر دے وہ اس کا احسان و صدقہ ہو، کسی کا استحقاق نہیں لوگوں کو سوائے احکام کی بجا آوری کے کسی امر میں دخل نہ دینا چاہیئے، ملک و قوم پر حکومت کرنے کیلئے

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۸۸ [2] تاریخ طبری ج ص ۸۸

ایک خاص گھرانہ (کیانی خاندان) متعین تھا، اہل ایران سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت وتاج کے وارث اور ملک وسلطنت کے مالک ہوسکتے ہیں اور یہ حق وراثتاً بیٹے کو باپ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہے گا، اس حق میں کسی کو دست درازی کی مجال نہیں، چنانچہ یہ لوگ بادشاہِ وقت پر ایمان رکھتے تھے اور حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے کہ جس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی، اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ نہ ملتا تو بچہ ہی کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیتے اور اگر کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت ہی کو تاج شہنشاہی پہناتے، چنانچہ شیرویہ کے بعد اس کے ہفت سالہ بچہ اردشیر کو شہنشاہ تسلیم کیا گیا اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو طفلی کی حالت میں لوگوں نے بادشاہ بنایا اور کسریٰ کی لڑکی بوران بھی تخت نشین ہوئی اور دوسری بیٹی جس کا نام آزرمی دخت تھا وہ بھی حکومت کر چکی ہے[1]۔ کسی کو اس کا تصور بھی نہیں آیا کہ کسی سپہ سالار یا بڑے سردار یا کسی دوسرے لائق اور آزمودہ کار شخص کو (جیسے رستم و جابان تھے) انتظام سلطنت سپرد کردیں چونکہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مذہبی گھرانوں اور سرداروں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ لوگ عام انسانی سطح سے بلند ہیں اور ان کی شخصیتیں اور ان کے دل و دماغ دوسرے انسانوں سے الگ ہیں، ان اشخاص کو اہل ایران نے غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ و تاریخ ایران از مکاریوس ایرانی

اونچ نیچ کا فرق، طبقوں کا تفاوت اور پیشوں کی تقسیم ایرانی سوسائٹی اور نظام زندگی کا اٹل قانون تھا جس میں ردوبدل ممکن نہ تھا، پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کا بیان ہے:

"سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ تھا[1] حکومت کی طرف سے عوام الناس کو ممانعت تھی کہ وہ طبقۂ امراء میں سے کسی کی جائداد کو خرید سکیں[2]، سیاست ساسانی کا یہ محکم اصول تھا کہ ہرگز کوئی شخص اپنے اس رتبہ سے بلند تر رتبہ کا خواہاں نہ ہو جو اس کو پیدائشی طور پر یعنی از روئے نسب حاصل ہے[3]، کوئی شخص مجاز نہ تھا کہ سوائے اس پیشہ کے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرسکے[4]، شاہان ایران حکومت کا کوئی کام کسی نیچ ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے[5]، عوام الناس کی مختلف جماعتوں میں نہایت صریح امتیاز تھا، سوسائٹی میں ہر شخص کی ایک معین جگہ تھی[6]"

ایرانیوں کی قوم پرستی

اہل ایران اپنی ایرانی قومیت کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر اس قومیت و نسل کو فضیلت و برتری حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ خصوصی صلاحیتیں اور فطری قابلیتیں بخشی ہیں جن میں ان کا کوئی شریک و ہمسر نہیں، یہ لوگ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو بڑی حقارت و ذلت آمیز نگاہوں سے

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں ص۵۹۰ [2] ص۴۲۰ [3] ص۴۲۱ [4] ص۴۲۲ [5] ص۴۲۳ [6] ص۴۲۱

دیکھتے تھے اور ان کے لیے ایسے نام تجویز کرتے تھے جن میں توہین و تمسخر پایا جاتا۔

آتش پرستی اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات

چونکہ آگ اپنے پجاریوں کو ہدایت دینے اور اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ اپنے پجاریوں کے مسائل زندگی کو حل کرسکے، ان میں دخل دے اور مجرموں، گنہگاروں اور مفسدوں کا ہاتھ پکڑ سکے اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجوسیوں کا مذہب چند مراسم و روایات کا نام رہ گیا تھا جنھیں مخصوص اوقات اور خاص خاص مقامات پر ادا کر لیا کرتے تھے، وہ عبادت گاہوں سے باہر اپنے گھروں اور بازاروں، دائرۂ اثر اور سیاسی و اجتماعی امور میں تو اس میں یہ بالکل آزاد تھے، اپنی من مانی کرتے، ان کے خیالات جس رُخ پر چاہتے انھیں موڑتے رہتے یا پھر جو مصلحت اور وقت کا تقاضا ہوتا اس پر کاربند ہوتے، جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں عام طور پر مشرکوں کا حال رہا ہو۔

غرض اہل ایران ایسے مکمل اور جامع دین سے یکسر محروم تھے جو ان کے باطن کی اصلاح کرتا، ان کے اخلاق سنوارتا، نفسانی خواہشات کو دبانے اور نیک خواہشات کو ابھارنے کی اس میں طاقت ہوتی، وہ خاندان کا نظامِ زندگی ملک کا دستورِ حکومت ہوتا، جو سلاطین کی چیرہ دستیوں اور حکام کی زیادتیوں کی روک تھام کر سکتا، ظالم کا ہاتھ پکڑ سکتا اور مظلوم کے حق میں انصاف کرا سکتا، لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا آتش پرست ایرانیوں کو ایسا دین نصیب نہ تھا، اور اس طرح ایران کے مجوسیوں اور دنیا کے دوسرے لامذہب والا قانون افراد میں اخلاق و اعمال کے لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا۔

بودھ مت اور اس کے تغیرات

بودھ مت، اپنی سادگی اور اپنی انفرادیت عرصہ ہوا کھو چکا تھا، بودھ مذہب نے ہندوستان کے برہمنی مذہب کو اپنے میں شامل کرکے اور اس کے اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کرکے اجیا کہ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف تمدن ہند کا رجحان معلوم ہوتا ہے، اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا برہمنیت نے (جو عرصہ سے خار کھائے بیٹھی تھی) اس کو ہضم اور اپنے میں ضم کر لیا تھا۔ بہرحال یہ دونوں مذاہب جو عرصہ سے . . . . ایک دوسرے کے حریف چلے آرہے تھے باہم شیر و شکر ہو چکے تھے اور بدھ مت اب عرصہ سے بت پرستی کا ایک مذہب تھا، جن ممالک میں بھی اس مذہب کے پیرو گئے بت ان کے ساتھ رہے، یہ لوگ جہاں جاتے اور جس ملک میں پہنچتے گوتم کے مجسّمے نصب کرتے اور انکی شبیہیں تیار کرتے، انکی مذہبی اور تمدنی زندگی ان مجسموں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے،[۱] یہ مجسمے زیادہ تر بودھ مت کے دور ترقی میں

---

[۱] ٹکسلا (قدیم بدھ دار السلطنت) کے عجائب خانہ کی سیر کرنے والا ان مجسموں اور مورتوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہو جو بدھ مذہب کے مٹے ہوئے شہروں کی کھدائی کے بعد نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ مذہب اور اس کا تمدن خالص بت پرستانہ مذہب و تمدن بن گیا تھا، ڈاکٹر گستاولی بان نے بھی ہندوستان میں بدھ مذہب کے آثار اور یادگاروں کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالا ہو وہ تمدن ہند میں لکھتا ہو،

"سچ پوچھیے بدھ مذہب کو سمجھنے اور جاننے کے لیے اس مذہب کی یادگاروں کا مطالعہ کرنا چاہیے نہ کہ کتابوں کا، جو کچھ ہمیں ان یادگاروں سے ملتا ہو وہ ان کتابی مسائل سے جنکی تعلیم یورپی مصنفین کرتے ہیں بالکل علیحدہ ہو یہ یادگاریں ثابت کرتی ہیں کہ جس مذہب کو یورپی علماء الحادی مذہب بتاتے ہیں وہ فی الواقع بت پرست اور کثیر الآلہہ مذاہب کا سرتاج ہو" (تمدن ہند ص۲۲۵)

تیار ہوئے تھے، پروفیسر ایشوری ٹوپا اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں
بدھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت
پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں
اور جدتیں یکے بعد دیگرے نظر آرہی تھیں[1]۔"

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" DISCOVERY OF
INDIA) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کے متعلق لکھتے ہیں:

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنا دیا، بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ
بہت دولت مند ہوگئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر
رہ گئے اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں
میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک
باقاعدہ رائج رہنے کے بعد، بودھ مت کا تنزل شروع ہو گیا اس
عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی مسز رائس ڈیوڈس
(RHSE DAVIDS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"ان مریضانہ تخیلات کے گہرے سائے میں آکر گوتم کی اخلاقی تعلیم
نظر سے اوجھل ہوگئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ
پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لے لی، اور ہر ایک قدم پر ایک
نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا میں

---

[1] "ہندوستانی تمدن" (اردو) ایشوری ٹوپا

ذہن کی اُن پُر فریب تخلیقوں سے گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا اور ربانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔[1] مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں ہی میں گراوٹ پیدا ہو گئی اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہو گئیں دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ بودھ مت برہمنیت میں گھس مل گیا۔[2]

خلاصہ یہ کہ چین اور ان تمام ممالک کے پاس (جو بودھ مت کے پیرو تھے) دنیا کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا جس کی روشنی میں دنیا اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتی اور خدا کا سیدھا راستہ پاتی، اہل چین متمدن دنیا کے بالکل مشرقی کنارہ پر اپنی علمی اور مذہبی میراث کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے، جس میں نہ خود وہ کسی اضافہ کے خواہشمند تھے اور نہ دوسروں کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے اہل تھے۔

وسط ایشیا کی قومیں

مشرق اور وسط ایشیا کی دوسری قومیں (مغل، ترک، جاپانی وغیرہ بگڑے ہوئے بودھ مت اور وحشیانہ بت پرستی کے درمیان تھیں، نہ کوئی علمی دولت اُن کے پاس تھی اور نہ سیاست کا کوئی ترقی یافتہ نظام ان کے یہاں تھا، دراصل یہ قومیں اپنے عبوری دور میں تھیں، جاہلانہ بت پرستی سے نکل کر تمدن کی طرف آرہی تھیں اور چند قومیں ایسی بھی تھیں جو اس وقت تک بربریت اور زندگی کی ابتدائی منزل میں تھیں اور عقلی و تمدنی حیثیت سے ان کا دورِ طفولیت تھا۔

---

[1] تلاش ہند صفحہ ۲۰۱، ۲۰۳ [2] ایضاً

ہندوستان، مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے

ہندوستان کے مورخین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا (جو کسی زمانہ میں علم وتمدن اور اخلاقی تحریکات کا مرکز رہا ہے) پست ترین دور تھا، ہندوستان کے اردگرد دوسرے ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط رونما تھا اس میں یہ ملک کسی سے پیچھے نہ تھا اس کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات تھے جن میں اس ملک کو شان یکتائی حاصل تھی، ان خصوصیات کو تین عنوانات کے ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے (۱) معبودوں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت (۲) جنسی خواہشات کی ہیجانی کیفیت (۳) طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات۔

نت نئے دیوتا

چھٹی صدی عیسوی میں بت پرستی پورے عروج پر تھی، وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی، اس صدی میں تینتیس کروڑ ہوگئی، اس عہد میں ہر پسندیدہ شئے ہر کشش رکھنے والی اور زندگی کی کوئی ضرورت پوری کرنے والی چیز دیوتا بن گئی تھی جس کی پوجا کی جاتی تھی، اس طرح بتوں، اور مجسموں، دیوتاؤں اور دیویوں کا کوئی شمار نہ تھا، ان دیوتاؤں اور قابل پرستش اشیاء میں معدنیات و جمادات، اشجار و نباتات، پہاڑ اور دریا، حیوانات، حتی کہ آلات تناسل سب ہی شامل تھے اس طرح یہ قدیم مذہب، افسانوی روایات اور عقائد و عبادات کا ایک دیومالا بن کر رہ گیا، ڈاکٹر گستاولی بان "تمدن ہند" میں لکھتا ہے:۔

دنیا کی تمام اقوام میں ہندو کے لئے پرستش میں ظاہری صورت کا ہونا لازمی ہے، اگرچہ مختلف ازمنہ میں مذہبی اصلاح کرنے والوں نے ہندو مذہب

میں توحید کو ثابت کرنا چاہا ہے لیکن یہ کوشش بالکل بے فائدہ ہو، ہندو کے نزدیک کیا ویدی زمانہ میں اور کیا اس وقت، ہر چیز خدا ہو جو کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کر سکے، اس کے نزدیک پرستش کے لائق ہے، برہمنوں اور فلسفیوں کی نہ صرف کل کوششیں جو انھوں نے توحید قائم کرنے کے لئے کیں بلکہ کل وہ کوششیں بھی جو دیوتاؤں کی تعداد گھٹا کر تین پر لانے کے لئے عمل میں لائے محض بیکار اور رائیگاں گئیں، عوام الناس نے ان کی تعلیم کو سنا اور قبول کیا لیکن عملاً یہ تین خدا تعداد میں بڑھتے گئے اور ہر ایک چیز میں، ہر ایک رنگ بو میں اُن کے اوتار نظر آنے لگے۔[1]

چھٹی ساتویں صدی میں بت سازی کے فن نے بڑی ترقی کی، اس عہد میں یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا، سارے ملک میں بت پرستی کا دور دورہ تھا حتی کہ بودھ مت اور جینی مذہب کو بھی مذاق عام کا ساتھ دینا پڑا اور اپنی زندگی اور مقبولیت کو قائم رکھنے کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا پڑا، بت پرستی کے اس عروج اور مورتیوں اور مجسموں کی کثرت کا اندازہ چینی سیاح ہیون سیانگ (جس نے ۶۳۰ء اور ۶۴۴ء کے درمیان ہندوستان کی سیاحت کی ہے) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جس میں اس نے راجہ ہرش (۶۰۶ - ۶۴۷ء کے) جشن کی کیفیت سنائی ہے، ہیون سیانگ لکھتا ہے۔

"راجہ ہرش نے قنوج میں علمائے مذہب کا مجمع کرایا، کوئی پچاس ہاتھ

---

[1] تمدن ہند ص ۴۴۰-۴۴۱

اونچے مینار پر گوتم بدھ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی، اسکی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے سکر دیوتا کے لباس میں چتر برداری کی اور اس کے حلیف راجہ وائی کامروپ نے مگس رانی کی؎۱

ہوئن سیانگ نے ہرش کے خاندان یا درباریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کوئی تو شیو کا پرستار تھا اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہو گیا تھا، بعض لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے، بعض وشنو کی، ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لئے مخصوص کرے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے؎۲

جنسی بحران شہوانی جذبات اور جنسی (Sexual) میلان کو ابھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کے قدیم مذہب و تمدن میں ہیں کسی دوسرے ملک میں نہیں پائے جاتے، ملک کی مقدس کتابوں اور مذہبی حلقوں نے اہم واقعات، حوادث کے وقوع اور موجودات کے وجود کی توجیہ کے سلسلہ میں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہم اختلاط اور بعض دیگر گھناؤنی بیان کی توجہات کے بعض ایسے واقعات اور روایتیں بیان کی ہیں جن کو سن کر آنکھیں نیچی اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، ان حکایتوں کا سادہ لوح اہل مذہب پر جو بڑے اخلاص اور جوش ایمانی کے ساتھ ان کہانیوں کو دہراتے ہیں جو کچھ اثر پڑ سکتا ہے اس کا قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں، ظاہر ہے کہ ان کے اعصاب

؎۱ ہوئن سیانگ کا سفرنامہ "فوکوئی کی" (مغربی سلطنت) ؎۲ ایضاً

اور جذبات پر یہ روایتیں غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوں گی، اسکے علاوہ بڑے دیوتا (شیو) کے آلۂ تناسل (لنگم) کی پوجا ہوتی تھی اور بچے، جوان، مرد عورت سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر گستاولی بان اس کی اہمیت اور اسکے ساتھ اہل ہند کے شغف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہندوؤں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے بے انتہا اُنس ہے اُن کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو اسکے اعمال کو یہ نہایت اہتمام سے بجالاتے ہیں ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں، جن سے مراد مادہ خلقت کے دونوں جزو ہیں، اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں[۱]"

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ میں مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے[۲]، مندروں کے محافظ و منتظم بداخلاقی کا سرچشمہ تھے اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم (CORRUPTION) کا مرکز تھیں راجاؤں کے محل اور بادشاہوں کے درباروں میں بے تکلف شراب کا دور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود برقرار نہ رہتے۔

اس تن پروری و نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی، ریاضت و مجاہدہ (جوگ اور تپسیا) کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے

---

[۱] تمدن ہند صفحہ ۴۴۲ [۲] ستیارتھ پرکاش (دیانند سرسوتی) صفحہ ۳۴۴

کام لیا جاتا تھا، ملک ان دونوں سروں کے درمیان اعتدال و توازن سے محروم تھا، چند افراد نفس کشی اور روحانی ترقی میں مصروف تھے اور عام آبادی شہوانیت اور نفس پرستی کے دھارے میں بہی چلی جا رہی تھی۔

طبقہ واریت

کسی قوم کی تاریخ میں اس قدر بیّن طبقہ واری امتیاز اور پیشوں اور زندگی کے مشغلوں کی ایسی ہمہ گیر اور اٹل تقسیم کم دیکھنے میں آئی ہے جیسی ہندوستان کے قدیم مذہبی و معاشرتی قانون میں ہے، ذات پات کی تفریق اور پیشہ کی جکڑ بندیوں کی ابتدا وید کے آخری زمانہ سے شروع ہو جاتی ہے، آریوں نے اپنی نسل اور اس کی خصوصیات کو محفوظ رکھنے اس ملک میں اپنی فاتحانہ حیثیت قائم رکھنے اور اپنا تفوق و برتری برقرار رکھنے کے لئے اس طبقہ واری تقسیم اور نسلی امتیاز کو ضروری سمجھا، ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتا ہے:۔

"ویدک زمانہ کے آخر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مختلف پیشے کم و بیش آبائی ہوتے جارہے تھے اور ذات کی تقسیم شروع ہو چکی تھی اگرچہ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی، ویدی آریوں کو یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنی پرانی نسل کو اقوام مفتوحہ کے میل جول سے محفوظ رکھیں، اور جس وقت یہ قلیل التعداد فاتحین مشرق کی طرف بڑھے اور انھوں نے دیسی اقوام کے ایک بہت بڑے گروہ کو فتح کر لیا تو یہ ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی، اور مفتوحوں کو اس کا لحاظ کرنا لازمی ہو گیا، نسل کے مسائل کو آریہ سمجھ چکے تھے انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کوئی قلیل التعداد فاتح قوم اپنی پوری حفاظت نہ کرے تو وہ بہت جلد مفتوح اقوام میں کھپ جاتی ہے اور اس کا

نام و نشان باقی نہیں رہتا۔"[1]

لیکن اس کو ایک مرتب و مفصل قانون کی شکل دینے کا سہرا منوجی کے سر ہے منوجی نے پیدائش مسیح سے تین سو برس پہلے (جب ہندوستان میں برہمنی تہذیب عروج پر تھی) ہندوستانی سماج کے لئے اس قانون کو مرتب کیا اور تمام اہل ملک نے اس کو بالاتفاق قبول کیا اور اس نے بہت جلد ملکی قانون اور ایک مذہبی دستاویز کی حیثیت اختیار کرلی، یہ وہی قانون ہے جس کو ہم آج "منوشاستر" کے نام سے جانتے ہیں۔

منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں (۱) برہمن یعنی مذہبی پیشوا (۲) چھتری لڑنے والے (۳) ویش زراعت و تجارت پیشہ، اور (۴) شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے، منوشاستر میں ہے:-

"قادر مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔"[2]

اس دنیا کی حفاظت کے لئے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دیئے ہیں۔[3]

برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے لئے اور دوسروں کیلئے دیوتاؤں کے چڑھاوے دینا اور دان دینے لینے کا فرض قرار دیا۔[4]

---

[1] تمدن ہند صفحہ ۲۱۱ [2] منوشاستر باب اول ۳۱ [3] باب اول ۸۷ [4] باب اول ۸۸

"چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے
چڑھائے، وید پڑھے، اور خواہشات نفسانی میں نہ پڑے۔"[۱]
"ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے
چڑھائے، وید پڑھے، تجارت لین دین زراعت کرے۔"[۲]
"شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا وہ ان تینوں کی خدمت
کرنا ہے۔"[۳]

اس قانون نے برہمنوں کو دوسری ذاتوں کے مقابلہ میں اتنا امتیاز و تفوق
و تقدس عطا کیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر بن گئے، منوشاستر میں ہے:-
"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے، وہ
بادشاہ ہے کل مخلوقات کا اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت۔"[۴]
"جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے
بڑا ہے، کل چیزیں اسی کی ہیں۔"[۵]
"برہمن کو ضرورت ہو تو وہ بلا کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال
بہ جبر لے سکتا ہے۔ اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا کیونکہ
غلام صاحب جائداد نہیں ہو سکتا، اس کی کل املاک مالک کا مال ہے۔"[۶]
"جس برہمن کو رگ وید یاد ہے وہ بالکل گناہ سے پاک ہے، اگرچہ

---

[۱] باب اوّل ۸۹ [۲] باب اوّل ۹۰ [۳] باب اوّل ۹۱ [۴] باب اوّل ۹۹
[۵] باب اوّل ۱۰۰ [۶] باب ہشتم ۴۱۷

وہ تینوں عالم کو ناس کیوں نہ کر دے یا کسی کا بھی کھانا کیوں نہ کھائے۔[1]
بادشاہ کو کیسی ہی سخت ضرورت ہو اور وہ مرتا بھی ہو تو بھی اسے
برہمنوں سے محصول نہ لینا چاہیئے اور نہ اپنے ملک کے کسی برہمن کو
بھوک سے مرنے دینا چاہیئے۔[2]

سزائے موت کے عوض میں برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا،
لیکن اور ذات کے لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی۔[3]

اس قانون میں چھتری اگرچہ ویش اور شودر کے مقابلہ میں بلند ہیں لیکن برہمنوں کے مقابلہ میں وہ بھی ہیچ ہیں، منو لکھتے ہیں:-

"دس سال کی عمر کا برہمن اور سو سال کی عمر کا چھتری گویا آپس میں باپ بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں لیکن ان دونوں میں برہمن باپ ہے۔"[4]

بدقسمت شودر

باقی رہے اچھوت شودر تو وہ ہندوستانی سماج میں، اس شہری و مذہبی قانون کی رو سے جانوروں سے پست درجہ کے اور کتّوں سے زیادہ ذلیل تھے، منو شاستر میں ہے:-

"برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لئے نہایت قابل تعریف بات ہے اور اسکے سوا کسی اور جیسے کو بھی آئے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔"[5]
شودر کو اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہیئے کہ مال و دولت جمع کرے

---

[1] باب نہم ۳۱۷ [2] باب ہفتم ۱۳۳ [3] باب ہشتم ۳۷۹
[4] باب دوم ۱۳۵ [5] باب دہم ۱۲۹

کیوں کو شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دُکھ دیتا ہے۔"[1]

"اگر شودر د وجوں پر ہاتھ یا لکڑی اُٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا اور اگر وہ غصہ میں لات مارے تو اس کا پیر کاٹ ڈالا جائے گا۔"[2]

"اگر کوئی شودر کسی دوج کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا چاہے تو بادشاہ کو چاہیے کہ اسکے سُرین کو دغوا دے اور اسے ملک بدر کر دے یا اس کے سرین کو زخمی کرا دے۔"[3]

"اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اسکی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اسکو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے۔"[4]

"کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوے، اُلو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔"[5]

ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت

برہمنی زمانہ اور تہذیب میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا تھا جو ویدی زمانہ میں تھا، منو کے قانون میں (بقول ڈاکٹر لی بان) عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی ہے اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے۔[6]

شوہر مر جاتا تو عورت گویا جیتے جی مر جاتی اور زندہ درگور ہو جاتی، وہ کبھی

---

[1] باب دہم ۱۲۹ [2] باب ہشتم ۲۸۰ [3] باب ہشتم ۲۸۱ [4] منو شاستر [5] تمدن ہند ۲۳۷ [6] R C. Dutt P. 342-343

دوسری شادی نہ کرسکتی، اسکی قسمت میں طعن و تشنیع اور ذلت و تحقیر کے سوا کچھ نہ ہوتا بیوہ ہونے کے بعد اپنے متوفی شوہر کے گھر کی لونڈی اور دیوروں کی خادمہ بن کر رہنا پڑتا، اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو جاتیں، ڈاکٹر لی بان لکھتا ہے،

"بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منوشاستر میں نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی کیونکہ یونانی مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے"[1]

غرض یہ سرسبز و شاداب ملک جو فطرت کے خزانوں سے مالا مال تھا، سچے آسمانی مذہب کی تعلیمات سے عرصے سے محروم ہونے اور مذہب کے مستند ماخذوں کے گم ہو جانے کی وجہ سے قیاسات و تحریفات کا شکار اور رسوم و روایات کا پرستار بنا ہوا تھا، اور اس وقت کی دنیا میں جہالت و توہم پرستی، پست درجہ کی بت پرستی نفسانی خواہشات اور طبقہ داری نا انصافی میں پیش پیش تھا اور دنیا کی اخلاقی و روحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بدنظمی میں مبتلا تھا۔

عرب

دور جاہلیت میں عرب اپنی بعض فطری صلاحیتوں اور بعض عادات و اخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے، فصاحت و بلاغت و ادب و زبان دانی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، آزادی و خودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی، شہسواری و شجاعت میں وہ بے بدل تھے، عقیدہ کے پرجوش، صاف گو اور جری، حافظہ کے قوی، مساوات، بے تکلفی اور جفاکشی کے عادی، ارادہ کے پکے، زبان کے

[1] تمدن ہند صفحہ ۲۳۸

سچے، وفاداری اور امانت داری میں ضرب المثل تھے۔

لیکن انبیاءؑ اور انکی تعلیمات سے بُعد، ایک جزیرہ نما میں صدیوں کے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے۔ چھٹی صدی میں وہ تنزل و انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے، کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس میں دنیا کے امام تھے، اخلاقی و اجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہے تھے، غرض مذاہب کے اکثر محاسن سے وہ محروم اور جاہلی زندگی کی بدترین خصوصیتوں اور معائب میں مبتلا تھے۔

دورِ جاہلیت کے بُت

جہالت و جاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول و عام، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بتوں، اور مورتیوں کی (جن کو کسی زمانہ میں شفیع اور واسطہ یا مرکز توجہ بنانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا) صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ سے (جس کا خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت سے اب بھی اقرار تھا[1]) عملاً و قلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال (سجدہ، قربانی، حلف، دعا و استعانت) انھیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے، اور لاکھ میں ... کھلی بُت پرستی، خدا سے بے تعلقی اور

---

[1] ولئن سألتهم من خلق السموات والارض ليقولن اللّٰه۔

صریح شرک کا دور دورہ تھا۔[1]

عرب میں ہر ہر قبیلہ، ہر ہر شہر اور ہر ہر علاقہ کا ایک خاص بت تھا، بلکہ ہر گھر کا بت جدا تھا، کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے، جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بت کو حصول برکت کے لئے چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہونچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بت کو تبرکاً ہاتھ لگاتا۔[2] بتوں کے بارے میں بڑا غلو اور انہماک تھا، کسی نے تو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا کسی نے بت تیار کرا لیا تھا، جو بت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بت نہیں تیار کر سکتا تھا وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اسکے ارد گرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے،[3] خود خانہ کعبہ کے اندر (وہ خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا) اور اسکے صحن میں ۳۶۰ بت تھے۔[4] بتوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے یہ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ پتھر کی قسم سے جو کچھ مل جاتا اسکو پوجتے، بخاری میں ابو رجاء العطاردی سے روایت ہے کہ ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے

---

[1] عرب جاہلیت کے عقائد کی حقیقت اور شرک کا عقیدہ کے تدریجی ارتقا کو معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو شامی فاضل محمد عزت دروزہ کی کتاب "عصر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من القرآن" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن اور رسول قرآن کی روشنی میں) [2] کتاب الاصنام ص ۳۳ [3] ایضاً [4] صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح مکہ۔

اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بنا لیتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے۔ پھر اسی کا طواف کرتے،[1] کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھر لے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔[2]

معبودوں کی کثرت

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہو وہی حال عرب کا تھا، ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں فرشتے، جن، ستارے سب شامل تھے، فرشتوں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اسلئے ان سے شفاعت کے طلبگار ہوتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے، جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے، ان کی قدرت اور اثر اندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے۔[3]

کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کو پوجتی تھی۔[4] صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا، کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا، بنو تمیم دبران کی، لخم و جذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا۔[5]

اخلاقی و اجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں

---

[1] ایضاً کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ [2] کتاب الاصنام ص۳۳ [3] کتاب الاصنام ص۳۳

[4] کتاب الاصنام ص۳۴ [5] طبقات الامم (صاعد اندلسی) ص۴۳

اور امراض گھر کئے ہوئے تھے اور اس کے اسباب واضح ہیں، شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اس کا تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے، عربی زبان میں اسکے نام جس کثرت سے ہیں اور ان ناموں میں جن باریک فرقوں اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے اس سے اسکی مقبولیت وعمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے،[1] شراب کی دوکانیں بر سر راہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر پھریرا لہراتا،[2] جوا جاہلی زندگی میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی دلیل تھی،[3] تابعی عالم قتادہ کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤں پر رکھ دیتا تھا پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا اس سے نفرت وعداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی[4]

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے،[5] زنا کو کچھ زیادہ معیوب

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب المخصص (ابن سیدہ) الخمر ج ۱۱ ص ۸۲-۸۳ [2] سبع معلقات معلقہ شعر قد بت سامرہا الخ [3] دیوان الحماسہ قصیدۂ حجر بن خالد شعر واذا اہلکت فلا تریدی عاجزا الخ [4] ملاحظہ ہو تفسیر طبری تفسیر آیت انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء

[5] تفسیر طبری ج ۴ ص ۵۹-۶۹

بات نہ سمجھا جاتا اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب تھے اسکے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے، زنان بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں کھلی اس کا انتظام تھا۔[1]

عورت کا درجہ

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی اسکے حقوق پامال کئے جاتے اسکا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے[2]، دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی،[3] مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی، کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لئے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں[4]

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انھیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا، ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا، ایک اس پر عمل کرتا تھا دس چھوڑتے تھے، یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک کہ اسلام نہیں آیا،[5] بعض ننگ و عار کی بنا پر بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے،[6] عرب کے بعض شرفا اور رؤسا ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے اور انکی جان بچاتے۔[7] صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک،

---

[1] ملاحظہ ہو العقد الفرید کتاب الخیار دنیاد (ابن عبد ربہ) [2] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۲ [3] سورۃ النساء آیت ۱۹ [4] سورۃ الانعام آیت ۱۳۹ [5] میدانی [6] ملاحظہ ہو "بلوغ الارب فی احوال العرب" آلوسی۔

میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا،[1] بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی، جاہلی باپ دھوکہ دے کر اس کو لیجاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا، اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔[2]

قبائلی و خاندانی عصبیت و امتیاز قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی، اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے "انصر اخاک ظالما او مظلوما" یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، چنانچہ وہ اپنے حلیف اور بھائی کی ہر حال میں مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے خواہ وہ برسرحق ہو یا برسرِ باطل۔

عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا، بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ حج کے بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے، وہ عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے، کہنے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے،[3] ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا جس سے بیگار لیا

---

[1] کتاب الاغانی [2] ملاحظہ ہو سنن الدارمی ج ۱ باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الجہل والضلالۃ ص ۲ [3] سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۹

جاتا اور نہ کام پر لگایا جاتا کچھ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

جنگجو فطرت عرب فطرۃً جنگجو واقع ہوئے تھے اور ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا، جنگ ان کے لئے زندگی کی ایک ضرورت سے آگے بڑھ کر تفریح اور دل لگی کا سامان بن گئی تھی جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا، ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ "اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لئے ہم اپنے برادر و حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں"[1] ایک عرب شاعر دعا کرتا ہے کہ "میرا گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اکثر قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکا دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے اور اپنی تلوار کے جوہر دکھانے کا موقع ملے"[2]

جنگ کرنا اور خون بہانا ان کے لئے معمولی کام تھا، جنگ کو بھڑکانے کے لئے معمولی واقعات کافی تھے، وائل کی اولاد بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ جاری رہی جس میں پانی کی طرح خون بہا، ایک عرب سردار مہلہل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ "دونوں خاندان مٹ گئے، ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی، بچے یتیم ہوئے، آنسو خشک نہیں ہوتے، لاشیں دفن نہیں کی جاتیں"[3]، پورا جزیرۂ عرب گویا شکاری کا جال تھا کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکہ سے قتل کر دیا جائیگا، لوگ قافلوں میں اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اچک لئے جاتے تھے، یہانتک کہ عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قافلوں اور سفارتوں کیلئے چوکی پہرہ اور

---

[1] واحیانا علی بکر اخینا ؛ اذا مالم نجد الا اخانا (حماسہ) [2] اذا المهرة الشقراء ادرك ظهرها ؛ فشب الاله الحرب بين القبائل (حماسہ) [3] ملاحظہ ہو کتاب ایام العرب۔

مضبوط بدرقہ اور قبائل کے سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی، [1]

دُنیا کا عمومی جائزہ

ایک انگریز سیرت نگار آر، وی، سی، بوڈلے (R. V. C. Bodley) اپنی کتاب "پیغامبر" (The Messenger) میں زمانۂ بعثت کی دُنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک و اقوام کا تذکرہ کرتا ہوا:

"قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی، یہ ایک نزاع کا دور تھا جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اوّل ہی تباہ ہو چکی تھیں یا اپنے شاہی دور کے اختتام پر تھیں یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت، ایران کی عظمت اور روما کی شوکت و جلال سے متحیر تھی اور کوئی ایسی ایک شئے یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

یہودی تمام دُنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے ان کو کوئی مرکزی رہنمائی حاصل نہ تھی، حالات کے مطابق یا تو ان کو محض برداشت کیا جاتا یا اذیتیں دی جاتیں، کوئی ملک اُن کا اپنا ذاتی نہ تھا اور ان کا مستقبل اسی قدر غیر یقینی تھا جس طرح کہ آج ہے۔

پوپ گریگری اعظم (Gregory the Great) کے

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۳۳

حلقۂ اثر سے باہر مسیحی اپنے بہمل عقائد کے ہر قسم کے پیچیدہ معانی ایجاد کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف تھے۔

ایران میں تعمیر سلطنت کی صرف ایک کرن رہ گئی تھی، خسرو ثانی اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف تھا، اس نے روما کو شکست دے کر کیپیدوشیا (Capp adoc-a) مصر و شام پر قبضہ کرلیا تھا، اس نے ۶۲۳ء میں (جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت نبی ظاہر ہونے والے تھے) بیت المقدس کو تاراج کرکے مقدس صلیب کو چرا لیا تھا اور دارئے اوّل کی زیردست عظمت و شوکت کو دوبارہ قائم کرنا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مشرق وسطیٰ کی عظمت کو زندگی کی ایک نئی قسط مل گئی ہے، لیکن یہی نہ تھا بازنطینی رومی اب بھی اپنی اُڑی ہوئی چپتی رکھتے تھے جب خسرو اپنی فوج کو قسطنطنیہ کی فصیلوں پر لایا تو انھوں نے ایک آخری کوشش کر دکھائی۔

مشرق بعید میں حالات کوئی نمایاں اثرات نہیں چھوڑ رہے تھے ہندوستان اب بھی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں پر مشتمل تھا جو سیاسی اور حربی حیثیت سے ایک دوسرے پر فوقیت کے لئے جد وجہد میں مصروف تھیں۔

چینی ہمیشہ کی طرح آپس میں برد آزما تھے، خاندان سوئی آیا اور گیا اور اسکی جگہ ٹینگ نے لی جو تین صدیوں تک حکمراں رہا۔

جاپان میں پہلی مرتبہ ایک عورت تخت نشین ہوئی، بدھ مت جڑ پکڑنے لگا تھا، اور جاپانی تصورات اور مقاصد پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

اسپین اور انگلستان غیر اہم چھوٹے چھوٹے ملک تھے، اسپین ویسی گوتھوں (Visi Goths) کے زیر اثر تھا جو کچھ عرصہ پہلے ہی فرانس سے جس پر انھوں نے لوائر (Loire) تک قبضہ کر رکھا تھا نکالے گئے تھے وہ ان یہودیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے جن کو اس مسلم حملہ کے لئے جو ابھی سو برس بعد ہونے والا تھا آسانیاں پیدا کرنی تھیں جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں تقسیم تھا، ڈیڑھ سو سال رومیوں کو روانہ ہوئے ہو چکے تھے جن کی جگہ نارڈک لوگوں کی آمد نے لی تھی خود انگلستان سات مختلف بادشاہتوں پر مشتمل تھا۔[1]

زمانۂ جاہلیت کا سیاسی و معاشی نظام

جاہلی دنیا کی دینی، روحانی، اخلاقی و اجتماعی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکے سیاسی و معاشی نقشہ پر خصوصی نظر ڈال لیجائے کہ دینی و اخلاقی اور اجتماعی ترقی و انحطاط میں سیاسی و معاشی حالات اور رائج الوقت سیاسی و معاشی تصورات اور قوانین کا بہت بڑا دخل ہے اور وہ قومی زندگی کی تعمیر

---

[1] ۱۸ – ۱۹ (باختصار) ترجمہ سید قاسم حسنی

دتشکیل کا ایک اہم وفعال عنصر (Factor) ہے۔

مطلق العنان بادشاہت

زمانۂ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا، اس زمانہ کی ریاست مطلق العنان بادشاہت تھی، یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا، وہاں آل ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر اُن کا موروثی حق ہو اور انھیں تائیدِ الٰہی حاصل ہے، عام رعایا کو بھی پوری کوشش کرکے اس کا یقین دلادیا گیا تھا چنانچہ انھوں نے بھی اس اصول کو تسلیم کرلیا تھا اور حکومت کے بارہ میں اُن کا بھی عقیدہ ہوگیا تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قائم ہوتی تھی، اہلِ چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزندِ آسمان" کہتے تھے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان "نر" ہے اور زمین مادہ، اور کائنات کو انھیں دونوں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ خاقانِ اول زمین و آسمان کے جوڑے کی سب سے پہلی اولاد ہے[1]۔ اسی بنا پر شاہ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا، اس کو حق تھا کہ جو چاہے کرے، لوگ اس سے کہتے تھے کہ "آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں"۔ شہنشاہ لی یان یا تائی تزنگ جب مرا ہے، تو اہلِ چین نے سخت ماتم برپا کیا اور حد سے زیادہ غم کیا، کسی نے سوئیوں سے اپنا چہرہ خون آلود کیا، کسی نے اپنے بال کاٹے، کسی نے جنازہ سے اپنے کان مار مار کر زخمی کر لئے۔

---

[1] تاریخ چین از جیمس کا رکرن۔

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ، یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی جیساکہ سلطنت روما میں اعتقاد تھا، وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت کرنا بنیادی قانون تھا، دوسری قومیں اور دوسرے ممالک اس قومیت کے غلام تھے، ان کی حیثیت ان رگوں اور شریانوں کی سی تھی جن سے خون جاری ہوکر اپنے مرکز کو پہونچتا ہے، سلطنت روما ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز کرسکتی اور ہر ایک کی عزت و ناموس پامال کرسکتی تھی، وہ ہر ظلم وستم کو جائز سمجھتی تھی، رومیوں کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہوکر اور حکومت کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا اظہار کرکے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم وستم سے بچ نہیں سکتا تھا، کسی قوم کو حکومت خود اختیاری یا اندرونی خودمختاری کا حق نہیں تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ اپنے ملک میں اپنے داخلی حقوق سے مستفید ہوسکے، ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی جس پر بوقت ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اس کو چارہ دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے بھرا رکھ سکے، رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) رومی سلطنت کے بارہ میں لکھتا ہے:۔

"رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھتی ہوئی خرابیاں (مثلاً رشوت وغیرہ) نہ تھیں، بلکہ اصلی برائی اور بنیادی خرابی فساد وشر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشوونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی، یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی، کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور

کی بنیاد پر کی جائے گی تو اسکے گھن لگنے سے صرف ذہانتیں اور عملی سرگرمیاں نہیں بچا سکیں، اور چوں کہ خرابیوں ہی پر اس سلطنت کی بنیاد تھی اس لئے اس کا خاتمہ اور زوال بھی فطری تھا، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کی عیش اور راحت رسانی کا ذریعہ تھی اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور رعایا کا خون چوس کر شاہی قومیت کو غذا پہونچانا اس حکومت کا کام تھا، بلاشبہ روم میں تجارت امانت داری اور انصاف کے ساتھ جاری تھی اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سمجھی جاتی تھی اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت وقابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی لیکن یہ تمام خوبیاں حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتی تھیں اور نہ اساسی غلطیوں کے سخت انجام سے محفوظ رکھ سکتی تھیں"[1]

مصر وشام کی رومی حکومت

ڈاکٹر الفرڈ بٹلر (Alfred Butler) رومی حکومت کے بارہ میں لکھتا ہے :۔

"مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض و غایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر

---

[1] Robert Briffault The Making of Humanity P. 159

حکام کو فائدہ پہونچایا جائے، رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا، رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے، ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اسکو فکر نہ تھی، مصر پر اُن کی حکومت ان پردیسیوں کی سی حکومت تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتی ہے اور محکوم قوم کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی۔[1]

ایک عیسائی شامی مورخ شام میں رومی حکومت کے بارہ میں کہتا ہے:۔

"ابتدا میں رومیوں کا شامیوں کے ساتھ اچھا اور منصفانہ برتاؤ تھا اگرچہ ان کی سلطنت میں اندرونی طور پر خلفشار تھا لیکن جب ان کی حکومت بوڑھی ہوگئی تو اس نے بدترین قسم کی غلامی کی شکل اختیار کرلی اور بدترین معاملہ جو غلام اور رعیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہو اس نے اپنی محکوم رعایا کے ساتھ کیا، روم نے براہ راست شام کا بھی الحاق نہیں کیا اور شام کے باشندوں کو کبھی کبھی رومیوں کی طرح شہری حقوق نہیں حاصل ہوئے، نہ اُن کے ملک کو رومی سلطنت اور سرزمین کا درجہ ملا، شامی ہمیشہ غریب الوطن افراد کی طرح رعایا بن کر رہے، اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لئے اپنی اولاد کو بیچ دینے پر مجبور ہوگئے۔ مظالم کی زیادتی

---

[1] Arab's Conquest of Egypt and the Last Thirty years of the Roman Dominion. P 42

تھی، غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا، اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں"[1]

رومیوں نے شام پر سات سو سال تک حکومت کی، انکے آتے ہی ملک میں اختلافات، خودسری اور تکبر کی بنیاد پڑ گئی تھی اور قتل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، یونانیوں نے شام پر ۹۶۰ سو سال حکومت کی، اس پورے عہد حکومت میں بڑی سخت جنگیں ہوئیں رعایا پر مظالم ہوئے اور یونانیوں کے حرص و ہوس کی پوری کیفیت کھل کر ظاہر ہو گئی شامی قوم پر ان کی سلطنت بدترین نحوست اور سخت ترین عذاب تھی"[2]

خلاصہ یہ کہ بدیسی سامراج کے ہاتھوں روم و ایران کے ممالک انتہائی تکلیف و مصیبت میں تھے اور سیاسی، مالی، اقتصادی ہر لحاظ سے ملک کے تمام مرکز اور دار السلطنت حد درجہ ابتری کی حالت میں تھے۔

ایران میں خراج اور ٹیکس وصول کرنے کا انتظام

ایران میں سیاسی و معاشی نظام نہ عادلانہ تھا نہ مستحکم، بلکہ اکثر حالات میں بہت ہی ناہموار اور ظالمانہ تھا، خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے عمال کے اخلاق، ان کی خواہشات اور ملک کے جنگی اور سیاسی حالات کے مطابق یہ نظام

---

[1] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۱ صـ ۱۰۱ [2] ایضاً ج ۱ صـ ۱۰۱

بدلتا رہتا۔ "ایران بعہد ساسانیان" کا مولف لکھتا ہے:۔

"خراج اور ٹیکس کے لگانے اور وصول کرنے میں محصلین خیانت اور استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے تھے، چونکہ مالیات کی رقم سال بسال مختلف ہوتی رہتی تھی، یہ ممکن نہ تھا کہ سال کے شروع میں آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ہو سکے، علاوہ اسکے ان چیزوں کو ضبط میں رکھنا بھی بہت مشکل تھا بسا اوقات نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ادھر تو جنگ چھڑ گئی ادھر روپیہ ندارد، ایسی حالت میں پھر غیر معمولی ٹیکسوں کا لگانا ضروری ہوجاتا تھا اور تقریباً ہمیشہ اسکی زد غریب رعیت کے مالدار صوبوں خصوصاً بابل پر پڑتی تھی"[۱]

شاہی خزانے اور ذاتی دولت

پبلک کے فائدے کے لئے جتنا روپیہ شاہی خزانے سے خرچ ہوتا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا، شاہان ایران کے یہاں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے خزانہ میں نقد روپیہ اور قیمتی اشیاء جمع کرتے[۲]، خسرو دوم نے ۶۰۷-۶۰۸ء میں طیسفون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کرور اسی لاکھ (۴۶۸۰۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا، یعنی تقریباً سینتیس کرور پچاس لاکھ فرانک طلائی (چار اوب اٹھ کرور روپئے) حکومت کے تیرھویں سال کے بعد اس کے خزانہ میں اسی کرور مثقال وزن کا سونا تھا[۳]، خسرو دوم کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ

۱۔ ایران بعہد ساسانیان ص۱۶۳ ۲۔ ایران بعہد ساسانیان ص۱۶۲ ۳۔ ایضاً ص۶۱۱

(یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا۔[1]

طبقاتی تفاوت

ایران کی قومی زندگی میں دولت وخوشحالی مخصوص افراد کے اندر محدود تھی، معدودے چند اشخاص نہایت دولت مند تھے باقی نہایت تنگدست اور پریشان حال، ایرانی تاریخ میں نوشیرواں کا زمانہ حسن انتظام اور عدل گستری کے لئے ضرب المثل ہے، "ایران بعہد ساسانیاں" کا مصنف اس عہد کے متعلق لکھتا ہے:۔

"خسرو (نوشیرواں) کی مالی اصلاحات میں بیشک رعایا کی نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا، عوام الناس اسی طرح جہالت و عسرت میں زندگی بسر کر رہے تھے جیسا کہ زمانہ سابق میں، بازنطینی فلسفی جو شہنشاہ کے یہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے، ایران سے جلد برداشتہ خاطر ہوگئے، یہ سچ ہے کہ وہ اتنے بلند نظر فلسفی نہ تھے کہ ایک غیر قوم کی عادات و رسوم کو غیر جانبداری کی نظر سے

---

[1] ایضاً صفحہ ۴۶۲ تاج جو سونے اور چاندی کا بنا ہوا، اور زمرد، یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا بادشاہ کے سر کے اوپر چھت کے ساتھ ایک سونے کی زنجیر کے ذریعہ سے لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی کہ جب تک تخت کے بالکل قریب آکر نہ دیکھا جائے نظر نہیں آتی تھی اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے، لیکن حقیقت میں اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اسکو نہیں اٹھا سکتا تھا، کیونکہ اس کا وزن ۹۱ ½ کیلو تھا (تقریباً ۲ ½ من ہوا) "ایران بعہد ساسانیاں" ص ۵۳۱

دیکھ سکتے اور جن باتوں کو وہ ایک فلسفی بادشاہ کی سلطنت میں دیکھنے کے خواہاں تھے وہ ان کو نظر نہ آئیں، اور چونکہ علم الاقوام کے مطالعہ کا انھیں ذوق نہ تھا اور ان کی ذہنیت ایسی نہ تھی جو اس علم کے جاننے والے کی ہوتی ہے لہذا ایرانیوں کی بعض رسموں شلاً نکاح محرمات کی رسم یا لاشوں کو زخموں پر کھلا چھوڑ دینے کی مذہبی رسم نے ان کو برہم کیا، لیکن محض یہ رسمیں نہیں جن کی وجہ سے ان کو ایران میں رہنا ناگوار ہوا بلکہ ذات پات کی تمیز اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ اور خستہ حال جس میں نچلے طبقہ کے لوگ زندگی بسر کر رہے تھے، یہ وہ چیزیں تھیں جنکو دیکھ کر وہ آزردہ خاطر ہوئے، "طاقتور لوگ کمزوروں کو دباتے تھے اور ان کے ساتھ بہت ظلم اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے"۔[1]

یہ حال صرف ایران ہی میں نہ تھا اسکی معاصر و حریف بازنطینی سلطنت میں بھی سخت قسم کا طبقاتی نظام اور امتیازی سلوک رائج تھا، رابرٹ برافالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے:۔

"یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اسکے چلانے والے اسکی حرکت اور ارتقاء کو روک دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں پاتے، اسی لئے رومی معاشرہ (اپنے انحطاط کے

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں بحوالہ اگاتھیاس ۳۰-۲۰

دور میں) سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا سوسائٹی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنا پیشہ بدل سکے، ہر لڑکے کے لئے ضروری تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے۔[1]

دونوں سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے، بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لئے مخصوص تھے جو جاہ و حشم رکھتے اور حکام میں ان کا رسوخ تھا۔

ایران کے کسان

نت نئے ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی، بہت سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی، ان ٹیکسوں سے بچنے اور اس حکومت کی فوجی خدمت کرنے سے نجات حاصل کرنے کے لئے جس سے ان کو دلی لگاؤ نہ تھا، انھوں نے عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لی تھی، نہ انکو اس مقصد سے کچھ دلچسپی تھی جس کے لئے بار بار جنگیں کی جاتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاری اور جرائم کی گرم بازاری ہوئی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنے کا مرض عام ہوگیا، "ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف ایران کے کاشتکار طبقہ کے متعلق جو ملک کی خوراک اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا لکھتا ہے:۔

"کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی وہ اپنی زمین کے ساتھ بندھے رہتے تھے اور ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی، مورخ امیان مارسلینوس لکھتا ہے کہ "ان بچارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے، گویا کہ ابدی غلامی اُن کی

---

[1] The Making of Humanity. P 160

تقدیر میں لکھی ہے اور کسی قسم کی تنخواہ یا اُجرت سے ان کی حوصلا افزائی
نہیں کی جاتی تھی[۱] ...... کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ
تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ۔[۲]

حکام کا رویہ

حکومت کے اہل کار و عہدہ دار عام رعایا اور ملک کے باشندوں کے ساتھ ایسی سخت گیری اور بیدردی کا برتاؤ کرتے کہ اہل ملک ان سے عاجز تھے ان حکام اور عہدہ داروں کو نہ عوام کی جان و مال کی پرواہ تھی، نہ ان کی عزت و آبرو کا پاس، لوگ شکایتیں کرتے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی، یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ اندھیر نگری ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں، بعض اوقات وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے۔

مصنوعی معاشرت اور پرعشرت زندگی

روم و ایران دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا، مصنوعی تہذیب اور ایک پُرفریب زندگی کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا جس میں وہ سر سے پاؤں تک غرق تھے، سلاطین روم اور شاہان ایران اور ان کے امراء دنیا و خواب غفلت میں پڑے تھے، لذت اندوزی کے سوا انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی، عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا، تکلفات زندگی، تعیشات اور سامان آرائش کی وہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا

۱؎ "ایران بعہد ساسانیان" ص ۴۲۲ ۲؎ ایضاً ص ۴۲۴

جاتا تھا، عقل حیران رہ جاتی ہے۔[1] پارسی مورخ شاہین مکاریوس کے بیان کے مطابق "کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں، پچاس ہزار اصیل گھوڑے اس قدر سامان تعیش، محلات نقد وجواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے اسکا محل اپنی شان وشکوہ اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا[2]، مکاریوس لکھتا ہو کہ "تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے ان شاہان ایران کی طرح داد عیش دی ہو جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام شہروں سے آتی تھیں جو شرق اوسط اور مشرق اقصیٰ کے درمیان واقع تھے[3]، اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو انھوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ان چھوڑے ہوئے سامانوں میں بیش قیمت جوڑے طلائی ظروف، سنگار کا سامان عطریات وغیرہ تھے" طبری کی روایت ہے کہ عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے جو سر بمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے، عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ اس میں کچھ کھانے کا سامان ہوگا کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن ہیں[4]۔ مورخین نے فرش بہار کی (جس پر بیٹھ کر امراء ایران موسم خزاں میں شراب پیتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"یہ ساٹھ گز مربع تھا، تقریباً ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا، اسکی زمین سونے کی تھی جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی، چمن

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ایران بعہد ساسانیان" کا باب نہم "آخرین شاہزار عہد" [2] تاریخ ایران (شاہین مکاریوس) طبع مصر ۱۸۹۸ء صفحہ ۹۵ [3] ایضاً ص ۲۹ [4] تاریخ طبری

تھے جن میں پھولدار اور پھل دار درخت قائم تھے ۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے کلیاں سونے چاندی کی ، اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے ، گرد ہیرے کی جدول تھی ، درمیان میں روشیں اور پتھر جن بنائی گئی تھیں اور یہ سب جواہرات کی تھیں ، موسم خزاں میں تاجداران آل ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے، اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا"[1]

رومی حکومت کے عہد میں شام اور اس کے مرکزی شہروں کا بھی یہی حال تھا، یہ دونوں حکومتیں عیش پسندی اور تمدن کی باریکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں ، شہنشاہان روم ان کے شامی رؤسا، وحکام نے کھل کر داد عیش دی ۔ ان کے عالی شان محل اور دیوان خانے اور ناؤ نوش کی مجلسیں عیش کے ساز وسامان اور دولت وزراعت کے اسباب سے لبریز تھیں تاریخ وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیش پسندی اور نفاست میں بہت آگے نکل چکے تھے ، حضرت حسان بن ثابت نے (جنھوں نے اسلام سے پہلے غسانی امراء شام کی مجلسوں میں شرکت کی تھی) جبلہ بن الایہم غسانی کی مجلس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :-

"میں نے دس باندیاں دیکھیں جن میں پانچ روم کی تھیں جو بربط پر گارہی تھیں اور پانچ وہ تھیں جو اہل حیرہ کے دھن میں گارہی تھیں جنھیں عرب سردار ایاس بن قبیصہ نے تحفۃً بھیجا تھا ، اس کے علاوہ

---

[1] تاریخ اسلام از مولوی عبدالحلیم شرر ج ۱ ، صہ ۳۵۲ ماخوذ از تاریخ طبری وغیرہ ۔

عرب کے علاوہ مکہ وغیرہ سے بھی گویّوں کی ٹولیاں جاتی تھیں، جبکہ جب شراب نوشی کے لئے بیٹھتا تو اس کے نیچے فرش پر قسم قسم کے پھول چمیلی، جوہی وغیرہ بچھا دیئے جاتے اور سونے چاندی کے ظروف میں مشک وعنبر لگائے جاتے، چاندی کی طشتریوں میں مشک خالص لایا جاتا اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی اور اس کے اور اس کے ہمنشینوں کے لئے گرمیوں کا لباس آتا جس کو وہ اپنے اوپر ڈال لیتا، جاڑوں میں سمور، قیمتی کھالیں اور دوسرے گرم لباس حاضر کئے جاتے۔[1]

والیان ریاست، شاہزادے، امراء، اونچے گھرانوں کے افراد نیز متوسط طبقہ کے لوگ بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے اور کھانے پینے، پوشاک اور طرز رہائش میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کی عادات و اطوار اختیار کرتے، معیار زندگی بہت ہی زیادہ بلند ہو گیا تھا، اور معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ بن گئی تھی، ایک ایک شخص اپنی ذات پر اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے پوری ایک بستی کی پرورش ہو سکے یا جو پورے ایک گاؤں یا آبادی کی پوشاک اور ستر پوشی کے مصارف کے لئے کافی ہو، ایسا کرنا ہر ایک ممتاز اور شریف آدمی کے لئے ناگزیر تھا کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سوسائٹی میں انگشت نمائی ہوتی اور وہ اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہوتا یہاں تک کہ یہ بھی زندگی کی ایک ضرورت اور سوسائٹی کا ایک قانون بن گیا جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی، شعبی کہتے ہیں کہ

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۰۰

اہل ایران اپنے سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ ان کی اس حیثیت کے مطابق ہوتی تھی جو انھیں اپنے قبیلہ میں حاصل تھی، چنانچہ جو اپنے قبیلہ میں شرافت و عزت کے لحاظ سے معیاری ہوتا تھا اسکی کلاہ ایک لاکھ کی قیمت کی ہوتی تھی، ہرمز کا شمار انھیں افراد میں تھا جن کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہذا اسکی کلاہ ایک لاکھ کی تھی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے[۱]۔ شرافت و وجاہت کا معیار یہ تھا کہ وہ ایران کے سات اونچے گھرانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہو، ازادیہ (زادویہ) شہر حیرہ کا کسریٰ کے عہد میں حاکم تھا وہ سیادت میں دوسرے نمبر کا سمجھا جاتا تھا اس لئے اسکی ٹوپی کی قیمت پچاس ہزار تھی،[۲] رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی اور اسکی قیمت ایک لاکھ تھی۔[۳]

لوگ اس انتہا پسندانہ معاشرت اور اسکے تباہ کن لوازم و ضروریات کے اس طرح عادی ہو گئے تھے اور یہ تمدن ان کے رگ و پئے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ یہ تکلفات ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے تھے اور ان سے علیحدہ ہونا انکے لئے ناممکن سا ہو گیا تھا، نازک سے نازک وقت میں اور مجبوری کی حالت میں بھی سادہ زندگی اور نیچی سطح پر اتر آنا ان کے لئے دشوار تھا

مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہ ایران یزدگرد جس بے سروسامانی اور پریشانی میں دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، مگر اس عجلت و

---

[۱] تاریخ طبری ج ۴ ص ۲ [۲] تاریخ طبری ص ۱۱ [۳] تاریخ طبری ص ۱۳۲

پریشانی میں بھی وہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا ہے اس سے اس ذہنیت اور معیار تمدن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ "ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف لکھتا ہے:

"یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار باز دار، اور بہت سے دوسرے لوگ لیتا گیا، اور یہ تعداد اسکے نزدیک ابھی کم تھی"[1]

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی بار مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا، پانی ایک موٹے سے پیالہ میں لایا گیا۔ اس نے کہا کہ چاہے میں پیاسا مر جاؤں مگر اس بھدے پیالہ میں پانی پینا میرے لئے ممکن نہیں، چنانچہ اسکے لئے تلاش کرکے، دوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس کو وہ پی سکا۔[2]

ان دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایرانیوں کی عادتیں کس قدر بگڑ گئی تھیں اور وہ مصنوعی زندگی اور تکلفات کے کس قدر عادی اور سادہ اور فطری زندگی سے کس درجہ دور ہو چکے تھے۔

حکومت کی دولت ستانی

اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں میں اس قدر اضافے ہو جائیں جو رعایا کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوں، نئے نئے قوانین بنائے جائیں، جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاریگروں اور اہل حرفہ سے زیادہ سے زیادہ مال گھسیٹا جاسکے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ آئے دن کے ان اضافوں اور بھاری بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی

---

[1] "ایران بعہد ساسانیان" ص ۵۸۱ [2] تاریخ طبری جلد ۴ ص ۱۶۱

مگر توڑ دی اور حکومت کے مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل ہو گئی۔ "ایران بعہد ساسانیان" کا مؤلف لکھتا ہے:۔

"باقاعدہ ٹیکسوں کے علاوہ رعایا سے نذر منے لینے کا بھی دستور تھا جس کو آئین کہتے تھے، اسی آئین کے مطابق عید نوروز اور جشن مہرگان کے موقعوں پر لوگوں سے جبرًا تحائف وصول کئے جاتے تھے، خزانہ شاہی کے ذرائع آمدنی میں سے ہمارا خیال ہے کہ سب سے اہم ذریعہ جاگیر ہائے خالصہ کی آمدنی اور وہ ذرائع تھے جو بادشاہ کے لئے حقوق خسروی کے طور پر مخصوص تھے، مثلاً فارنگیوں (علاقہ آرمینیہ) کی سونے کی کانوں کی ساری آمدنی بادشاہ کی ذاتی آمدنی تھی ہے"[1]

مورخ شام رومی حکومت کے طرز عمل اور اس کی مدوں اور آمدنیوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

"شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کا ٹیکس ادا کرے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور رأس المال کا ٹیکس داخل کرے فی کس ایک رقم مقرر تھی جس کا ادا کرنا لازمی تھا اس کے علاوہ رومی قوم کے کچھ دوسرے اہم ذرائع آمدنی تھے، مثلاً چنگی، کانیں، محاصل اس کے علاوہ جو قطعات گندم کی کاشت کے قابل ہوتے، اور چراگاہیں ٹھیکہ پر اٹھادی جاتیں ان ٹھیکہ داروں کو "عشارین"

---

[1] "ایران بعہد ساسانیان" صلـ ۱۶۱

بچتے تھے۔ یہ لوگ حکومت سے تحصیل وصول کے اختیارات خرید لیتے اور رعایا سے مطالبات وصول کرتے، ہر صوبہ میں ان ٹھیکہ داروں کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں، ہر کمپنی کے پاس کچھ منشی اور محصل ملازم تھے جو اپنے کو افسروں اور مالکوں کے انداز میں پیش کرتے اور جس قدر ان کو لینے کا حق تھا اس سے زیادہ وصول کرتے۔ وہ لوگوں کو فراغت و راحت کے وسائل سے محروم کرتے اور اکثر ان کو غلاموں کی طرح فروخت بھی کر دیتے۔[1]

رومیوں کے سیاسی طرز کا اور ان کی پالیسی کا کسی نے خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ:۔

"اچھا گلہ بان وہ ہے جو اپنی بھیڑوں کا اون کاٹ لیتا ہو نوچتا نہیں" واقعہ یہ ہے کہ دو صدیاں گزر گئیں اور شہنشاہان روم اپنی مملکت کے باشندوں کا اون کاٹتے رہے (نوچنے کی کوشش نہیں کی) وہ ان سے بہت بڑی دولت وصول کرتے رہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ بیرونی دشمن سے ان کی حفاظت کرتے رہے۔[2]

عوام کی خستہ حالی

روم و ایران دونو مملکتوں میں اہل ملک دو علحدہ طبقوں میں تقسیم ہوگئے تھے، ان دونوں طبقوں کے درمیان واضح اور بین فرق تھا، ایک طبقہ بادشاہوں، شاہزادوں، اہل دربار، ان کے خاندانی عزیزوں اور ان کے متعلقین و وابستگان اور جاگیرداروں اور دولتمندوں کا تھا،

---

[1] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۵ ص ۴۰ [2] ایضاً

یہ لوگ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے، ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دودھ اور گلاب میں نہاتے، یہ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے تھے۔

دوسرا طبقہ، کاشتکاروں، کاریگروں، اہل حرفہ اور چھوٹے تاجروں کا تھا جن کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی، یہ زندگی کے بوجھ ٹیکسوں اور زندگی کے بارے کچلے جا رہے تھے ان کا جوڑ جوڑ اور بند بند مطالبات کے اندر جکڑا ہوا تھا، وہ اس جال کو توڑنے کی جس قدر کوشش کرتے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے وہ جال اور کس جاتا اس گھٹن اور پرمصیبت زندگی پر دوسری مصیبت یہ تھی کہ وہ اونچے طبقہ کی بہت سی باتوں میں نقل اتارنے کی کوشش بھی کرتے جس سے اور زیادہ پریشان ہوتے، ضروریات زندگی کی فراہمی میں ان کو وہ وقت اور پریشانی لاحق نہ ہوتی جو اس نقالی اور اونچے طبقہ کی ریس کرنے میں اُن کو پیش آتی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی تلخ اور سراپا کوفت تھی، ان کا دماغ ہر وقت پریشان و پراگندہ رہتا اور ان کو حقیقی سکون اور اطمینان قلب کبھی میسر نہ آتا۔

سرکش دولتمند اور خود فراموش مفلس

سرمایہ داری کی سرکشی و خدا فراموشی اور افلاس کی بے بسی اور خود فراموشی کے دو انتہائی سروں کے درمیان انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اخلاق عالیہ اور زندگی کے بلند اصول پوری متمدن دنیا میں متروک و ناقابل عمل سمجھ لئے گئے تھے، دولتمندوں کو اپنے

تفریحی مشاغل اور تعیشات سے اسکی فرصت نہ تھی کہ وہ دین یا آخرت کے بارہ میں کچھ سوچیں، کاشتکاروں اور محنت کش طبقہ کو اسکے افکار و آلام اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مطالبات اسکی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ روز کی خوراک اور ضروریات کے علاوہ کسی اور طرف توجہ کرے، غرض یہ کہ زندگی اور زندگی کے مطالبات نے امیر و غریب سب کو الجھا دکھا تھا اور اسی میں ہر ایک سرگرداں تھا، زندگی کی چکی اپنی پوری قوت کے ساتھ گردش کر رہی تھی جس کی وجہ سے انھیں مطلق مہلت نہ تھی کہ وہ دین کی طرف توجہ کریں اور روح و قلب کے بارہ میں اور انسانیت کی بلند قدروں کے متعلق غور کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف (حجۃ اللہ البالغہ) میں ماقبل اسلام کی اس صورت حال کی پوری تصویر کھینچی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسائیوں اور سامان میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہل ہنر اور اہل کمال جمع ہو گئے تھے، جو اس سامان آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراش خراش

نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اسکی کوئی عزت نہ ہوتی، اسکی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو[1] یہ تمام تکلفات اُن کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اسکی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو انکی پوری شہری زندگی اور اُن کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا ہر شہری پر یہ پر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اسکے سر پر غم و فکر کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا، بات

---

[1] شاہانِ دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

پڑتی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھائے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں اگر وہ ان مطالبات سے گریز اور ان کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آبپاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لئے ان کو پالا جاتا ہے اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی، اس پر مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کبھی سر اٹھانے اور سعادت اخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی ہو۔[1]

عالم گیر تاریکی

خلاصہ یہ کہ اس ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جاسکے، اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو، اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو، اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا، جو

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب اقامۃ الارتفاقات، واصلاح الرسوم۔

انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو
تھا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی
کبھی کچھ روشنی نظر آجاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری
رات میں جگنو چمکتا ہے، صحیح علم اور صحیح عمل اتنا نایاب تھا اور خدا کا سیدھا راستہ
بتلانے والے اس قدر خال خال پائے جاتے تھے کہ ایران کے بلند ہمت اور بے چین
طبیعت نوجوان سلمان فارسی کو جو اپنے قومی و نسلی مذہب (مجوسیت) سے غیر مطمئن
و مایوس ہو چکا تھا اور حق و صداقت کا جویا تھا، ایران سے لے کر شام کے آخری حدود
تک اپنے طول و طویل سفر میں صرف چار آدمی ایسے مل سکے جن سے اس کی روح کو
سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوا اور جو پیغمبر کے بتلائے ہوئے راستہ پر قائم
تھے۔[1]

اس عالمگیر تاریکی اور فساد کا نقشہ قرآن مجید نے جس طرح کھینچا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	خرابی پھیل گئی ہے خشکی اور تری
بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ	میں لوگوں کے اعمال کے نتیجہ میں تاکہ
لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ	اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا
يَرْجِعُونَ۔ (الروم - ۴۱)	مزہ چکھائے اور وہ باز آجائیں۔

[1] حضرت سلمان فارسی کی سرگزشت (جو اپنی مسلسل سند اور راویوں کی ثقاہت و عدالت کی وجہ سے ایک مستند و بیش قیمت تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے) مسند امام احمد اور مستدرک حاکم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

بابِ دوم

بعثتِ محمدیؐ کے بعد

بعثتِ محمدیؐ

ایسے وقت میں کہ انسانیت پر نزع کا عالم طاری تھا اور دنیا اپنے تمام سازوسامان کے ساتھ ہلاکت کے مہیب و عمیق غار میں گرنے والی تھی عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وحی و رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس جاں لب انسانیت کو نئی زندگی بخشیں اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۔	الٓر ۔ یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری ہے تاکہ تم تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ اس خدا کے راستہ کی طرف
(ابراہیم ۔ ۱)	جو غالب اور ستودہ صفات ہے۔

آپ نے انسانیت کو صرف ایک بندگی کی دعوت دی اور دنیا کی ساری بندگیوں اور غلامیوں سے نجات دی، زندگی کی حقیقی نعمتیں (جن سے انسانوں نے اپنے کو محروم کر دیا تھا) دوبارہ ان کو عطا کیں اور وہ طوق وسلاسل اُن سے جُدا کئے جو انھوں نے بلاضرورت اپنے اوپر ڈال لئے تھے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف۔ ۱۵۷)	محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، پسندیدہ چیزیں حلال کرتے ہیں گندی چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں، اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں جس کے تلے وہ دبے ہوئے تھے اُن پھندوں سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔

آپ کی بعثت نے انسانیت کو نئی زندگی، نئی روشنی، نئی طاقت، نئی حرارت نیا ایمان، نیا یقین، نئی نسل، نیا تمدن، نیا معاشرہ عطا کیا، آپ کی آمد سے دنیا کی نئی تاریخ اور انسانیت کے کام کی عمر شروع ہوتی ہے کہ خود فراموشی وخودکشی میں جو زمانہ گزرا، وہ اعتبار کے قابل نہیں، اور بینا ونابینا اور زندہ ومردہ ایک پلڑے میں رکھے نہیں جاسکتے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ (الفاطر۔ ۱۹ تا ۲۲)	اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور تاریکی اور روشنی اور نہ چھاؤں اور دھوپ اور زندہ آدمی اور مردہ برابر نہیں ہوسکتے

جاہلیت واسلام کے درمیان جو فاصلہ تھا اس سے بڑا کوئی فاصلہ نہیں، لیکن یہ فاصلہ جس سرعت کے ساتھ طے ہوا دنیا میں اسکی بھی نظیر نہیں، دنیا نے آپ کی رہنمائی میں یہ طویل سفر کس طرح طے کیا؟ اور جاہلیت سے اسلام کی طرف کس طرح پہونچی؟ آئندہ صفحات اسی سوال کے جواب اور اسی اجمال کی تفصیل کے لئے ہیں۔

جاہلیت پر ایک اجمالی نگاہ

گزشتہ صفحات سے اندازہ ہوچکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی کیفیت بعینہ ایک ایسے مکان کی سی تھی جس کی بنیادیں ایک سخت زلزلے نے ہلا دی تھیں، اس کی ہر چیز بے محل اور بے قرینہ تھی، اس عمارت کا ساز و سامان زیر و زبر ہوگیا تھا جو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچ رہا تھا اسکی شکل بگڑ گئی تھی کہیں کی چیز کہیں پڑی تھی، کہیں سامان کا انبار لگ گیا تھا اور کہیں بالکل جھاڑو پھر گئی تھی، دیکھنے والے کو وہاں ایسا انسان نظر آتا تھا جس کی نظر میں اپنی ہستی خود حقیر تھی، وہ درخت، پتھر اور پانی کی پرستش کرنے لگا تھا بلکہ وہ ہر بے بس چیز کو معبود بنا چکا تھا وہ اتنا مسخ ہوچکا تھا کہ روزمرہ کی کھلی ہوئی حقیقتوں کے ادراک سے بھی قاصر تھا، اس کا فکری نظام مختل ہوچکا تھا اسکے احساسات غلط کام کر رہے تھے، اسکے لئے علم نظری بدیہی اور بدیہی نظری بن گیا تھا یقینی اور قطعی چیزوں میں اس کو شک ہونے لگا تھا اور مشکوک و مشتبہ چیزیں قطعیات و یقینیات بن گئی تھیں، اس کا ذوق فاسد ہوگیا تھا، بد ذائقہ چیزیں اسکو خوش ذائقہ اور خوش ذائقہ بد ذائقہ معلوم ہونے لگی تھیں، اس کا احساس باطل ہوچکا تھا، دوست اور خیر خواہ کے ساتھ اسکی دشمنی اور دشمن اور بدخواہ کے ساتھ اسکی دوستی تھی۔

معاشرے پر نظر ڈالیے تو دنیا ہی کا مرقع نظر آتا ہے، ہر چیز غلط شکل یا غلط جگہ پر نظر آئے گی، اس معاشرے میں بھیڑیے کو گلہ کی نگہبانی اور ظالم فریق کو فصل خصومات کا کام سپرد کر دیا گیا تھا، اس سوسائٹی میں مجرم خوش قسمت اور آسودہ تھے اور نیک سیرت زحمت و کلفت میں مبتلا تھے، اس معاشرے میں اخلاق کی پاکیزگی اور نیک چلنی سے بڑھ کر کوئی جرم اور حماقت، اور بد اخلاقی اور بد اطواری سے بڑھ کر کوئی ہنر اور قابلیت کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اس معاشرے کے عادات اور اطوار ہلاکت آفرین تھے جو دنیا کو ہلاکت کے غار میں ڈھکیل رہے تھے، شراب نوشی، بدمستی، بد اخلاقی، جنون، سود خواری لوٹ کھسوٹ، اور مال کی محبت بوالہوسی اور جوع البقر تک پہونچ گئی تھی، سنگدلی اور بے رحمی اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں اور لڑکے بچپن میں قتل کر دیئے جاتے تھے، بادشاہ اللہ کے مال کو ہاتھ کا میل اور اللہ کے بندوں کو خانہ زاد سمجھتے تھے، عالم و درویش خدا بن بیٹھے تھے لوگوں کا مال کھاتے اڑاتے اور خدا کے راستے سے خدا کے بندوں کو روکنے کے سوا ان کا کچھ مشغلہ نہ تھا۔

جو قابلیتیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئی تھیں وہ بڑی بیدردی سے ضائع کی جا رہی تھیں یا بے محل خرچ ہو رہی تھیں، نہ ان سے فائدہ اٹھایا گیا تھا اور نہ ان کو صحیح رُخ پر لگایا گیا تھا، شجاعت اور بہادری نے ظلم و زبردستی، فیاضی و دریا دلی نے اسراف اور فضول خرچی، خودداری اور غیرت نے جاہلی حمیت، ذہانت و ذکاوت نے دھوکہ بازی اور حیلہ سازی

کی شکل اختیار کرلی تھی، عقل کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ جرائم کے نئے نئے طریقے ایجاد کرے اور خواہشات کی تسکین کے لئے نئے نئے راستے پیدا کرے۔

افراد اور قیمتی انسانی ذخیرے مدّت سے ضائع ہو رہے تھے وہ ایک ایسا خام مال تھا جس کو کوئی تجربہ کار کاریگر نصیب نہیں ہوا تھا جو اس سے تمدن کا صحیح ڈھانچہ تیار کرتا، یہ لکڑی کے تختے تھے جو پڑے پڑے گل رہے تھے، کوئی ایسا نہ تھا جو ان کو جوڑ کر زندگی کا جہاز تیار کرلیتا۔

منظم قوموں کی جگہ بھیڑوں کے چند گلے نظر آتے تھے جن کا کوئی چرواہا نہ تھا، سیاست شتر بے مہار تھی، اور قوت ایک تلوار جو ایک بدمست کے ہاتھ پڑ گئی تھی، جس سے وہ خود اپنے کو اور دوسروں کو زخمی کر رہا تھا۔

جزئی اصلاح کی ناکامی

اس خراب اور ابتر زندگی کا ہر شعبہ مصلح کی پوری زندگی کا طالب تھا، فساد کا ہر گوشہ اس کا مستحق تھا کہ وہ اس کی ساری توجہات کا مرکز بن جائے اور اسکو ایک لمحہ کے لئے بھی فرصت نہ دے، اگر کوئی عام انسان ہوتا جو وحی و نبوّت کی ہدایت کے بجائے اپنی عقل یا خواہش سے کام کرتا تو اس زندگی کے ایک ہی حصّہ پر اپنی ساری کوششیں لگا دیتا اور پوری عمر کو سوسائٹی کے صرف ایک مرض کے ازالہ پر قربان کردیتا لیکن اس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے کہ انسان کی نفسیات کا معاملہ بہت پیچیدہ اور نازک ہے، اس میں بہت سے چور دروازے ہیں اور عجیب عجیب روزن ہیں، اسکی اصلی کمزوری اور مرکزی کمزوری کو پکڑ لینا آسان نہیں، جب انسان کا مزاج بگڑ جاتا ہے یا اس میں کجی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے صرف ایک

عیب کو دور کرنا اور ایک ہی کمزوری کے پیچھے پڑجانا کافی نہیں اور نہ کسی ایک ہی عادت کو سنوارنا سود مند ہے جب تک اس کا رخ شر سے پھیر کر خیر کی سمت، اور خرابی سے درستی کی جانب نہ کر دیا جائے اور زندگی میں بگاڑ کی جو جھاڑی اُگ آئی ہے اس کو نہ اکھاڑ پھینکا جائے اور اسکی زمین کو گھاس اور خودرو پودوں سے صاف نہ کر دیا جائے تاکہ نیکی اور خیر کی محبت اور اللہ عزوجل کے خوف کا پودا اس میں بٹھایا جاسکے۔

انسانی معاشرے کی ہر کمزوری اور ہر عیب پوری پوری زندگی کا مطالبہ کرتا ہے بعض اوقات پوری پوری جماعت کی زندگیاں اسکے مقابلہ میں مصروف کار ہو جاتی ہیں اور اصلاح نہیں ہوتی، اگر کسی ملک میں شراب کی لت پڑ گئی ہے اور زندگی کا فلسفہ ہی اس نے نا و نوش سمجھ لیا ہے تو اس سے منھ لگی شراب چھڑانی آسان نہیں ہے مے نوشی کس بات کا نتیجہ ہے؟ ایک ایسی ذہنیت اور مزاج کا جو مزہ کا عاشق ہے چاہے وہ لذت زہر ملی ہوئی ہو، بے خودی اور خود فراموشی کا طالب ہے چاہے ہزار گناہ سے خریدی جاسکتی ہو، اس افتاد طبیعت اور اس ذہن کو تقریر و تحریر، شراب کے طبی نقصانات کی تفصیل اور سخت سے سخت قوانین اور جرمانوں سے روکا نہیں جاسکتا، اسکو صرف عمیق نفسیاتی تبدیلی سے روکا جاسکتا ہے، اسکے سوا اگر کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا تو جرائم دوسرے رنگ میں ظاہر ہوں گے اور اپنے لئے دوسرے راستے پیدا کریں گے۔

پیغمبر اور سیاسی قائد کا فرق

عرب کے ملک میں کام کا بہت وسیع میدان تھا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی قومی رہنما یا

محب وطن قائد ہوتے اور آپ کا طریقہ سیاسی اور ملکی رہنماؤں جیسا ہوتا تو آپ کے سامنے بہتر صورت یہ تھی کہ آپ عرب کو ایک وطن قرار دے کر عربی قبائل کا ایک اتحاد قائم کرتے اور عرب کی مضبوط طاقتوں سے ایک پختہ اور جنگجو بلاک بنا لیتے اور ایک عربی ریاست یا جمہوریہ کی بنیاد رکھتے جس کے آپ نہایت آسانی کے ساتھ صدر ہو سکتے تھے، ایسی صورت میں ابوجہل عتبہ وغیرہ آپ کے ساتھ پورا اشتراک عمل کرتے اور آپ کو عرب کی قیادت سونپ دیتے کیونکہ ان کو آپ کی صداقت وامانت کا مشاہدہ تھا، انھوں نے آپ کو مکہ کے سب سے بڑے اختلافی مسئلہ میں حکم بنایا تھا، عتبہ نے قریش کا نمائندہ بن کر آپ کے سامنے عرب کی سرداری کی پیشکش کی تھی اور کہا تھا کہ اگر آپ قیادت چاہتے ہیں تو ہم کو ذرا اختلاف نہیں، آپ زندگی بھر ہمارے قائد رہیں گے، پھر اگر آپ کو یہ سیاسی مقام حاصل ہو جاتا تو آپ کے لئے ایرانی یا رومی سلطنت پر فوج کشی آسان تھی، آپ عرب کے شہسواروں کے ذریعہ ایران و روم کی سلطنت پر حملہ کر سکتے تھے اور عجمیوں کو مغلوب کر کے روم و فارس پر عرب کی فتح کا پھریرا اڑا سکتے تھے، یہ کتنا دلکش خواب تھا اور عربی جذبۂ نخوت کی اس میں کیسی تسکین تھی، اور اگر آپ ان دونوں شہنشاہیوں سے بیک وقت برسرپیکار ہونا سیاسی دانش کے منافی سمجھتے تو یمن و حبشہ پر حملہ کر کے ان کو اپنی نوزائیدہ حکومت میں ملحق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

خود عرب میں اتنے اجتماعی، معاشی مسائل موجود تھے جو اعلیٰ سیاسی بصیرت، قومی تنظیم، انتظامی قابلیت، اعلیٰ عزیمت کے برسوں سے منتظر تھے، ایک بلند پایہ قوی الارادہ رہنما عرب کی مقامی اصلاح و تنظیم کر کے اس کو دنیا کی بہت بڑی

طاقت، اور ایک باعظمت ملک بنا سکتا تھا۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ ایک بگاڑ کو تبدیل کرکے دوسرا بگاڑ اس کی جگہ پر لائیں، اور ایک ناانصافی کو مٹا کر دوسری ناانصافی پیدا کریں، ایک چیز کو ایک جگہ ناجائز قرار دیں اور دوسری جگہ اس کو جائز قرار دیں، ایک قوم کی خود غرضی کی مخالفت کریں اور دوسری قوم کی خود غرضی کی ہمت افزائی کریں، آپ ایک وطن پرست لیڈر، اور ایک سیاسی قائد بن کر نہیں آئے تھے کہ ایک قوم کو اجاڑ کر دوسری قوم آباد کرتے، دوسری قوم کے زر و جواہر سے اپنی قوم کا دامن بھر دیتے، اور لوگوں کو روم و فارس کی غلامی سے نکال کر آل عدنان اور اولاد قحطان کی غلامی میں داخل کرتے۔

آپ کا مقصد بعثت دنیا کو جنت کی بشارت اور عذاب آخرت کی وعید پہونچانا تھا، آپ داعی الی اللہ اور سراج منیر بن کر آئے تھے کہ ساری دنیا کو روشن کریں، آپ مبعوث فرمائے گئے تھے کہ دنیا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں، تمام لوگوں کو مادی زندگی کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہونچا دیں، مذاہب و ادیان کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے نجات دے کر اسلام کے انصاف سے متمتع ہونے کا موقع دیں، آپ کا کام نیکی کی ترغیب دینا، بدی سے منع کرنا، صاف و پاک چیزوں کو حلال، گندی و ناپاک چیزوں کو حرام قرار دینا اور ان بندشوں اور بیڑیوں کو توڑنا تھا جو انسانوں نے اپنی نادانی سے یا مذاہب اور حکومتوں نے اپنی زبردستی سے لوگوں کے پاؤں میں ڈال رکھی تھیں۔

اسی لئے آپ کے مخاطب صرف ایک قوم یا ایک ملک کے باشندے نہ تھے، آپ کا خطاب تمام انسانوں اور پورے انسانی ضمیر سے تھا، عرب قوم اپنی حد سے بڑھی ہوئی پسماندگی اور اخلاقی پستی کی وجہ سے ضرور اسکی مستحق تھی کہ آپ کی مہم وہیں سے شروع ہو اور کار نبوت کا افتتاح بھی اسی قوم میں ہو۔ ام القریٰ (مرکز عالم، مکہ) اور جزیرہ نمائے عرب اپنے جغرافیائی جائے وقوع، سیاسی آزادی کی وجہ سے آپ کی جد و جہد کے لئے بہتر مرکز تھے اور عربی قوم اپنی نفسیاتی خصوصیات اور اخلاقی امتیازات کی وجہ سے آپکے پیغام کی بہترین سفیر اور آپ کی دعوت کی موزوں ترین قاصد بن سکتی تھی۔

آپ ان مصلحین میں نہ تھے جو اپنی قوم یا اپنے زمانے کی چند اجتماعی کمزوریوں یا اخلاقی خرابیوں کے مٹانے کے درپے ہوتے ہیں اور وقتی طور پر ان عیوب کے ازالے میں کامیاب ہوتے ہیں یا اس دنیا سے ناکام سدھار جاتے ہیں۔[1]

---

[1] گاندھی جی نے اپنی سیاسی اور روحانی زندگی کی ابتداء سے دو زبردست اصولوں کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور ان دونوں پر اپنی وہ تمام طاقتیں، ذہنی و علمی صلاحیتیں اور وہ تمام وسائل صرف کر دیئے جو اس زمانے میں کم لوگوں کو حاصل ہوں گے، پہلا اصول عدم تشدد تھا جس کی طرف انھوں نے ایک مستقل مذہب اور فلسفہ کی حیثیت سے دعوت دی اور اسکے لئے اپنی زندگی وقف کر دی، مگر چونکہ یہ طریقہ نفسیاتی تبدیلی اور دین کی بنیادی دعوت کے طریقے سے جدا تھا اس لئے ان کی دعوت نے وہ گہری تبدیلی اور تاثر پیدا نہیں کیا جو انبیاء اپنی قوموں میں پیدا کر چکے ہیں، انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ہندوستان کا وہ ہولناک فرقہ وارانہ فساد دیکھا جس میں انکے اصول عدم تشدد کو بُری طرح پامال کیا گیا اور بربریت و تشدد کا بدترین (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

انسانیت کی صحیح گرہ کشائی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے دعوت و اصلاح کا کام اس کے صحیح راستہ سے شروع کیا، آپ نے طبیعت انسانی کے قفل میں ٹھیک چابی لگائی، یہ وہ قفل تھا جس کے کھولنے میں اپنے وقت کے تمام مصلحین ناکام رہے تھے، آپ نے لوگوں کو سب سے پہلے اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور معبودان باطل کے انکار کی تلقین فرمائی اور طاغوت (خدا کے سوا ہر ہستی جس کی عبادت و اطاعت مطلق کی جائے) کی نافرمانی کی ہدایت فرمائی لوگوں میں کھڑے ہو کر آپ نے با آواز بلند فرمایا! "یا ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا" لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں کامیاب ہوگے۔

جاہلیت اسلام کے مقابلہ پر

جاہلی معاشرے نے اس دعوت اور اس کے مقاصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس میں اسکو کچھ پیچیدگی محسوس نہیں ہوئی جیسے ہی آپ کی آواز سننے والوں کے کان آشنا ہوئے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ دعوت ایسا تیر ہے جو جاہلیت کے نشانہ پر بیٹھ جائے گا اور جگر کے پار ہو جائے گا خطرہ کے اس احساس سے جاہلیت کے کڑھائی میں ابال

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) منظاہرہ ہوا، یہ وہ قعات گاندھی جی کے لئے سخت دل شکن اور سوہانِ روح بنے، بالآخر ان کو خود تشدد کا شکار ہونا پڑا جس کے خلاف ساری عمر انھوں نے تلقین کی تھی۔ دوسرا اصول چھوت چھات کا ترک تھا، اس مہم میں بھی کوئی خاص کامیابی نہ ہوسکی، یہ حقائق اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ انبیاء کرام کا طریقہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے اور وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔

پیدا ہوا، جاہلیت کے سوکا جاہلیت کے آخری معرکہ کے لئے میدان میں کیل کانٹے سے لیس ہوکر اُتر آئے۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ ۔	اور ان کے ذمہ دار لوگ نکل پڑے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یہ تو یقیناً کوئی سوچی سمجھی چیز معلوم ہوتی ہے۔

اس زندگی کے ہر رکن نے صاف محسوس کیا کہ جاہلی تہذیب کی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظام زندگی خطرے میں ہے، اس موقع پر سختی و ایذا ظلم و زیادتی کے وہ لرزہ خیز واقعات پیش آئے جو تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں، یہ اس بات کی علامت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت پر زد لگانے کے لئے بالکل صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور آپ کا تیر نشانہ پر صحیح بیٹھا آپنے جاہلیت کی شہ رگ پر وار کیا جس سے جاہلیت تلملا اٹھی اور سارا عرب جو جاہلیت کا شاید سب سے بڑا قلعہ تھا لڑنے کے لئے آگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح جمے رہے مخالفت کے طوفان اٹھے، فتنہ کی آندھیاں آئیں اور نکل گئیں، مگر آپنے اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کی، آپنے اپنے چچا سے صاف کہہ دیا (میرے چچا اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے پر چاند بھی رکھ دیا جائے تو بھی میں اس کام کو چھوڑ نہیں سکتا، یہاں تک کہ یا اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب کرے یا میں کام آجاؤں[1])

آپ مکہ میں تیرہ سال تک مقیم رہے، مسلسل توحید، رسالت، آخرت پر

---

[1] البدایة والنہایة ج ۳ ص ۴۳

یقین کی دعوت پوری صراحت کے ساتھ دیتے رہے آپ نے اس کیلئے ذرا بھی
ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی، نہ وقت کی مصلحت
کے لئے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک گوارا کی، اسی دعوت کو ہر مرض کی دوا،
اور ہر بند قفل کی کنجی سمجھا اور ایک لمحہ کیلئے بھی آپ کو اسکے بارہ میں ادنیٰ تذبذب بھی نہیں ہوا۔

اوّلین مسلمان

قریش نے اس دعوت کے مقابلہ میں گھٹنے ٹیک دیئے اور جاہلیت
کے جھنڈے کے نیچے آپ کے مقابلہ پر آ گئے اور انھوں نے تمام ملک
میں آپ کے خلاف آگ لگا دی اور اسلام کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، اب
آپ پر ایمان لانا اسی شیر دل مرد کا کام تھا جو موت سے نہ ڈرتا ہو، جو اپنے عقیدہ
اور یقین کے لئے آگ میں کودنے اور انگاروں پر لوٹنے کیلئے تیار ہو جو دُنیا
کی تمام ترغیبات سے منہ موڑ چکا ہو اور ساری دنیا سے رشتہ توڑ چکا ہو، قریش کے
چند جوان مرد آگے بڑھے، یہ عجلت کا فیصلہ اور نوجوانی کا اقدام نہ تھا، وہ سمجھتے تھے
کہ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں، اور زندگی کے دروازے اپنے
لئے بند کر رہے ہیں، کوئی دنیاوی ترغیب یا لالچ اسکی محرک نہ تھی کہ اس فیصلے
صرف خطرات کا دروازہ کھلتا تھا اور ہر طرح کے دنیاوی فوائد اور راحت کے
دروازے بند ہوتے تھے، یہاں صرف یقین کی ایک طاقت تھی اور آخرت کی
لالچ تھی، انھوں نے ایمان کی طرف بلانے والوں کو پکارتے سُن پایا تھا کہ اپنے
پروردگار پر ایمان لے آؤ، یہ پکار سنتے ہی زمین ان پر تنگ ہو گئی، طبیعتیں بھینچ
گئیں، راتوں کی نیند اُڑ گئی، نرم بستر کانٹوں کی طرح چبھنے لگے، انھوں نے دیکھا
اللہ و رسول پر ایمان لانا اور اپنے یقین کا ساتھ دینا ان کے لئے ضروری ہو گیا ہے

وہ دل و دماغ کے فیصلہ اور اپنے یقین کی مخالفت کر کے خوش نہیں رہ سکتے تھے حقیقت ان پر ظاہر ہو چکی تھی وہ اس حقیقت کو ٹال نہیں سکتے تھے، حیوانی زندگی سے ان کا دل اُچاٹ ہو گیا تھا، وہ اسکو اس میں دوبارہ پھنسا نہیں سکتے تھے، ایک کانٹا تھا جو ان کے دل میں چبھ رہا تھا وہ اس کانٹے کو پال نہیں سکتے تھے، آخر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنے اور اسلام لانے کا فیصلہ کر لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے شہر سے چند گز کا فاصلہ! مگر قریش نے آپ کو اتنا دور کر دیا تھا اور راستہ اتنا پُر خطر بنا دیا تھا کہ آپ تک پہونچنا ایک دور دراز اور نہایت خطرناک سفر تھا، شام و یمن کو تجارتی قافلے لے جانا اور ڈاکوؤں کے رہزنوں سے بچ کر نکل جانا اتنا مشکل نہ تھا جتنا مکہ کے اندر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنا اور آپکے ہاں مشکل تھا، لیکن وہ آپ تک پہونچے، آپکے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور اپنی زندگی آپکے حوالے کر دی ان کو زندگی کا خطرہ تھا اور آزمائشوں و مشکلات کا یقین تھا مگر انھوں نے قرآن کی یہ آیت سُنی تھی۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا	کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہو کہ وہ
أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ	یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم
لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا	ایمان لائے اور ان کی آزمائش
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ	نہ ہوگی ہم نے تو ان سے پہلے لوگوں
اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ	کو خوب آزمایا ہے، اللہ تعالیٰ ان
الْكَاذِبِينَ ۝	لوگوں کو ضرور جان لے گا جو سچے
(العنکبوت ع ۱)	ہیں اور وہ جھوٹوں کو ضرور معلوم کریگا۔

اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی سنا تھا کہ:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ۔ (البقرہ ع ۲۶)	کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں یوں ہی داخل ہو جاؤ گے، اور تم پر وہ حالات نہیں گزریں گے جو پہلے گزر چکے ان کو مصیبت اور نقصانات سے سابقہ پڑا اور وہ ہلا کر رکھ دیے گئے حتیٰ کہ رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان لانے والے کہنے لگے کب مدد آئے گی، معلوم ہو کہ مدد بس قریب ہی ہے۔

آخر وہی میں آیا جس کی قریش سے توقع تھی، قریش نے اپنا ترکش ان بے بسوں پر خالی کر دیا اور سب تیر آزمائے مگر ان کی پختگی اور یقین بڑھتا ہی گیا (اور کہنے لگے اسی کا تو ہم سے اللہ اور اسکے رسول نے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس نے انکے ایمان اور سپردگی میں اضافہ ہی کیا) ان آزمائشوں اور ابتلاؤں سے ان کے عقیدہ میں مزید پختگی، ان کے یقین میں استحکام، ان کے دینی احساس میں ترقی اور ان کے ایمان میں لذت و حلاوت پیدا ہوئی، ان کی طبیعتوں میں نکھار پیدا ہوا اور وہ اس بھٹی سے کھرا سونا بن کر نکلے۔

صحابۂ کرام کی ایمانی تربیت

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن کی روحانی غذا پہونچا رہے تھے، اور

ایمان کے ذریعہ اُن کی تربیت فرما رہے تھے اور آپ ان کو طہارت بدنی و خشوع قلبی خضوع جسمانی اور حاضر دماغی کے ساتھ دن میں پانچ بار رب العالمین کے حضور میں جھکاتے اُن میں روز بروز روحانیت کی بلندی، قلب کی صفائی، اخلاقی ستھراپن، مادی گرفت سے آزادی اور خواہشات کی اتباع سے چھٹکارا حاصل ہو رہا تھا اور مالک ارض و سما کا عشق اور شوق بڑھ رہا تھا، آپ ان کو تکلیف میں صبر اور درگذر اور ضبط نفس کی تلقین فرماتے تھے، لڑائی ان کے خمیر میں داخل تھی تلوار سے ان کا ازلی رشتہ تھا، وہ لوگ اس قوم سے تھے جس کی تاریخ بسوس و داحس وغیرہ کی خونیں داستانوں سے پُر ہے، یوم الفجار کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جنگی سرشت انسانوں کو تھامے ہوئے تھے اور ان کی عربی نخوت کو ایمان کی طاقت سے دبائے ہوئے تھے، آپ ان سے کہتے (اپنے ہاتھوں کو روکے رہو اور نماز قائم کرو) وہ آپ کے حکم سے موم ہو گئے تھے، بغیر ادنی بزدلی کے انھوں نے اپنے ہاتھوں کو روک لیا وہ سب برداشت کر رہے تھے جو دنیا کی کسی قوم نے برداشت نہیں کیا، تاریخ نے ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جس میں کسی مسلمان نے، اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کی ہو اور جوابی یا انتقامی کارروائی کی ہو، ضبط و تحمل کی یہ انتہائی مثال ہے جو ہمیں کسی جماعت کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

مدینۃ الرسول میں

قریش جب حد سے بڑھ گئے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا، تو اللہ نے اپنے رسول کو اور آپ کے اصحاب کو ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی، یہ لوگ یثرب کو ہجرت کر گئے، اسلام ان سے بھی پہلے یثرب پہونچ چکا تھا۔

اہلِ مکہ یثرب والوں سے خوب گھل مل گئے حالاں کہ ان کے درمیان کی کڑی صرف یہ نیا مذہب تھا، تاریخ نے دین کی طاقت و اثر کا یہ انوکھا منظر پیش کیا، اوس و خزرج نے جنگ بعاث سے ابھی دامن بھی نہ جھاڑا تھا اور اُن کی خون آشام تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا، ایسے حالات میں اسلام نے دلوں میں الفت و محبت پیدا کی۔ اس مصالحت کے لئے اگر کوئی شخص پوری دُنیا کا خزانہ خرچ کر دیتا تو بھی اسکی طاقت سے باہر تھی، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا، ایسا بھائی چارہ جس کے سامنے سگے بھائیوں کی محبت گرد اور دنیا کی ساری دوستیاں بے حقیقت تھیں، تاریخ میں ایسی محبت و خلوص کی مثال نہیں ملتی۔

یہ نوزائیدہ جماعت جو مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ پر مشتمل تھی ایک عظیم الشان اسلامی امت کی اساس اور اسلام کا سرمایہ تھی، اس جماعت کا ظہور ایسی کٹھن گھڑی میں ہوا جب کہ دُنیا موت و زندگی کی کش مکش میں مبتلا تھی۔ اس جماعت نے آکر اسکی زندگی کا پلڑا جھکا دیا اور ان تمام خطرات کو دور کر دیا جو اس کو درپیش تھے، اس جماعت کا ظہور پھر اس کا استحکام انسانیت کی بقا کے لئے ضروری تھا اسی لئے جب اللہ تعالےٰ نے انصار و مہاجرین کی اخوت و محبت پر زور دیا تو فرمایا (اگر ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد برپا ہوگا۔)

صحابۂ کرام کی ایمانی تکمیل

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں صحابۂ کرام کی ایمانی تربیت و تکمیل کا سلسلہ جاری رہا، قرآن برابر ان کے قلوب کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی مجالس سے ان کو استحکام، خواہشات نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اسکی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتساب نفس کی دولت حاصل ہوئی، وہ لوگ سستی و سختی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے، جس حال میں ہوتے خدا کی راہ میں اٹھ کھڑے ہوتے، یہ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معیت میں دس سال کے اندر ستائیس بار جہاد کے لئے نکلے اور آپ کے حکم سے سو مرتبہ سے زائد کمر بستہ ہو کر میدان جنگ کی طرف گئے، ان کے لئے دنیا سے بے تعلقی آسان بن گئی تھی۔ اہل و عیال کے مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے قرآن کی آیات وہ بے شمار احکام لائیں جو ان کے لئے پہلے سے مانوس نہ تھے، نفس و مال، اولاد و خاندان کے بارے میں احکام نازل ہوئے جن کی تعمیل کچھ ایسی کھیل نہ تھی، لیکن خدا اور رسول کی ہر بات ماننے کی عادت پڑ گئی تھی، شرک و کفر کی گتھی جب سلجھ گئی تو ساری گتھیاں ہاتھ لگاتے ہی سلجھ گئیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک بار ان کے ایمان کے لئے کوشش فرمائی، پھر ہر امر و نہی اور ہر نئے حکم کے لئے مستقل کوشش اور جد و جہد کی ضرورت نہ رہی، اسلام و جاہلیت کے پہلے معرکہ میں اسلام نے جاہلیت پر فتح حاصل کر لی۔ پھر تو ہر موقع کے لئے ہر مرتبہ نئے معرکہ کی ضرورت باقی نہ رہی، وہ لوگ مع اپنے قلوب کے، مع اپنے ہاتھ پاؤں کے، مع اپنی روحوں کے اسلام کے دامن میں آ گئے، ان پر جب حق واضح ہو گیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کوئی کشاکش باقی نہ رہی۔ آپ کے فیصلہ پر ان کو کبھی ذہنی یا قلبی کش مکش پیش نہ آتی، جس بات کا آپ

فیصلہ فرما دیتے ذرا اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے روبرو اپنے چھپے قصوروں کا اقرار کیا اور اگر کسی گناہ میں مبتلا ہو گئے تو اپنے جسموں کو حدود اور سزاؤں کے لئے پیش کر دیا۔ شراب کی حرمت کا نزول ہوا ہے تو چھلکتے ہوئے جام ہتھیلیوں پر تھے، اللہ کا حکم ان کے بھڑکتے ہوئے جگر، آلودہ لبوں اور شراب کے پیالوں کے درمیان حائل ہو گیا، پھر کیا تھا ہاتھ کو ہمت نہ تھی کہ اوپر کو اٹھ سکے، لبوں کی تمنائیں وہیں خشک ہو گئیں، شراب کے برتن توڑ دیئے گئے اور شراب مدینہ کی گلیوں اور نالیوں میں بہہ رہی تھی۔

جب شیطان کے اثرات ان کے نفوس سے ڈھل گئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب ان کے نفوس کے اثرات ان کے نفوس سے زائل ہو گئے، نفسانیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ لوگ اپنے نفسوں سے ویسا ہی برتاؤ کرنے لگے جیسا کہ وہ دوسروں سے کرتے تھے، دنیا میں رہتے ہوئے مردان آخرت، اور نقد سودے کے بازار میں آخرت کے قرض کو دنیا کے نقد پر ترجیح دینے والے بن گئے، نہ کسی مصیبت سے گھبراتے نہ کسی نعمت پر اتراتے، فقر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکتا، دولت سرکشی پیدا نہ کر سکتی، تجارت غافل نہ کرتی، کسی طاقت سے نہ دبتے، اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا، بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ ہو سکتا۔ لوگوں کے لئے وہ میزان عدل تھے، وہ انصاف کے علمبردار تھے، اللہ تعالیٰ کے گواہ تھے، خواہ ان کو اپنے نفس کے خلاف گواہی دینی پڑے خواہ والدین اور عزیزوں کے مخالف جانا پڑے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین کو ان کے قدموں

میں ڈال دیا اور دنیا کو ان کے لئے مسخر کر دیا، وہ اس وقت عالم کے محافظ اور اللہ کے دین کے داعی بن گئے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اپنا جانشین بنایا، اور آپ خود ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ رسالت اور امت کی طرف سے اطمینان لے کر رفیق اعلیٰ کی طرف سفر کر گئے۔

تاریخ کا عظیم ترین انقلاب اور اسکے اسباب

مسلمانوں کی طبیعتوں کا زبردست انقلاب جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دست مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعہ سے انسانی معاشرہ میں پیش آیا، انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا، اس انقلاب کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی۔ اس کی سرعت، اس کا عمق، اسکی وسعت وہمہ گیری، اسکی وضاحت اور فہم انسانی سے قرب، یہ سب اس محیر العقول واقعہ کے نرالے پہلو تھے، یہ انقلاب دوسرے خارق عادات واقعات کی طرح کوئی پیچیدہ مسئلہ یا ناقابل فہم معمہ نہ تھا، علمی طریقے سے اس انقلاب کی تحقیقات کیجئے تاریخ انسانی اور معاشرہ انسانی میں اُسکے اثرات کا مطالعہ کیجئے۔

ایمان اور اسکے اثرات

تمام لوگ خواہ عرب ہوں یا عجمی نہایت مسخ شدہ زندگی گذار رہے تھے، ہر وہ ہستی جو ان کے لئے وجود میں لائی گئی تھی، اور جو اُن کے تصرفات کے تابع تھی، امر ونہی، سزا و جزا کی طاقت سے محروم تھی، اسکی وہ پرستش کرنے لگے تھے وہ بالکل ایک سطحی اور دُھلی مذہبیت رکھتے تھے جس کا زندگی میں کوئی اثر اور ان کے طبائع اور ارواح اور قلوب پر کوئی اقتدار نہ تھا۔

اخلاق و معاشرت اس مذہبیت سے ذرا متاثر نہ تھے، اللہ تعالیٰ کی
ہستی ان کی نگاہوں میں ایسی تھی جیسا کہ ایک کاریگر اپنا کام پورا کرکے کنارہ کش
اور گوشہ نشین ہو گیا ہو، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مملکت ان لوگوں
کے حوالے کر دی تھی جن کو اس نے خلعت ربوبیت سے سرفراز کیا تھا اب وہ
حکومت پر قابض اور سیاہ و سفید کے مالک تھے، لہٰذا کائنات کی تقسیم، ملک کا نظم و نسق
انہی کے اختیار میں تھا، غرض ایک منظم حکومت کے جتنے شعبے اور محکمے ہوتے ہیں وہ
سب اُن کے انتظام میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر اُن کا ایمان ایک تاریخی واقفیت سے زیادہ نہ تھا، اللہ کو
پروردگار سمجھنا اس کو زمین و آسمان کا خالق ماننا ایسا ہی تھا جیسے تاریخ کے کسی
طالب علم سے پوچھا جائے کہ یہ قدیم عمارت کس کی تعمیر کردہ ہے؟ وہ جواب دے کہ
فلاں بادشاہ کی! اس بادشاہ کے نام سے اسکے قلب پر خوف و ہراس کی کوئی
لہر نہ دوڑے نہ اسکے دماغ پر کوئی اثر پڑے، ان لوگوں کا دل اللہ تعالیٰ کے
خوف اور تضرع و دعا سے خالی تھا، اللہ کی صفات سے وہ بالکل بے خبر تھے
اس لئے ان کے دل میں اسکی محبت کا کوئی جذبہ اور اسکی عظمت و کبریائی کا کوئی
نقش نہ تھا، اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کو بہت مبہم، مجمل اور عامیانہ ... سا علم تھا
جس میں کوئی گہرائی اور قوت نہ تھی۔

یونانی فلسفہ نے خدائے تعالیٰ کی ذات کے تعارف کے سلسلہ میں زیادہ تر
نفی سے کام لیا، اس نے صفات کی نفی کی اور نفی کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا،
جس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مثبت تعریف اور کوئی ایجابی صفت نہیں ہے، نہ اس

کی قدرت کا ذکر آتا ہے نہ اسکی ربوبیت، اسکی بے پایاں بخشش، اسکی محبت و رحمت کا تذکرہ ہے، اس فلسفہ نے خلق اوّل کو تو ثابت کیا تھا لیکن علم و اختیار و ارادہ اور صفات کی نفی کی اور اپنی طرف سے ایسے کلیات و اصول وضع کئے جو اس ذات عالی کی تنقیص اور مخلوقات پر قیاس تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر سیکڑوں سلب نفی ہو جائیں تو ایک ایجاب کا بھی فائدہ نہیں دے سکتے۔

ہمارے علم میں آج تک ایسا کوئی نظام، ایسا کوئی تمدن اور ایسی کوئی سوسائٹی بھی وجود میں نہیں آئی جو محض نفی پر قائم ہو، یونانی فلسفہ کے حلقۂ اثر میں دین و مذہب، خشوع و تضرع، حوادث میں رب العالمین کی طرف توجہ قلبی، محبت والفت کی روح سے یکسر خالی تھا، اسی طرح اس دور کی مذہبیت روح کھو بیٹھی اور صرف چند بے روح رسمیں اور ایمان کی بے جان نقلیں دنیا میں رہ گئیں۔

مسلمان امت اور عرب قوم اس بیمار، غیر واضح اور بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدہ تک پہونچ گئی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھا معاشرہ کو متاثر کرنے والا زندگی اور متعلقات زندگی پر حاوی تھا، وہ لوگ اس خدائے قدوس پر ایمان لائے جس کے بہترین نام ہیں جس کی شان سب سے اونچی ہے وہ لوگ ایسے رب العالمین پر ایمان لائے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ قیامت کے دن کا تنہا مالک و مختار، شہنشاہ پاک ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	وہ ایسا معبود ہے کہ اسکے سوا کوئی
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ	اور معبود نہیں، وہ جاننے والا ہے

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(الحشر ع ۳ پ ۲۸)

پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا وہی بڑا مہربان رحم والا ہے وہ ایسا معبود ہے کہ اسکے سوا کوئی اور معبود نہیں وہ بادشاہ ہے پاک ہے سالم ہے امن دینے والا ہے، نگہبانی کرنے والا ہے، زبردست ہے، خرابی کا درست کر دینے والا ہے، بڑی عظمت والا ہے، اللہ تعالیٰ لوگوں کے شرک سے پاک ہے، وہ معبود ہے پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے، صورت بنانے والا ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں، سب چیزیں اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

جو اس کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی، جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے جو پناہ دیتا ہے اور اسکے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، جنت اس کا انعام ہے اور دوزخ اسکی سزا، جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں کشائش کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے

تنگ کر دیتا ہے، آسمان و زمین کی تمام پوشیدہ اشیاء سے واقف ہے، آنکھوں کی چوریوں اور دلوں کے اسرار خوب جانتا ہے جو سراپا جمال، سراپا جلال، سراپا کمال اور محبت و رحمت ہے۔

اس گہرے وسیع اور واضح ایمان سے ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح تبدیل ہوگئیں۔ جب بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی گواہی دیتا اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہوتا، ایمان اس میں پیوست ہو جاتا یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا اور اس کے جسم میں خون و روح کی طرح دوڑ جاتا، جاہلیت کے جراثیم کو ختم کر دیتا اور اس کی جڑوں کو اکھاڑ کے پھینک دیتا، دل و دماغ اس کے فیضان سے معمور ہو جاتے اور وہ شخص پہلا آدمی باقی نہ رہتا، اس شخص سے صبر و شجاعت ایمان و یقین کے ایسے حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فلسفہ و تاریخ اخلاق انگشت بدنداں ہیں، قوتِ ایمان کے سوا کسی اور چیز سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

احتساب نفس اور ملامت ضمیر

یہ ایمان ایک کامیاب، اخلاقی مدرسہ اور نفسیاتی تربیت تھی جو طالب علم کو اعلیٰ درجہ کی قوت ارادی محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی، تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سراغ نہیں ملتا جو نفس کے ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتی۔

اگر کسی وقت صفت بہیمی زور کرتی اور انسان سے غلطی سرزد ہو جاتی، اور یہ ایسا موقع ہوتا جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور وہ شخص قانون کی دسترس

سے باہر ہوتا تو یہی ایمان نفس لوامہ بن جاتا، دل کی پھانس چین نہ لینے دیتی پریشان کن خیالات کا سیلاب امنڈنے لگتا، اس گناہ کی یاد میں چین حرام ہوجاتا حتیٰ کہ وہ شخص خود قانون کے سامنے اقرار جرم کرتا اور سخت سے سخت سزا کے لئے اپنے کو پیش کردیتا اور پھر اس سزا کو برضا و رغبت جھیلتا تاکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ سکے اور آخرت کی سزا کی جگہ دنیا کی سزا لے لے۔

ہمارے سامنے معتبر مورخین نے اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ کے ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کئے ہیں جن کی نظیر اسلام کی دینی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی، ان ہی واقعات میں سے ماعز بن مالک اسلمی کا واقعہ بھی ہے جس کو امام مسلم نے اپنی جامع صحیح میں نقل کیا ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس وہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے یارسول اللہ مجھ سے خطا ہوئی ہے۔ میں زنا کا مرتکب ہوگیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو پاک کروادیں آپنے ان کو واپس کردیا، دوسرے دن وہ پھر آئے اور کہنے لگے یارسول اللہ میں زنا کا مجرم ہوں، آپنے دوبارہ پھر واپس کردیا اور انکے گھر والوں سے دریافت کرایا کہ انکی سمجھ میں کسی قسم کی کوئی خرابی تو نہیں یا کوئی عادت کے خلاف بات تو نہیں پائی جاتی انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ سمجھ دار اور اچھے خاصے آدمی ہیں، پھر تیسری بار ماعز بن مالک آئے، آپنے دوبارہ دریافت کرایا جواب یکساں ملا۔ جو تھی بار جب وہ آئے تو آپنے نصف دفن کرواکر سنگسار کردینے کا حکم دیا۔

اسکے بعد غامدیہؓ آئیں کہنے لگیں یارسول اللہ مجھ سے زنا کی غلطی سرزد ہوگئی ہے

ظاہر کروا دیجئے، آپ نے ان کو واپس کروا دیا، دوسرے روز پھر آئیں اور کہنے لگیں "آپ ہمیں کیوں واپس کرتے ہیں شاید اسی طرح جس طرح کہ ماعز کو واپس کرتے تھے، واللہ میں حاملہ بھی ہوں، آپ نے فرمایا تو پھر جاؤ جب ولادت ہو جائے تو آنا، ولادت سے جب فارغ ہوئیں تو پھر آئیں، لڑکا کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، کہنے لگیں، یہ میرا بچہ ہے، آپ نے فرمایا جاؤ دودھ پلاؤ جب کچھ کھانے لگے تو لانا، جب دودھ چھڑایا تو پھر آئیں، لڑکے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، کہنے لگیں، اے اللہ کے نبی یہ ہے، میں دودھ پلانے سے بھی فارغ ہو گئی اور یہ کھانا بھی کھانے لگا، آپ نے لڑکا ایک مسلمان کے سپرد کیا، حد قائم کرنے کا حکم فرمایا، ان کے سینہ تک گڑھا کھودا گیا اور آپ نے حکم فرمایا، لوگوں نے سنگسار کر دیا، خالد بن ولید نے ایک پتھر مارا تو خون کی چھینٹیں ان پر آکے پڑیں تو انھوں نے مذمت کے لفظ کہے، آپ نے یہ الفاظ سن لئے اور فرمایا " ہائیں خالد، اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ایسی توبہ چنگی والا کرتا تو بخش دیا جاتا پھر آپ نے حکم دیا نماز پڑھی گئی اور ان کو دفن کر دیا گیا۔[1]

امانت و دیانت

یہ ایمان انسان کی امانت، اسکی پاکیزگی اور شرافت کا محافظ تھا، خلوت و جلوت میں جہاں کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور ایسی جگہ جہاں آدمی کا پورا اقتدار اور اختیار ہوتا اور کسی سے خوف کھانے کی ضرورت نہ تھی، یہ ایمان نفس کی ترغیبات اور خواہشات پر پورا قابو رکھتا، اسلامی فتوحات کی تاریخ میں دیانت و امانت و اخلاص کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ انسانی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتیں، یہ صرف ایمان راسخ اور اللہ کے دھیان

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحدود۔

اور ہر موقع و محل پر اسکے علم کے استحضار کے نتائج تھے۔

تاریخ طبری کی روایت ہو کہ مسلمان جب مدائن پہونچے اور مال غنیمت جمع کرنے لگے تو ایک شخص اپنے حصہ کا مال غنیمت لایا اور خازن کے سپرد کر دیا، لوگوں نے کہا ایسا قیمتی سامان تو دیکھنے میں نہیں آیا ہمارے پاس جو مال ہے اس کو اس سے کچھ نسبت نہیں ان لوگوں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے اس سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا معاملہ نہ ہوتا تو تم کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی، ان لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ یہ معمولی شخص نہیں، انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا میں یہ نہیں بتا سکتا اس لئے کہ تم تعریف کروگے، سب تعریف اللہ کی ہے اسی کے ثواب پر میں راضی ہوں، جب وہ واپس ہوا تو لوگوں نے ایک آدمی پیچھے کر دیا کہ معلوم کرو کون ہے، معلوم ہوا کہ عامر ان کا نام ہے اور عبد قیس قبیلہ سے ان کا تعلق ہے۔[1]

توحید کے عقیدہ نے ان کا سر اونچا اور گردن فراز کر دی تھی، کیا مجال تھی کہ غیر اللہ کے سامنے یا جابر بادشاہ کے آگے، یا کسی عالم و درویش یا دینی یا دنیوی سردار کے سامنے ان کی گردن خم ہو، اس ایمان نے ان کے دل و نظر کو خدائے تعالیٰ کی عظمت سے معمور کر دیا تھا، مخلوقات کا حسن و جمال دنیا کی دل فریبیاں، شان و شوکت کے مظاہرے ان کی نظر میں ہیچ تھے، وہ جب ملوک و سلاطین اور ان کے جاہ و حشم،

مخلوقات و مظاہر سے بے رغبتی

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۶

کروفر اور ان کے درباروں کی سجاوٹ اور زیب و زینت پر نظر ڈالتے اور یہ دیکھتے کہ یہ سلاطین اسی میں خوش ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا کہ چند بے جان مجسمے یا مٹی کی مورتیاں ہیں جن کو انسانی لباس سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔

ابو موسیٰ کہتے ہیں جب ہم نجاشی کے پاس پہونچے تو اس کا دربار لگا تھا، دائیں جانب عمرو بن العاص، بائیں جانب عمارہ تھے، مذہبی پیشوا دو رویہ بیٹھے تھے عمرو اور عمارہ نے بادشاہ سے کہا کہ یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے، پادریوں نے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو، حضرت جعفرؓ نے برجستہ جواب دیا کہ ہم صرف خدا کو سجدہ کرتے ہیں[1]

حضرت سعدؓ نے رستم کے پاس جو کہ ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا ربعی بن عامرؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا، ربعی بن عامرؓ پہونچے تو دربار فرش فروش سے آراستہ تھا، رستم یاقوت اور بیش بہا موتی زیب بدن کئے لباس بیش قیمت پہنے، تاج سر پر رکھے سونے کے تخت پر بیٹھا تھا، ربعی بن عامر پھٹے پرانے لباس میں پہونچے، مختصر سی ڈھال، چھوٹا سا گھوڑا یہ ان کی حیثیت تھی، وہ گھوڑے پر سوار فرش کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے گئے اور پھر گھوڑے سے اترے، قیمتی گاؤ تکیہ سے گھوڑا باندھ دیا اور خود رستم کے پاس جانے لگے، آلات حرب ساتھ، سر پر خود، جسم پر زرہ بھی موجود تھی، لوگ بولے جنگی لباس کو اتار دو، کہنے لگے میں خود سے نہیں آیا، مجھے بلایا گیا ہے، اگر تم کو منظور نہیں تو ابھی واپس جاتا ہوں، رستم نے کہا آنے دو وہ اسی فرش پر نیزے سے سہارا لیتے ہوئے بڑھے نیزے کی نوک نے فرش کو

---

[1] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۳

جا بجا سے کاٹ دیا، لوگ بولے تمھارا کیسے آنا ہوا، بولے ہم کو اللہ نے اسی لئے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اسکی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلاکر اللہ کی بندگی میں داخل کردیں اور دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہونچادیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلاکر اسلام کے عدل کے سایہ تلے لے آئیں[1]

بے نظیر شجاعت اور زندگی کی حقارت

آخرت کے عقیدے نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسی دلیری بھری تھی جو بالکل خارق عادت تھی، ان میں جنت کا عجیب وغریب شوق اور زندگی کی تحقیر پیدا کردی تھی، جنت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس طرح کھنچ جاتا تھا جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں وہ اس طرح جنت کی جانب لپکتے تھے جیسے ناخدا اپنی منزل پر پہونچ کر دم لیتا ہے۔ اڑان میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنی منزل پر پہونچکر دم لیتا ہے۔

معرکۂ احد میں جب کہ بہت سے مسلمان میدان چھوڑ چکے تھے، حضرت انس بن نضرؓ بڑھے انھوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے اے سعد بن معاذؓ بخدا کی قسم جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اسی طرف سے آرہی ہے، انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم نے انکے سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے کچھ تلوار کے تھے کچھ نیزے کے اور کچھ تیروں کے زخم تھے، ہم نے ان کو اس حالت

---

[1] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)

میں دیکھا کہ مشرکین نے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے جنھوں نے ان کو انگلی کے پوروں سے شناخت کیا اور کوئی نہ پہچان سکا[۱]

بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ بڑھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان ہے، تو عمیر بن حمام انصاری نے کہا یا رسول اللہ اس کی وسعت زمین و آسمان ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کیا تم کو شک ہے، کہنے لگے نہیں یا رسول اللہ میری یہ تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا، آپ نے فرمایا ہاں ہاں پالوگے وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے، پھر بولے اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا پھر تمام کھجور الگ پھینکے اور میدان میں کود پڑے، اور شہادت پائی[۲]

ابوبکر بن ابوموسیٰ اشعری راوی ہے کہ میرے والد دشمن کے مقابل تھے اور فرما رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں، یہ سن کر ایک شخص اٹھا اس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا اس نے کہا ابوموسیٰ تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے انھوں نے جواب دیا ہاں، وہ شخص اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور اس نے کہا میرا سلام قبول ہو اور تلوار کا پرتلا توڑ کر ڈال دیا اور تلوار لے کر دشمن کے مقابلہ میں آگیا اور شہادت پائی[۳]

عمرو بن جموح کے چار بیٹے تھے اور ان کے خود کے پیر میں لنگ تھا جب

---

[۱] بخاری و مسلم [۲] مسلم [۳] مسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں تشریف لیجاتے تو وہ بیٹے آپ کے ہمراہ جاتے جب آپ غزوہ احد کے لئے تشریف لے جانے لگے تو عمرو بھی ساتھ ہونے لگے ان کے بیٹوں نے سمجھایا کہ آپ کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے اگر آپ تشریف نہ لے جائیں تو زیادہ اچھا ہے اور ہم تو آپ کی طرف سے کافی ہیں ہی، اللہ نے جہاد آپ پر سے ساقط کر دیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے کہنے لگے یا رسول اللہ یہ میرے بیٹے مجھ کو آپ کے ہمراہ نکلنے سے روکتے ہیں اور بخدا میری یہ تمنا ہے کہ میں اپنے اسی معذور پاؤں سے جنت میں چلوں پھروں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے تم کو جہاد سے معاف فرما دیا ہے، دوسری طرف ان کے بیٹوں سے فرمایا کہ جانے کیوں نہیں دیتے شاید شہادت اللہ تعالیٰ نصیب فرما دے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے اور شہادت پائی۔[۱]

شداد بن ہاد کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، ایمان لایا اور آپ کے ساتھ ہو لیا اور کہا میں آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا، آپ نے ایک صحابی سے فرمایا کہ اس کا خیال رکھنا، خیبر کا معرکہ پیش آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت تقسیم فرمایا اس میں اعرابی کا بھی حصہ لگا کر صحابہ کے سپرد فرمایا یہ اعرابی سب کے جانور چرایا کرتا تھا جب شام کو لوٹ کر آیا تو لوگوں نے اس کا حصہ اس کے حوالہ کر دیا اس نے کہا یہ کیا؟ لوگوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۳۵

نے تمھارا حصہ لگایا تھا، اس نے لے لیا اور لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا اور کہا یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تمھارا حصہ ہے، وہ بولا میں اس لئے آپ کے ساتھ نہیں ہوا تھا میں تو اس لئے رفاقت اختیار کی تھی کہ اس جگہ تیر لگے اور اس نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا تاکہ میں جنت جا سکوں آپ نے فرمایا اگر خدا سے تیرا معاملہ سچا ہے تو خدا بھی تیری یہ آرزو پوری کر دے گا، جب جنگ ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اعرابی کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس کو شہید پایا، آپ نے پوچھا کہ کیا یہ وہی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا ہاں، آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ سچا تھا، اللہ نے بھی اس کو سچا کر دیا۔[1]

مکمل سپردگی

یہ تمام اس ایمان سے پہلے ایک پراگندہ و غیر منظم زندگی گزار رہے تھے، نہ کسی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے، نہ کسی ضابطۂ حیات کے پابند تھے، نہ کسی نظام زندگی سے منسلک تھے، وہ خواہشات کے تابع تھے، بغیر سمجھے بوجھے عمل کرتے گمراہیوں میں بھٹکتے پھرتے، اب وہ ایمان اور بندگی کے دائرہ میں اس طرح داخل ہو گئے تھے کہ ان کے لئے اس سے باہر آنا مشکل ہو گیا تھا، انھوں نے اللہ کی شہنشاہیت اور اسکے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے کو بندہ، بنایا، اور مطیع مطلق مان لیا تھا، مکمل طور پر اسکو اپنی قیادت حوالہ کر دی تھی، قانون الٰہی کو بے چوں وچرا تسلیم کر چکے تھے اور خواہشات و خود سری سے مکمل طور پر دستبردار ہو گئے تھے: وہ ایسے غلام بن گئے تھے جو اپنے مال کا مالک ہو،

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۹

نہ اپنی جان کا، جو مالک کی مرضی اور اجازت کے بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف بھی نہیں کرسکتا ہے، ان لوگوں کی صلح وجنگ، دشمنی و دوستی، خوشی و ناراضگی، عطا و محرومی اور صلہ و قطع رحمی سب اللہ کے حکم کے تابع بن چکی تھی جو کچھ بھی کرتے اسکے حکم کے موافق کرتے، وہ لوگ جاہلیت سے خوب واقف تھے، اس میں پلے بڑھے تھے اس وجہ سے اسلام کا مطلب خوب سمجھتے تھے، ان کو خوب معلوم تھا کہ اسلام نام ہے ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف منتقل ہونے کا، ایک طرف بندوں کا راج یا صرف نراج ہے، دوسری طرف خدا کی حکومت ہے کل تک خدا سے جنگ تھی اور اسکے قانون سے کش مکش، اب مکمل اطاعت و سپردگی اور دائمی صلح و آشتی ہے، کل تک صرف خودی تھی اب صرف خدا کی بندگی، جب اسلام کو اختیار کرلیا تو اب خود رائی اور خود سری کا کوئی کام نہیں، اب حکم خداوندی سے سرتابی اور قانون الٰہی سے بغاوت کی کوئی گنجائش نہیں، خدا کے حکم کے بعد اختیار باقی نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت اور اس سے حجت و بحث کا کوئی موقع نہیں، نہ غیر اللہ کے سامنے مقدمہ جاسکتا ہے اور نہ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ ہوسکتا ہے، نہ دین کے مقابلہ میں رسم و رواج کی پابندی ہوسکتی ہے، نہ نفس پرستی باقی رہ سکتی ہے، جب وہ اسلام لائے تو انھوں نے جاہلی زندگی کو اس کی تمام خصوصیات، عادات اور رسوم کے ساتھ ترک کردیا اور اسلام کو پوری خصوصیات، متعلقات اور لوازم کے ساتھ اختیار کیا اس سے ان کی زندگی میں بلا تاخیر مکمل انقلاب رونما ہوگیا۔

فضالہ بن عمیر بن ملوح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا

ارادہ کیا آپ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے جب فضالہ آپ کے قریب ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون؟ فضالہ ــــــ انھوں نے جواب دیا ہاں فضالہ، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے فرمایا کہ تم کیا سوچ کر رہے تھے؟ کہنے لگے نہیں کچھ نہیں، اللہ کو یاد کر رہا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے پھر فرمایا اللہ سے توبہ کرو پھر اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر رکھا اور ان کا قلب پُر سکون ہو گیا، فضالہ کہا کرتے تھے آپ کا ہاتھ جیسے ہی سینہ سے اٹھا آپ مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے زیادہ کوئی محبوب چیز پیدا ہی نہیں کی۔ فضالہ کہتے ہیں میں گھر لوٹا تو راستہ میں وہ عورت ملی جس سے دل لگی کیا کرتا تھا اس نے کہا آؤ باتیں کریں، میں نے کہا اللہ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کا کوئی امکان نہیں[1]

صحیح معرفت انبیاء علیہم السلام نے انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسکے افعال کا صحیح اور یقینی علم عطا کیا تھا اس عالم کی ابتداء و انتہا اور موت کے بعد انسان کا جس سے سابقہ پڑنے والا ہے اس سب کا علم انبیاء کے ذریعہ انسانوں تک بے منت و مشقت پہونچا تھا۔

انبیاء علیہم السلام نے ایسے علوم میں ان کی رہنمائی کی جن کے اصول و مبادی بھی ان کو حاصل نہ تھے جن پر یہ انسان اپنی تحقیق کی عمارت قائم کر سکتا، انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کے وقت اور قوت کو بچا لیا اور مابعد الطبیعیات و

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۲۳۲

مسائل الٰہیات کی اس لاحاصل تلاش و تحقیق سے فرصت دی جس میں نہ ان کے حواس کام دے سکتے تھے نہ نظر رسا پا سکتی تھی نہ ان کے پاس اس کے بنیادی معلومات ہی موجود تھے۔

لیکن لوگوں نے اس نعمت کا شکر ادا نہ کیا ایک بے ضرورت مہم اپنے سر لی، ان حقائق کو جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان کو بے محنت حاصل ہو گئے تھے از سر نو تحقیق شروع کی اور ان نامعلوم خطوں میں سفر کی ابتدا کی جہاں ان کے ساتھ نہ کوئی رہبر تھا اور نہ کوئی ان کی راہوں سے باخبر، وہ اس معاملہ میں اس سیاح سے بھی زیادہ بد قسمت اور فضول پسند ثابت ہوئے، جو ان معلومات و تحقیقات پر قانع نہیں جو جغرافیہ اور نقشہ جات کی شکل میں نسلوں اور صدیوں کی محنتوں کا نتیجہ ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی کی از سر نو پیمائش کرے، صحراؤں، فاصلوں اور حدود کو اپنی اس مختصر عمر، اور محدود وسائل کے ساتھ دوبارہ منضبط کرے اس آدمی کی محنت کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تھک کر رہ جائے، اس کا عزم جواب دے جائے، اور وہ شخص صرف چند یادداشتوں اور ناتمام اشاروں کا سرمایہ جمع کر سکے، اس سے بڑھ کر جن لوگوں نے الٰہیات کے میدان میں بلابصیرت اور روشنی کے بغیر قدم رکھا ان کو اس علم میں سوائے متضاد آراء اور ادھورے معلومات، اتفاقی خیالات اور عجلت کے نظریات کے کچھ ہاتھ نہ لگا خود راہ کھو بیٹھے اور دوسروں کی بھی منزل کھوٹی کی۔

صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) دین کے بارے میں بڑے خوش قسمت

اور صاحب توفیق تھے کہ دین کے بارے میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم واطلاع پر پورا اعتماد کیا اور ذات وصفات کے بارہ میں "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی سعی لاحاصل سے محفوظ رہے، انھوں نے اپنی ذکاوت و طاقت کو محفوظ رکھا اور اپنی جد وجہد اور کوشش اور اپنے اوقات کو پوری احتیاط کے ساتھ دین و دنیا کے مفید میدانوں میں صرف کیا، وہ دین کے مضبوط حلقہ کو تھامے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر دوسروں کے پاس دین کے متعلقات و تفصیلات تھے تو ان کے پاس دین کا مغز اور اس کا لب لباب تھا۔

انسانی گلدستہ

اللہ و رسول اور یوم آخرت پر ایمان اور کامل سپردگی نے زندگی سے پیچ وخم کو دور کر دیا اور انسانی خاندان کے ہر فرد کو اس کا صحیح مقام عطا کیا، انسانی معاشرہ ایک بے خار گلدستہ بن گیا جس کا ہر پھول اور ہر پتی اس کے لئے باعث زینت تھی۔

نوع انسانی کے افراد ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے، وہ سب ایک باپ (آدمؑ) کی اولاد تھے اور آدم کی اصل مٹی سے ہے، نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت تھی اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر فوقیت تھی، ہاں اگر کسی کو کسی پر فضیلت تھی تو محض تقویٰ کی بنا پر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اے لوگو! بیشک اللہ نے تم سے جاہلیت کے عیب کو دور فرما دیا اور آباؤ اجداد پر فخر کرنے کی رسم ختم کر دی انسانوں کی دو ہی قسمیں ہیں نیک اور خدا سے ڈرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں شریف، دوسرے بدکار بدبخت اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ذلیل" [۵۱]

---

[۵۱] ابن ابی حاتم

حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے فرمایا:۔ "دیکھو تم کسی سے نہ بہتر ہو اور نہ بڑے، ہاں اگر تقویٰ میں بڑھ جاؤ (تو بےشک بڑے ہو)

"آپ جب اپنے رب سے رات کے آخری حصہ میں مناجات کرتے تھے تو فرماتے تھے:۔ میں گواہ ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں"[1]

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاہلیت کا پورا پورا استیصال کر دیا تھا اور اسکے داخلے کے تمام روزن بند کر دیے تھے۔ فرمایا:۔

"جو عصبیت کا علمبردار ہو وہ ہم میں سے نہیں، اور جو عصبیت پر جنگ کرے وہ ہم میں سے نہیں اور جس کی موت عصبیت پر ہو وہ بھی ہم میں سے نہیں"[2]

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں تھے ایک مہاجر نے ایک انصاری کو کچھ کہہ دیا اور انصاری پکار اٹھا "انصاریو!" اور مہاجر پکار اٹھا "مہاجرو!" تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "چھوڑو اس جتھے بندی کے نعروں کو یہ نجس ہے"[3]

آپ نے جاہلی حمیت کو ناجائز قرار دیا اور مدد و تعاون کے اس جاہلی اصول کو بدل دیا جس پر ساری زندگی چل رہی تھی کہ اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔

---

[1] ابوداؤد [2] ایضاً [3] صحیح بخاری۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "جس نے اپنے لوگوں کی باطل پر مدد کی تو وہ اس اونٹ کی مثال ہے جو کنوئیں میں گرنا چاہتا ہے اور لوگ اس کو دم سے پکڑ پکڑ کر روکتے ہوں[1]" عربوں کی نفسیات اور ذہنیت ایسی تبدیل ہو گئی کہ اب ان کا ذوق اس مشہور مثل کو ہضم نہ کر پاتا تھا، جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک بار یہ فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم" تو صحابہ کرام خاموش نہ رہ سکے اور بے ساختہ بولے۔ کہ یا رسول اللہ مظلوم کی مدد تو بے شک کی جائے، مگر ظالم کی مدد کیسے کی جائے، آپ نے فرمایا، "اس کو ظلم سے روکو یہی اسکی مدد ہے[2]"

اسلامی معاشرہ میں مختلف طبقے شیر وشکر ہو گئے تھے، وہ ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے، اب وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار نہیں تھے، مرد عورتوں کے ذمہ دار و منتظم تھے، عورتیں نیک، وفا شعار اور امانت دار تھیں، ان کے حقوق مردوں پر تھے، اور مردوں کے حقوق اُن پر تھے۔

ذمہ دار معاشرہ

پورے معاشرے میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا، اب انسانی معاشرہ (سوسائٹی) ایک مجبور و بے اختیار اور مغلوب و معطل جماعت نہ تھی جو نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتی ہے نہ اپنے اختیار سے، اسکی عقل و شعور اور اس کا اختیار تسلیم کیا جا چکا تھا، اس کا ہر فرد ایک ذمہ دار با اختیار شخص تھا، جو اپنے دائرہ میں

---

[1] تفسیر ابن کثیر [2] بخاری و مسلم

صاحب اختیار و ذمہ دار تھا، آدمی اپنے گھر کا سرپرست اور ذمہ دار ہوتا تھا، عورت اپنے شوہر کے گھر کی منتظم اور ماتحتوں کے متعلق جواب دہ تھی، ملازم اپنے مالک کے مال میں ذمہ دار اور اس ذمہ داری کا جواب دہ تھا، اس طرح اسلامی معاشرہ ایک ذی ہوش اور صاحب اختیار معاشرہ تھا جو اپنے اعمال کا جواب دہ تھا۔

تمام مسلمان حق کے مددگار بن گئے تھے، ان کا کام مشورہ سے ہوتا خلیفہ جب تک خدا کا مطیع رہتا وہ اسکے مطیع ہوتے اور اگر نافرمانی کرتا تو اطاعت باقی نہ رہتی، حکومت کا شعار "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" بن گیا تھا یعنی خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں وہ مال اور خزانے جو سلاطین اور رئیسوں کا لقمۂ تر اور امراء کی ذاتی جائداد سمجھے جاتے تھے اب اللہ کی امانت سمجھے جانے لگے تھے، اس کی رضا میں خرچ اور صحیح محل پر صرف کیے جاتے، اور مسلمان اس دولت کے امین اور متولی تھے، خلیفہ کی مثال یتیم کے سرپرست کی سی تھی، اگر صاحب استطاعت ہوتا تو احتیاط کرتا اور اگر صاحب حاجت ہوتا تو بقدر ضرورت لیتا، اللہ کی وہ زمین جس کو سلاطین و امراء نے اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا جس کے لیے چاہتے وسعت دیتے تھے اور جس پر چاہتے تنگ کر دیتے تھے اور بعض اس میں کپڑے کی طرح کتر بیونت کرتے تھے، اب اللہ کی زمین تھی جس کے متعلق ایک ایک بالشت کا حساب دینا تھا۔

صاحب ضمیر معاشرہ انسانی سوسائٹی مدت سے اپنا ارادہ و اختیار اور ذوق و نشاط کھو چکی تھی، وہ ایک گھٹی گھٹی سی سوسائٹی بن کر

رہ گئی تھی، وہ ایک مجبور و مقہور جماعت تھی جس کی نہ جنگ کے بارے میں رائے لی جاتی تھی، نہ صلح کے موقعہ پر اس کی مرضی معلوم کی جاتی تھی، اس سوسائٹی کے افراد کو قربانی و ایثار اور تکالیف کو جھیلنے، مشقتوں سے مقابلہ کرنے پر مجبور کیا جاتا، حالانکہ اسکو نہ تو اسکی خواہش ہوتی اور نہ اس سے کچھ فائدہ، نہ وہ افسروں کو پسند کرتے اور نہ افسران ان کو، وہ مجبور تھے کہ انکی اطاعت کریں جنسے وہ ناپسند کرتے ہوتے اور اپنی جان و مال کو اس پر قربان کریں جس سے وہ نفرت کرتے ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلوں کی چنگاری بجھ گئی، جذبات سرد پڑ گئے، اور لوگوں کا اٹھان، ریاء اور فریب پر ہوا، تو ہین و حقارت اور ذلت کے برداشت کی طبیعتیں عادی ہوگئیں۔

محبت کا صحیح مصرف

وہ فطری عنصر جن کے سر انسانیت کے اکثر بجوبہ روزگار اور حیرت انگیز کارناموں کا سہرا ہے جس کو لوگ (محبت) سے یاد کرتے ہیں، عرصہ سے حقیر اور مردہ تھا، صدیوں سے کوئی اس کو کام میں لگانے والا اور اس سے حقیقی فائدہ اٹھانے والا پیدا نہیں ہوا تھا، بس وہ چمک دمک اور حسن و جمال کے فانی مظاہر کی نذر ہو کر رہ گیا تھا، عرصہ سے دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں پیدا ہوا تھا جو اپنے جمال و کمال اور اپنی اعلیٰ صفات سے ساری انسانیت کی محبت کا مستحق ہو اور اپنی طاقت ور دل آویز شخصیت سے اس محبت سے کام لے سکے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں انسانیت کو وہ گم شدہ دولت مل گئی، آپ وہ انسان تھے جن کو اللہ نے مجموعۂ خوبی بنایا تھا، دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ آپ کو

جو اچانک دیکھتا مرعوب ہو جاتا، اور جو آپ سے ملتا جلتا وہ فریفتہ ہو جاتا، آپ کا تعریف کرنے والا کہتا، آپ جیسا نہ آپ کے قبل دیکھنے میں آیا اور نہ آپکے بعد، آپکے آنے کے بعد بحقّی اور پاک محبت کا بند چشمہ اُبل پڑا، نفوس و قلوب اس طرح کھنچے جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے، گویا کہ طبیعتیں اور دل پہلے سے آپکے منتظر اور آپکے لئے بیتاب تھے، آپکی امت کے افراد نے آپ سے ایسی محبت اور ایسی اطاعت کی ہو جس کی مثال عشاق اور اہل محبت کی تاریخ میں سننے میں نہیں آئی، آپکی اطاعت و تابعداری میں اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے اور گھربار مال و دولت لٹا دینے کے ایسے واقعات پیش آئے جو نہ آپکے قبل پیش آئے تھے اور نہ آئندہ انکی امید ہے۔

محبت و جاں نثاری

حضرت ابوبکرؓ کے اسلام لانے کے بعد ان پر مکہ میں ایک روز دشمنوں نے حملہ کر دیا، عتبہ بن ربیعہ نے اس قدر مارا کہ آپ کا چہرہ سوج گیا، حتیٰ کہ شناخت تک مشکل ہو گئی تھی، بنو تیم حضرت ابوبکر کو کپڑے میں لپیٹ کر ان کے گھر اٹھا لے گئے، ان کو آپکی موت میں ذرا شک نہ تھا، آپ کو دن ڈھلتے ہوئے ہوش آیا تو سب سے پہلے بولے کہ "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال ہے"؟ لوگوں کو اس پر بڑا غصہ آیا کہ اس حالت میں بھی آپ انھیں کو یاد کرتے ہیں جن کی وجہ سے یہ حال ہو، وہ آپ کو برا بھلا کہنے لگے، انھوں نے اُن کی ماں ام الخیر سے کہا کہ دیکھو ان کو کچھ کھلا پلا دو، انھوں نے کچھ کھانے کے لئے اصرار کیا، آپ برابر کہتے رہے کہ "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا "بخدا مجھے تمھارے ساتھی کا کچھ علم نہیں"۔ انھوں نے کہا تو

"خطاب کی بیٹی ام جمیل کے پاس جاؤ اور آپؐ کی خیریت دریافت کرکے مجھے بتاؤ" وہ ام جمیل کے پاس آئیں اور کہا کہ "ابوبکر محمد بن عبداللہ کے متعلق پوچھتے ہیں" انھوں نے کہا، کہ "میں نہ ابوبکر کو پہچانتی ہوں اور نہ محمد بن عبداللہؐ کو، اور اگر تمھاری یہ خواہش ہو کہ میں تمھارے ساتھ تمھارے بیٹے کے پاس چلوں تو ہو سکتا ہے" انھوں نے کہا "ہاں چلو" وہ اُن کے ہمراہ گئیں اور ابوبکر کو پڑا ہوا پایا، ام جمیل ان کے قریب پہونچیں تو ان کا حال دیکھ کر کہا "واللہ! جس قوم نے تمھارے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے وہ فاسق و کفار ہیں، اور مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے تمھارا انتقام لے گا" انھوں نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال ہے؟ وہ بولیں کہ تمھاری ماں سنتی ہیں! انھوں نے کہا ان سے کچھ پردہ نہیں" انھوں نے جواب دیا، بخیر و عافیت ہیں، آپؓ نے فرمایا کہاں ہیں؟ وہ بولیں "دار ابن ارقم میں" انھوں نے فرمایا بس تو بخدا میں کھا پی نہیں سکتا جب تک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تک نہ پہونچ جاؤں" وہ دونوں ذرا رکیں، جب رات ہوئی اور آمد و رفت موقوف ہوئی تو وہ ان کو لے کر نکلیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہونچا دیا آپ نے جب حضورؐ کو دیکھ لیا تو جان میں جان آئی اور کھایا پیا[1]

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر اُحد کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہمراہ تھے اور شہید ہو گئے تھے قیام گاہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۰۔

سے نکلی اور پوچھنے لگی "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال ہے"؟ لوگوں نے کہا: "بحمد اللہ عافیت سے ہیں جیسا تم چاہتی ہو"۔ اس نے کہا "مجھے دکھاؤ، میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں"۔ اس نے جب آپ کو دیکھ لیا تو بولی، اگر آپ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔[1]

حضرت خبیبؓ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا، سب کہنے لگے کہو یہ پسند ہے کہ محمدؐ تمہاری جگہ ہوں؟ انھوں نے کہا خدائے تعالیٰ کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ کے پیر میں کانٹا چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔ وہ سب ہنس دیئے۔[2]

زید بن ثابت کہتے ہیں کہ احد کے روز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے سعد بن ربیع کی تلاش میں بھیجا اور مجھ سے فرمایا، ان کو اگر دیکھو تو میرا سلام کہو اور کہو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں کہ اپنے کو کیسا پاتے ہو کہتے ہیں کہ میں مقتولین میں چکر لگانے لگا، پھر ان کے پاس پہونچا، ان کا آخری وقت تھا اور ان کے جسم پر تیر و تلوار اور نیزے کے ستر زخم تھے، میں نے ان سے کہا "اے سعد! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو سلام کہتے ہیں اور دریافت فرماتے ہیں کہ تمہارا کیا حال ہے"؟ انھوں نے کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سلام کہو، اور آپ سے کہہ دو یا رسول اللہ جنت کی خوشبو پا رہا ہوں، اور میری قوم انصار سے کہہ دو کہ اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ ہو گیا اس حال

---

[1] ابن اسحٰق و بیہقی [2] البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۶۳

یں کہ تم میں ایک آنکھ بھی حرکت کر سکتی ہو، تو اللہ کے یہاں تمہارا کوئی عذر نہیں اور اسی وقت روح پرواز کر گئی ہے[1]

احد کے روز ابو دجانہ نے اپنی پیٹھ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ڈھال بنا دیا تھا تیر اس پر لگتے تھے اور وہ حرکت نہ کرتے،[2] مالک الخدری نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زخم چوس کر صاف کر دیا تھا، اُن سے آپ نے فرمایا تھوک دو انھوں نے کہا:- بخدا! میں کبھی بھی نہ تھوکوں گا۔[3]

ابو سفیان جب مدینہ آئے اور اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس پہونچے، اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے اس کو لپیٹ دیا، انھوں نے کہا "اے بیٹی! مجھے خبر نہیں کہ تم نے بستر میرے لائق نہ سمجھا، یا مجھ کو اسکے لائق نہ سمجھا"۔ انھوں نے کہا نہیں! بلکہ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بستر ہے اور تم مشرک نجس ہو۔[4]

عروہ بن مسعود ثقفی نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا "اے لوگو! بخدا میں سلاطین کے یہاں گیا، کسریٰ، قیصر اور نجاشی کے دربار بھی دیکھے، خدا کی قسم میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمد کے ساتھی محمد کی۔ خدا کی قسم جب کبھی وہ تھوکتے ہیں ان میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر گرتا ہے وہ اپنے

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۳۴ [2] ایضاً ص ۱۳۰ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۳۰

[4] سیرۃ ابن ہشام۔

چہرے اور جسم پر مل لیتا ہے، اور جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں، اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے لڑتے رہ جاتے ہیں، اور جب بات کرتے ہیں تو وہ لوگ اپنی آوازیں پست کرلیتے ہیں، اور وہ لوگ فرطِ ادب سے آپؐ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔[1]

اطاعت و تابعداری

اطاعت و تابعداری محبت کا لازمی نتیجہ ہے، جب صحابۂ کرامؓ محبت کی دولت سے مالامال ہوئے تو انھوں نے اپنی ساری طاقت آپؐ کی اطاعت میں صرف کردی اس کی بہترین مثال سعد بن معاذ کا وہ قول ہے جو انھوں نے اپنی اور جماعت انصار کی جانب سے بدر سے قبل کہا تھا:۔

"میں انصار کی طرف سے شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں اور ان کی جانب سے جواب بھی دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں مقیم ہوں، جس کا تعلق چاہیں قائم رکھیں اور جس کا چاہیں توڑ دیں، اور ہمارے مال و دولت سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دیدیں، جو کچھ کہ آپ ہم سے لے لیں گے وہ اس سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑ دیں گے اور جس بارے میں جو کچھ حکم فرمائیں گے ہم اس کے تابع ہوں گے، بخدا اگر آپ برک غمدان تک چلے جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چل پڑیں گے، اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں گھوڑا ڈالدیں گے

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۲۵

تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے[۱]

ان کی اطاعت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان تین شخصوں سے گفتگو ممنوع قرار دی تھی جو غزوہ تبوک نہ جا سکے تھے، تو لوگوں نے آپ کی بات مانی اور مدینہ ان تینوں کے لئے شہر خموشاں بن گیا جہاں کوئی بات کرنے والا اور بات کا جواب دینے والا نہ تھا، کعب کہتے ہیں:-

"رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم تینوں سے گفتگو منع فرما دی تھی، لوگ ہم سے کترانے لگے اور ان کی نگاہیں بدل گئیں حتیٰ کہ مجھے زمین تنگ محسوس ہونے لگی، گویا وہ زمین ہی نہ تھی جس کو میں جانتا تھا، یہاں تک کہ جب لوگوں کی بے رخی بہت بڑھ گئی میں چلا اور ابو قتادہ کی دیوار پھاند کر ان کے باغ میں گھس گیا، یہ ابو قتادہ وہ ہیں جو میرے محبوب چچا زاد بھائی تھے اور میرے سب سے زائد چہیتے تھے، میں نے ان کو سلام کیا، بخدا انھوں نے مجھے جواب بھی نہ دیا تو میں نے ان سے کہا اے ابو قتادہ! میں تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، کیا تم کو علم ہے کہ میں اللہ و رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں وہ خاموش رہے، میں نے پھر دہرایا، ان کو واسطہ دیا اور وہ خاموش رہے، میں نے مکرر کہا اور ان کو واسطہ دیا، تو وہ بولے کہ اللہ اور اسکے رسولؐ کو زیادہ علم ہے، میری آنکھیں بھر آئیں اور میں

---

[۱] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۳۰

پلٹ پڑا اور دیوار پھاند کر باہر نکل آیا۔"[1]

ان کی اطاعت کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ ناراضگی و بے رخی کے ہدف تھے، کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قاصد آتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علٰحدہ رہنا، وہ بولے "طلاق دیدوں یا کیا کروں"؟ وہ بولا "نہیں، بلکہ الگ رہو ان کے قریب مت جاؤ"۔ تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، ان ہی کے پاس رہو، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس معاملہ میں کچھ فیصلہ کردے۔[2]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کی محبت و تعلق کا یہ حال تھا کہ ہر ایک پر آپ کو ترجیح دیتے تھے، عین اس مقاطعہ کے زمانہ میں غسان کا بادشاہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دربار کی پیش کش کرتا ہے، اس بے رخی اور عتاب کے زمانے میں یہ حقیقتاً سخت آزمائش تھی، لیکن وہ رد کردیتے ہیں کہتے کہ میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ ان شامی نبطیوں میں سے جو مدینہ میں غلہ فروخت کرنے آتے تھے، ایک نبطی کہتا ہے کعب بن مالک کو کوئی بتا دے یہ سن کر لوگ میری جانب اشارے کرنے لگے، اس نے میرے پاس پہونچکر شاہ غسان کا ایک خط حوالے کیا، میں پڑھا لکھا تھا، میں نے اسکو پڑھا اس میں تحریر یہ تھا کہ :-

"ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ تمھارے آقا نے تم سے بے رخی اختیار کرلی ہے

---

[1] بخاری و مسلم [2] ایضاً

اللہ تعالیٰ نے تم کو ذلت کے لئے نہیں رکھا اور وہ تم کو ضائع کرنا نہیں چاہتا بس تم ہم سے مل جاؤ ہم تمھارا بہت خیال رکھیں گے یہ بیں نے جب پڑھ لیا تو کہا کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے، اور میں نے جا کر اُسے تنور کی نذر کر دیا[1]

اطاعت اور فوری تعمیل حکم کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جو شراب کی حرمت کے حکم کے وقت پیش آیا، حضرت ابو بردہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ

"ہم مجلس میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اٹھا......تاکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضری دوں اور سلام کروں، ادھر شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب
إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ	اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے
وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ	تیر یہ سب گندی باتیں ہیں شیطانی
مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ،	کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو
فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	تاکہ تم کو فلاح ہو، شیطان تو یوں
إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ	چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے
يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ	ذریعہ سے تمھارے آپس میں عداوت
وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	اور بغض واقع کردے اور اللہ تعالیٰ

[1] بخاری و مسلم

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ تَعَالٰی کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔ رکھے، سو اب بھی باز آؤ گے.

(المائدۃ ع-۹۱)

میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور میں نے یہ آیت "هل انتم منتهون"
(کیا تم رک جاؤ گے) تک پڑھ کر سنا دی، کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے
ہاتھ میں ساغر تھا، کچھ پیا تھا اور کچھ ساغر میں بچ رہا تھا، جو شراب
ہونٹوں میں پہونچ گئی تھی وہ فوراً تھوک دی گئی ہے[1]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت اور اپنے نفس پر، گھر والوں اور خاندان والوں پر آپ کو ترجیح دینے کی عجیب و غریب مثال یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بلایا اور فرمایا "دیکھتے ہو تمہارے والد کیا کہتے ہیں"؟ وہ بولے یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر قربان وہ کیا کہتے ہیں آپ نے فرمایا "کہتے ہیں کہ، اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دے گا" وہ بولے "خدا کی قسم یا رسول اللہؐ! انھوں نے سچ کہا، بخدا آپ معزز ہیں اور وہ ذلیل ہیں، یا رسول اللہؐ آپ مدینہ تشریف لائے، اور اہلِ یثرب کو علم ہے کہ وہاں مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ کا کوئی فرمانبردار نہیں، اگر اللہ و رسول کی مرضی یہ ہے کہ میں اس کا سر لے آؤں، تو میں حاضر ہوں، رسول اللہؐ نے فرمایا "نہیں!"

[1] تفسیر ابن جریر ج،

جب لوگ مدینہ پہونچے تو عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی مدینہ کے دروازے پر تلوار لے کر اپنے باپ کے انتظار میں کھڑے ہو گئے جب ان کے والد آئے تو بولے :۔

" تم ہی کہتے تھے اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دے گا؟ تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ معزز کون ہے؟ خدا کی قسم! تم مدینہ میں اللہ اور اسکے رسولؐ کی اجازت کے بغیر نہیں رہ سکتے "

اس نے کہا :۔

" اے خزرج کے لوگو! دیکھو میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے، اے خزرج کے لوگو! میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے "

وہ بولے :۔

" خدا کی قسم! یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر مدینہ میں قدم نہیں رکھ سکتا "

لوگ اکٹھا ہو گئے اور ان کو سمجھایا، انھوں نے کہا :۔

" یہ اللہ اور اسکے رسول کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا "

لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے، آپؐ کو خبر دی، آپؐ نے فرمایا :۔

" جاؤ اور عبداللہ سے کہہ دو کہ آنے دو "

لوگ واپس آئے، انھوں نے کہا :۔

" ہاں! اب جب کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت آگئی ہے، وہ مدینہ میں داخل ہو سکتا ہے "[1]

---

[1] تفسیر طبری ج ۲۰

نئے افراد اور نئی امت

اس وسیع و عمیق ایمان، اس محکم پیغمبرانہ تعلیم، اس دقیق و حکیمانہ تربیت، اپنی عجیب و غریب طاقت و شخصیت اور اس معجز القول آسمانی کتاب کے ساتھ کہ جس کے عجائب و غرائب ختم ہونے کو نہیں آتے، اور جس کی تازگی میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کردی، انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیاء کی شکل میں پڑے پڑے ضائع ہو رہے تھے، جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر نہ تھی اور جن کو جہالت، کفر اور کم ہمتی نے برباد کر رکھا تھا، آپؐ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا، اس میں خدا کی مدد سے ایمان و عقیدہ پیدا فرما دیا، زندگی کی نئی روح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں اُبھار دیں اور اندرونی استعدادیں اُجاگر کردیں، پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی گویا کہ اسی کے لئے اس کا وجود تھا اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اسکی منتظر تھی، وہ بے جان پتھر تھا اب وہ ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا، وہ بے حس و حرکت مردہ تھا، اب وہ زندہ ہوکر دنیا پر حکومت کرنے لگا، پہلے نابینا تھا جس کو خود رستہ کا پتہ نہ تھا، اب ساری دنیا کا رہبر و رہنما بن گیا۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ	بھلا وہ جو مردہ ہو ہم نے اسکو زندہ
وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي	کیا اور اس کو ایک نور عنایت
بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ	کیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں میں
فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ	چلتا ہو اس جیسا ہے جو اندھیروں
مِنْهَا۔ (الانعام-۱۲۲)	میں گم ہو، نکل نہ سکتا ہو۔

آپ کی توجہ و تعلیم سے عرب کی برباد شدہ قوم میں ایسا انقلاب ہوا کہ دنیا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان میں وہ عظیم الشان شخصیتیں دیکھیں جو عجوبۂ روزگار اور دنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں، وہ عمرؓ جو اپنے باپ خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے باپ ان کو جھڑکا کرتے تھے اور جو کہ قوت و عزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں تھے، جن کو کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل نہ تھا، ان کے معاصر ان کو غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے، وہی عمرؓ تھے کہ یکبارگی تمام عالم کو اپنی عظمت و صلاحیت سے متحیر بنا دیتے ہیں، اور قیصر و کسریٰ کو تخت و تاج سے محروم کر دیتے ہیں اور ایسی اسلامی سلطنت کی بنا ڈالتے ہیں جو بیک وقت ان دونوں حکومتوں پر حاوی ہے اور تدبر و حسن انتظام میں ان سے فوقیت رکھتی ہے، ورع و تقویٰ اور عدل کو چھوڑ دیجئے کہ ان میں تو وہ ضرب المثل ہیں۔

یہ ولید کے فرزند خالدؓ ہیں قریش کے نوجوان حوصلہ مندوں میں سے ایک شخص تھے مقامی جنگوں میں انھوں نے نام پیدا کیا تھا، قریش کے سردار قبائلی جنگوں میں ان سے مدد لیتے تھے، انھوں نے جزیرۃ العرب کے علاقوں میں کوئی بڑی شہرت بھی حاصل نہیں کی تھی، اچانک وہ آسمانی تلوار (سیف من سیوف اللہ) بن کر چمکتے ہیں، جو چیز سامنے آتی ہے کٹ جاتی ہے، یہ خدائی تلوار روم پر بجلی بن کر گرتی ہے اور تاریخ کے طول و عرض میں اپنے تذکرے چھوڑ جاتی ہے۔

یہ ابو عبیدہ ہیں جن کی امانت اور نرمی کی تعریف کی جاتی تھی وہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کی قیادت کر لیا کرتے تھے، ان کو دیکھئے کہ مسلمانوں

کی سب سے بڑی قیادت کا بوجھ سنبھال لیتے ہیں۔ اور ہرقل کو شام کے ہرے بھرے ملک سے ہمیشہ کے لئے نکال دیتے ہیں، غریب اس پر وداعی نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے، اے ملک شام تجھ کو رخصتی سلام، ایسا سلام جس کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

یہ عمرو بن العاص ہیں جن کا شمار قریش کے سمجھدار لوگوں میں تھا، قریش ان کو حبشہ کا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ مسلمان مہاجرین کو واپس لے آئیں مگر ناکام واپس ہوتے ہیں، ان کو دیکھئے مصر فتح کرتے ہیں اور زبردست اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔

اور یہ سعد بن ابی وقاص ہیں، اسلام سے قبل ان کے متعلق نہ کسی بڑی فوجی قیادت کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی ماہر جنگ کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے الیکن دیکھئے مدائن کی کنجیاں سنبھالتے ہیں اور عراق و ایران کو اسلامی سلطنت میں شامل کرکے ہمیشہ کے لئے فاتح عجم کہلاتے ہیں۔

یہ سلمان فارسی ہیں، ایک مذہبی عہدہ دار کے بیٹے تھے، فارس کا ایک گاؤں وطن تھا، ایک غلامی سے دوسری غلامی اور ایک مصیبت سے دوسری مصیبت دیکھتے ہوئے مدینہ پہونچتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں، ان کو دیکھئے؟ اپنی ہی قوم کے عظیم الشان دارالسلطنت (مدائن) کے حاکم بن کر پہونچتے ہیں، کل جہاں کی رعیت کے ایک فرد تھے آج اس ملک کے حکمراں ہیں، اور اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس سے ان کے زہد سادگی میں فرق نہیں پڑتا، لوگ ان کو اس حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک جھونپڑی میں قیام ہے، سر پر بوجھ ڈھوتے ہیں۔

یہ بلال حبشیؓ ہیں، فضیلت و عزت میں اس درجہ کو پہونچتے ہیں کہ امیرالمؤمنین ان کو اپنا سردار کہتے ہیں۔

یہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں جن میں حضرت عمرؓ کو خلافت کی صلاحیت نظر آتی ہے، فرماتے ہیں: "اگر حیات ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا"۔

یہ زید بن حارثہ ہیں، جنگ موتہ کے لئے مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کرتے ہیں اور اسی لشکر میں جعفر بن ابی طالب، خالد بن ولید جیسے ممتاز لوگ بھی موجود ہیں اور ان کے بیٹے اسامہ اس لشکر کی قیادت کرتے ہیں جس میں ابوبکرؓ، عمرؓ جیسے افراد موجود تھے۔

یہ ابوذر، مقداد، ابوالدرداء، عمار بن یاسر، معاذ بن جبل، اور ابی بن کعب ہیں۔ اسلام کی باد بہاری کا ایک جھونکا چل جاتا ہے اور وہ دنیا کے نامور زاہدوں اور جلیل القدر عالموں میں دیکھتے دیکھتے شمار ہونے لگتے ہیں۔

یہ علی بن ابی طالب، عائشہ اور عبداللہ بن مسعود، اور زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباسؓ ہیں جو نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گود میں پل کر دنیا کے عظیم ترین عالموں میں شمار ہونے لگے، جن سے علم کی نہریں بہتی ہیں اور حکمت ان کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے، قلب کے سچے، علم کے گہرے اور تکلف سے دور، بات کرتے ہیں تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا ہے، خطاب کرتے ہیں تو دنیا کے مورخ کا قلم لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے کہ کوئی لفظ ضائع نہ ہو۔

متوازن انسانی مجموعہ

پھر تھوڑا عرصہ بھی نہیں گذرتا کہ متمدن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ خام اشیاء جو بکھری پڑی تھیں، جن کی معاصر قوموں نے بھی

ذرا قدر نہ کی تھی اور بڑی بڑی ملکوں نے جن کا مذاق اڑایا تھا اس سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ متوازن و مکمل مجموعہ کمالات نہیں دیکھا، جیسے ایک ڈھلا کرہ، یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کا سرا کدھر ہے، یا باران رحمت کی طرح کہ اس کا پتہ نہ چل سکے کہ اس کا پہلا چھینٹا مبارک ہے یا آخری، ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے، دین و دنیا کی ہر ضرورت کے لئے اسکے پاس سامان موجود ہے اس لئے اس کو کسی سے مدد کی ضرورت نہیں، لیکن دنیا اسکی مدد کی محتاج ہے۔

اس نو زائیدہ جماعت نے اپنی تہذیب کی خود بنیاد ڈالی، نئی حکومت کی داغ بیل ڈالی، حالانکہ اس کو اس سے پہلے اس کا کوئی تجربہ نہ تھا، اسکے باوجود اسکو ذرا ضرورت نہ پڑی کہ کسی دوسری قوم سے کوئی آدمی مستعار لے، یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے۔ ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا سکہ دو بڑے براعظموں کے وسیع رقبہ میں چلتا تھا، اسکے ہر شعبہ اور ہر ضرورت کے لئے متعدد آدمی ایسے تھے جو اپنی لیاقت، کارکردگی، امانت و دیانت ......

...... قوت اور احساس ذمہ داری میں بے نظیر تھے، یہ عالمگیر سلطنت قائم ہوئی تو اس نو زائیدہ قوم نے جس پر تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا اس کو پورے آدمی فراہم کئے جن میں کوئی عادل حاکم تھا، کوئی امانت دار خازن، کوئی منصف قاضی تھا اور کوئی عبادت گذار متقی، کوئی پرہیزگار اور متقی فوجی تھا، اس ذہنی تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری تھا اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو تشکیل پذیر ہو رہی تھی، اس اسلامی حکومت کو اعلیٰ ترین خدا ترس، فرض شناس و

مستند کارکن ملتے رہے، حکومت کی ذمہ داری ان ہی اشخاص کے سپرد ہوتی جو ہدایت کو تحصیل وصول کے جذبہ پر ترجیح دیتے، جو اپنے کو بجائے تحصیلدار کے مبلغ و ہادی سمجھتے جن کی شخصیت میں صلاحیت وصلاح اور دین و دنیا کا صحیح امتزاج ہوتا، ان کے اثر سے اسلامی تہذیب اپنی پوری خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی اور دین کے برکات اس طرح وجود میں آئے کہ پھر کسی دور میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

حقیقت میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر رکھ دی تھی بس وہ کھل گیا اور اسکے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آگئے آپ نے جاہلیت کی شہ رگ کاٹ دی اور اس کے طلسم کو پاش پاش کردیا، آپ نے سرکش اور ضدی دنیا کو خدا کی طاقت سے مجبور کردیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو اور تاریخ میں انسانیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرے، یہ وہ اسلامی دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دمکتا رہے گا۔

باب سوم

مسلمانوں کا دورِ قیادت

مسلمانوں کی قائدانہ خصوصیات

مسلمان میدان میں آئے، دنیا کی رہنمائی کی باگ انھوں نے اپنے ہاتھ میں لی اور ان بیمار قوموں کو رہنمائی کے اس منصب سے معزول کیا جس پر وہ قابض ہو گئی تھیں، اور جس کو انھوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا، مسلمانوں نے دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لے کر متوازن اور صحیح رفتار کے ساتھ صحیح منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا، ان میں وہ تمام صفات جمع تھیں جو ان کو قوموں کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں، اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح وسعادت کی ضمانت کرتی تھیں، یہ امتیازی صفات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ان کے پاس آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت تھی، اس لئے ان کو قیاس اور اپنی طرف سے قانون سازی کی ضرورت نہیں تھی، اور

اس طرح وہ جہالت وناواقفیت، روز روز کے قانونی ردوبدل اور ترمیم ہولناک غلطیوں اور مظالم سے محفوظ تھے، وہ اپنے سیاست ومعاملات میں دھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور نہ تھے، ان کے پاس وحی اور شریعت الٰہی کی روشنی تھی جس کے سہارے وہ چلتے تھے اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور اسکے موڑ ان کے لئے روشن تھے، ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا تھا اور منزل مقصود ان کو صاف نظر آتی تھی۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا۔

کیا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس میں جان ڈالی اور اس کو ایک روشنی عطا فرمائی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں گھرا پڑا ہو وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

(سورۃ الانعام ع ۱۵)

ان کے پاس الٰہی قانون تھا جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے تھے، وہ حق وانصاف کے علمبردار بنائے گئے تھے اور ان کو سخت سے سخت اشتعال وبرہمی اور عداوت وبیزاری کی حالت میں بھی انصاف اور صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے اور نفس کا انتقام لینے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے
قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ	ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور
بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	کسی قوم کی دشمنی کے باعث
شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا	انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو،
تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ	عدل کرو یہی بات زیادہ
أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا	نزدیک ہے تقویٰ سے، اور
اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا	ڈرتے رہو اللہ سے، اللہ
تَعْمَلُونَ ۔	کو خوب خبر ہے جو تم کرتے
(المائدہ ـ ۸)	ہو۔

۲۔ وہ حکومت اور قیادت کے منصب پر محکم اخلاقی تربیت اور مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے، انھوں نے دنیا کی عام حکمراں قوموں اور اہل حکومت کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب ونقائص کے ساتھ پستی سے بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی، بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الٰہی اُن کی اصلاح اور تربیت کرتی رہی تھی اور سالہا سال وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے آپؐ ان کا تزکیہ فرماتے رہے، ان کی مکمل تربیت فرمائی، زہد وورع کی زندگی کا عادی بنایا، عفت وامانت، ایثار وقربانی، خوف خدا کا اُن کو خوگر کیا، حکومت و مناصب کی حرص وطمع ان کے دل سے بالکل نکال دی، آپؐ کا ارشاد تھا کہ "بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کریں گے جس نے اسکی

زمائش کی، یا جس کو اسکی خواہش ہے[1] ترنع، ذاتی سربلندی اور اعزاز کا شوق، اور فتنہ و فساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے اُن کے کانوں میں رات دن قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑتے رہتے تھے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ	یہ آخرت کا گھر ہم اُن لوگوں
نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ	کو عطا کریں گے جو دنیا میں اپنی
عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا	بڑائی نہیں چاہتے اور فساد کے
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۔	خواہاں نہیں اور انجام بخیر
(القصص - ۸۳)	پرہیز گاروں ہی کا ہو۔

اس لئے وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہیں گرتے تھے بلکہ وہ اسکے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور اُن کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے اُن میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائے کہ وہ اپنا نام حکومت کے لئے پیش کریں، اپنے منھ سے اپنی تعریف کریں اور اپنی ذات کے لئے پروپگنڈا کریں، پھر جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اُس کو مال غنیمت یا لقمۂ تر نہ سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتا اور یقین رکھتے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے وہ یہ آیت ہمیشہ پیش نظر رکھتے۔

---

[1] روایت بخاری و مسلم

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔

مسلمانو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کو پہونچا دو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے۔

(النساء - ۵۸)

نیز یہ ارشاد ہے

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ

اور اسی نے تم کو زمین میں نائب کیا ہے اور تم میں ایک کے ایک پر درجے بلند کئے تاکہ جو نعمتیں تم کو دی ہیں ان میں تمھاری آزمائش کرلے، بیشک تمھارا پروردگار جلد سزا دینے والا اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

(الانعام - ۱۶۵)

۳۔ وہ کسی قوم کے نودمست گزار اور کسی نسل و وطن کے نمائندے نہ تھے جن کے پیش نظر محض اسکی خوشحالی اور ترقی ہو اور جو اسکی برتری اور تمام اقوام و اوطان پر اسکی سیادت کے قائل ہوں اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ ان کی قوم تنہا حکومت کرنے کے لئے، اور باقی تمام قومیں اسکی محکوم بننے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، وہ عرب سے اسلئے نہیں نکلے تھے کہ دنیا میں عربی شہنشاہی

کی بنیاد ڈالیں اور اسکے زیرِ سایہ راحت و عشرت کی زندگی گزار دیں اور اسکے زیرِ حمایت دوسروں پر فخر و تکبر کریں نہ اسلئے کہ لوگوں کو رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی اور اپنی غلامی میں داخل کرلیں، وہ صرف اس لئے نکلے تھے کہ وہ بندگانِ خدا کو اپنے جیسے تمام بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی بندگی میں داخل کریں، مسلمانوں کے سفیر ربعی بن عامر نے یزدگرد شاہ ایران کے بھرے دربار میں اسی حقیقت کا اعلان کیا، انھوں نے کہا " اللہ نے ہم کو اسلئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگی سے رہائی دیکر اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم و ستم سے نجات دے کر اسلام کے عدل و انصاف میں لائیں[1]" پس دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسان اُن کی نگاہ میں ایک حیثیت رکھتے تھے اگر فرق تھا تو محض دین کا، رسول اللہ صلعم کے اس ارشاد پر اُن کا پورا عمل تھا۔

الناس کلہم من آدم	انسانوں کی ابتدا آدم سے
و آدم من تراب لا	ہے اور آدم کی خلقت مٹی
فضل لعربی علی عجمی	سے، نہ کسی عرب کو کسی غیر
ولا لعجمی علی عربی	عرب پر فضیلت ہو نہ کسی غیر
الا بالتقویٰ[2]	عرب کو عرب پر، سوائے تقویٰ کے۔

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر۔ [2] خطبہ حجۃ الوداع

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ	لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد
مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ	اور ایک عورت سے بنایا اور
شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	تمہاری ذاتیں اور قبیلے رکھے
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ	تاکہ آپس کی پہچان ہو، اللہ
اَتْقٰکُمْ۔	کے یہاں اسی کی عزت زیادہ
	ہو جو سب زیادہ تقویٰ میں بڑھا
(الحجرات - ۱۳)	ہوا ہے۔

حاکم مصر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک مصری کو ایک موقع پر کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو ان سے بدلہ لینے کا حکم دیا اور عمرو بن العاص سے کہا "تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں"[1]

ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین و علم و تہذیب کی بخشش میں کبھی بخل و تنگ دلی سے کام نہیں لیا اور حکومت و اعزاز کے بارہ میں کبھی وطنیت اور رنگ و نسب کا لحاظ نہیں کیا، وہ ایک ابر کرم تھے جو تمام عالم پر محیط تھا اور اس کا فیض سب کے لئے عام تھا جو سارے عالم کو سیراب کرتا گیا، اور زمین کے ہر حصہ نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ عمر بن الخطاب؛ ابن جوزی۔ ص۸۹

استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اُٹھایا۔[۱]

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

ان لوگوں کے زیرِ سایہ اور زیرِ حکومت دُنیا کی تمام قوموں کو بلا اختلاف رنگ و وطن، دین، علم، تہذیب اور حکومت میں اپنا پورا پورا حصہ لینے اور عربوں کے ساتھ دنیا کی تعمیر نو میں شریک ہونے کا پورا موقع ملا، بلکہ اُن کے بہت سے افراد بہت سی فضیلتوں میں عربوں سے سبقت لے گئے اور ان میں ایسے ائمہ فقہا اور محدثین پیدا ہوئے جو خود عربوں کے سر کا تاج اور مسلمانوں کا سرمایۂ فخر ہیں۔ ابن خلدون کے الفاظ ہیں "یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ ملت اسلامیہ کے حاملین علم میں باستثناء چند اکثر غیر عرب ہیں۔ کیا علوم شرعیہ

---

[۱] حضرت ابو موسیٰ اشعری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ نے جس ہدایت و علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہو اس کی مثال ایسی ہو کہ کسی زمین پر ایک بڑی بارش ہوئی اس کا ایک ٹکڑا نرم اور صاف تھا اس نے پانی کو قبول کر لیا اور بڑا سبزہ اور ہری گھاس پیدا ہوئی کچھ حصے سنگلاخ اور بنجر تھے انھوں نے پانی کو روک لیا اور لوگوں نے اس سے نفع اٹھایا، پیا اور پلایا، اور ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ بالکل چٹیل میدان نہ پانی کو روک سکتا ہو اور نہ اس میں سبزہ اگ سکتا ہو، یہ مثال ان کی ہو جنھوں نے دین کی سمجھ حاصل کی اور اللہ نے جس چیز کے ساتھ مجھے بھیجا ہو اس سے ان کو نفع پہونچا، انھوں نے سیکھا اور سکھایا اور آخری مثال اس کی ہے جس نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ میں کیا لایا اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جو مجھے دے کر اس نے بھیجا (صحیح بخاری کتاب العلم)

میں اور کیا علوم عقلیہ میں، اور اگر ان میں سے کوئی عربی النسب ہے، تو وہ اپنی زبان تربیت اور اساتذہ کے اعتبار سے عجمی ہے، باوجود اس کے کہ دین عربی ہے اور اسکی شریعت لے کر جو پیغمبر آئے وہ بھی عرب ہی سے تعلق رکھتے تھے[۱]
بعد کی صدیوں میں بھی ان غیر عرب مسلمانوں میں ایسے قائد حکمراں وزراء، فضلاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے جو زمین کی زینت اور انسانیت کا گل سرسبد اور اپنی فضیلت، شرافت نفس، جوہر و قابلیت اور دینداری اور علم میں نادر روزگار تھے اور ان کی اتنی بڑی تعداد ہے، کہ خدا کے سوا اُن کا کوئی صحیح شمار نہیں کر سکتا۔

۴۔ انسان مجموعہ ہے جسم و روح، قلب و عقل و جوارح کا، انسان حقیقی سعادت اور فلاح اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں مناسب طور پر اُسکے مرتبہ کے شایان شان نشو و نما اور پرورش نہ پائیں، دُنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا دینی اخلاقی، عقلی، مادی ماحول نہ قائم ہو جائے جس میں انسان کے لئے بسہولت تمام اپنے کمال انسانی کو پہونچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہاز رانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو روحانیت و مادیت دونوں کے قائل

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۴۹۹

دینی و اخلاقی زندگی کا نمونہ کا ہن عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں، اگر ان کے عقیدہ یا تربیت میں ذرا سا بھی رخنہ یا دھبہ ہوگا تو وہ ان کے قائم کردہ تمدن میں بہت پھیل جائے گا۔ اور مختلف مظاہر اور صورتوں میں ظاہر ہوگا اگر کوئی ایسی جماعت غالب آگئی جو صرف مادیت کی پرستار مادی لذتوں اور محسوس منفعتوں کی قائل اور معتقد ہے وہ اس زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی پر اعتقاد نہیں رکھتی اور جو اس کے ماوراء کسی اور حقیقت پر اس کا یقین نہیں تو اسکے مزاج اس کے اصول اور میلانات کا اثر تمدن کی شکل و ساخت پر پڑنا ناگزیر ہے، وہ تمدن اسکے مخصوص سانچہ میں ڈھل کر رہے گا وہ اس پر اسکی چھاپ ہمیشہ باقی رہے گی، اس کا نتیجہ ہوگا کہ انسانیت کے بہت سے خانے بھر جائیں گے اور بہت سے خانے خالی رہ جائیں گے، اس تمدن کی نمو صرف اینٹ، پتھروں، کاغذ، کپڑے، اور لوہے اور سیسے میں ہوگی، جنگ کے میدان، عدالتیں، لہو ولعب کے مرکز اور عیش و عشرت کے حلقے اسکے مرکز ہوں گے اور وہاں وہ اپنی پوری بہار اور شباب پر ہوگا، باقی دل اور روح، لوگوں کے اخلاق، خانگی زندگی اور معاشرت، تعلقات باہمی اور معاملات اسکے حلقۂ اثر سے خارج ہوں گے اور وہاں انسان حیوانات سے ممتاز نہ ہوگا، تمدن کی کیفیت اس جسم کی سی ہوگی جس میں غیر طبعی فربہی طاری ہوتی ہو جس کی وجہ سے وہ ظاہری نگاہ میں بڑا شاندار اور پر شکوہ معلوم ہوتا ہے لیکن اندرونی طور پر وہ جیسوں امراض اور تکالیف میں مبتلا ہوتا ہے اس کا قلب ضعیف اور ماؤف ہوتا ہے

اور اسکی صحت نقطۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔

اسکے برخلاف اگر ایسی جماعت غالب آجائے جو سرے سے مادیت کی منکر یا اس کی طرف سے بے پرواہ اور صرف روحانیت اور مابعد الطبیعات حقائق کی قائل ہو اور اُس کا رویہ زندگی کے بارہ میں مخالفانہ اور معاندانہ ہو تو تمدن کا شاداب پھول کمھلا جائے گا، انسانی قوتیں اور فطری صلاحیتیں ٹھٹھر جائیں گی، اس قیادت کے اثر سے لوگ صحراؤں اور غاروں کی زندگی کو شہری زندگی اور تجرد کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں، خود آزاری اور جسمانی تعذیب مستحسن ہو جاتی ہے تاکہ جسم کا تسلط کمزور پڑ جائے اور روح پاک و بے آمیز ہو جائے لوگ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں تاکہ مادیت کے پُرشور اور پُر تلاطم اقلیم سے نکل کر روحانیت کی پُرسکون اور پُر امن اقلیم میں پہونچ جائیں اور وہاں اپنی تکمیل کے مدارج حاصل کریں، اسلئے کہ ان کے عقیدہ میں اس عالم مادی میں انسان کی تکمیل ممکن نہیں، اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن پر عالم نزع طاری ہو جاتا ہے، شہر ویرانے بننے لگتے ہیں، اور زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے، چونکہ یہ اصول و عقائد فطرت انسانی سے برسرِ جنگ ہیں اس لئے فطرت ان کے خلاف رہ رہ کر بغاوت کرتی ہے اور اس کا انتقام ایسی حیوانی مادیت سے لیتی ہے جس میں روحانیت و اخلاق کے ساتھ کوئی رواداری نہیں برتی جاتی، اس انقلاب میں انسانیت کی جگہ ایک چوپایانہ زندگی یا درندگی یا مسخ شدہ انسانیت برسرِ ظہور ہو جاتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اٹھ جاتی

جماعت پر کوئی طاقت ور مادی جماعت حملہ آور ہوتی ہے اور پہلی جماعت اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو کر حملہ آور جماعت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے، یا ربانی جماعت خود امور دنیاوی کے انصرام میں مشکلات محسوس کر کے مادیت اور اہل مادیت کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور تمام سیاسی امور ان کو سپرد کر کے خود عبادات اور مذہبی رسوم پر قانع ہو جاتی ہے اور دین و سیاست کی تفریق وجود میں آتی ہے، روحانیت و اخلاق روز بروز بے اثر اور عملی زندگی سے بے دخل ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ انسانی سوسائٹی ان کی گرفت سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے، زندگی خالص مادہ پرستانہ بن کر رہ جاتی ہے اور دین واخلاق صرف ایک سایہ ہی سایہ بن کر یا ایک علمی نظریہ کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں، دنیا کی کمتر جماعتیں (جنھوں نے بنی نوع انسان کی قیادت و رہنمائی کی ہے) اس عیب سے خالی تھیں یا وہ مادہ پرست تھیں یا رہبانی اس لئے انسانی تمدن اپنے اکثر عہد میں حیوانی مادیت اور رہبانی روحانیت کے درمیان جھولا جھولتا رہا، اور انسانوں کی کشتی حیات دو انتہائی سروں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی، کبھی مادیت کا غلبہ ہو گیا اور کبھی روحانیت کا، اعتدال و جامعیت بہت کم اس کو نصیب ہوئی۔

صحابۂ کرام کا امتیاز

صحابۂ کرام کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دین و اخلاق اور قوت و سیاست کے مکمل پیکر تھے، اور انکی منتشر صفات ان میں بیک وقت جمع تھیں، ان میں انسانیت کی اپنے تمام

گوشوں، شعبوں اور محاسن کے ساتھ نمودار تھی اس اخلاقی اور اعلیٰ روحانی تربیت اس عجیب و غریب اعتدال (جو انسانوں میں کمتر دیکھنے میں آتا ہے) اس غیر معمولی جامعیت جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے اور پھر مکمل مادی تیاری اور وسیع عقل کی بنا پر اُن کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ انسانی گروہوں کو ان کے اعلیٰ روحانی و اخلاقی و مادی مقصد و کمال تک پہونچا سکیں؛ چنانچہ ہم کو تاریخ میں خلافت راشدہ کے دور سے زیادہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب دَور کا علم نہیں، اس دور میں روحانی و اخلاقی دینی و علمی اور روحانی وسائل و سامان انسان کامل اور صالح تمدن کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے، اس حکومت میں جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا اور ایسی سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی، اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظام حکومت کے لئے میزان کا درجہ رکھتی تھیں، تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے پورے عروج پر تھی فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی، چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل و اسباب اور ترغیبات کے باوجود جرائم و بداخلاقیوں کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے، فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز طریقہ پر بہتر تھا، یہ ایک معیاری دور تھا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب نہیں دیکھ سکا اور اس سے زیادہ مبارک و پُربہار زمانہ فرض نہیں کیا جا سکا۔

یہ نتیجہ تھا مخلص ان لوگوں کی سیرت کا جو حکومت کا کاروبار چلا رہے تھے اور تمدن کے نگراں تھے، اور ان کے عقیدہ، تربیت، طرزِ حکومت، اور اصول سیاست کا، اسلئے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہوتے دین واخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے، وہ حکام کی حیثیت میں ہوتے یا معمولی کارکنوں کی، پولیس کی حیثیت میں ہوتے یا فوج کی ہمیشہ محتاط و پاک دامن، دیانت دار امانت شعار، خدا ترس اور منکسر مزاج پائے جاتے۔

ایک رومی سردار مسلمان فوجوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "رات کو تم ان کو عبادت گزار پاؤگے اور دن کو روزہ دار، عہدو فا کرتے ہیں بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں"[1]۔

دوسرے کے الفاظ ہیں "وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گزار، اپنے مفتوحہ علاقہ میں بھی وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کرکے داخل ہوتے ہیں اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کردیتے ہیں"[2]۔

ایک تیسرے شخص نے ان الفاظ میں تعریف کی۔ "رات کو دیکھوگے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں، اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے کہ گویا یہی کام ہو۔

---

[1] روایت احمد بن مروان مالکی کتاب المجالسہ۔

[2] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) جلد ۷، ص۵۳

بڑے تیر انداز، اور بڑے نیزہ باز خدا کی یاد میں اس طرح مشغول و تر زباں کہ اُن کی مجلس میں کسی بات کا سُننا مشکل ہوتا ہے۔[1]

اسی اخلاقی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مدائن کی فتح میں کسریٰ کا مرصع تاج اور اس کا فرش بہا جو لاکھوں اشرفیوں کی مالیت کا تھا فوج کے ہاتھ لگتا ہے، لیکن کیا مجال کہ اس میں ذرا بھی تصرف کیا جائے، وہ قائد کے حوالہ کر دیتے ہیں، اور قائد حضرت عمرؓ کو بھیج دیتے ہیں وہ تعجب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس کو حوالہ کر دیا اور حفاظت کے ساتھ پہونچایا ان کی امانت واقعی قابل تعریف ہے۔[2]

دُنیا اور دُنیا کی زندگی کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر و طرز عمل

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرؤوں کی یہ پہلی جماعت ایسی ہی تھی کہ اسکے سایہ اور اسکی حکومت میں نوع انسانی کو پوری کامیابی و سعادت حاصل ہو اور اسکی قیادت میں اس کا جو قدم پڑے وہ صحیح پڑے، اور صحیح منزل کی طرف اُٹھے، دنیا کو ہر قسم کا اطمینان اور فارغ البالی ہر طرح کی سرسبزی و شادابی اور خیر و برکت حاصل ہو، انسانوں کی مصلحتوں کا ان سے زیادہ جاننے والا اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھنے والا، دنیا کے لئے ان سے بہتر نگراں و محافظ اور انسانوں کا ان سے بڑھکر خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا، وہ بعض اہلِ مذاہب کی طرح دُنیا کی زندگی کو لعنت

---

[1] البدایہ والنہایہ ج۷، ص۱۶ [2] سیرۃ عمر بن الخطاب ابن جوزی

کا طوق نہیں سمجھتے تھے اسی کے ساتھ وہ اس کو عیش و عشرت کی آخری فرصت و مہلت بھی نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی سمجھتے، اور اسکے لذائذ اور تنعم کو کسی دوسرے دن کے لئے نہ اٹھا رکھتے، اسی طرح سے وہ اس زندگی کو کسی سابق قدیم گناہ کی سزا بھی نہیں سمجھتے تھے جو ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے، نیز مادہ پرست اقوام کی طرح وہ دنیا کو خوان یغما بھی نہیں سمجھتے تھے جس پر وہ بھوکوں کی طرح گریں، اور زمین کی دولتوں اور خزانوں کو پڑا ہوا لاوارثی مال نہیں سمجھتے تھے جس کے لوٹنے کے لئے وہ ٹوٹ پڑیں، وہ کمزور قوموں کو شکار نہیں سمجھتے تھے جس کے شکار کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں، اُن کا اعتقاد تھا کہ یہ زندگی اللہ کی ایک نعمت ہے جس میں اللہ سے قرب حاصل کرنے اور اپنے کمال انسانی تک پہونچنے کا انکو موقع دیا گیا ہے اور عمل اور جد و جہد کی ایک مہلت ہے جس کے بعد اسکے لئے کوئی مہلت نہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ — جس نے مرنا اور جینا بنایا تاکہ تم کو جانچے کہ کون تم میں عمل میں بہتر ہے۔

(الملک - ۲)

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً لَّھَا لِنَبْلُوَھُمْ اَیُّھُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (الکہف - ۷) — ہم نے جو کچھ زمین پر ہے اسکو اسکی رونق بنایا ہے تاکہ لوگوں کو جانچیں کہ کون ان میں زیادہ اچھا کام کرتا ہے۔

وہ اس عالم کو اللہ کی مملکت سمجھتے تھے جس میں اللہ نے ان کو اول بحیثیت انسان کے اور پھر بحیثیت مسلمان کے اپنا نائب اور اہل زمین کا نگراں بنایا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرہ۔ ۳۰)	میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ۔ ۲۹)	وہی ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا۔
وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۔ (بنی اسرائیل ـ ۷۰)	ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور خشکی و تری دونوں میں اسکی سواری کا سامان کیا اور اچھی چیزیں اسکی روزی کے لئے مہیا کردیں اور جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں ان میں سے اکثر پر اسے پوری پوری برتری دے دی۔
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى	جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خلافت ضرور عطا کرے گا جیسے ان لوگوں کو عنایت کی تھی جو ان سے پہلے تھے

لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا۔

اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہو اسکو ان کے لئے جما کر رہے گا اور خوف جو اُن کو لاحق ہو اسکے بدلہ میں امن دیگا میری بندگی کرینگے، میرا کسی کو شریک کرینگے۔

(النور - ۵۵)

اُن کو اللہ نے زمین کی دولتوں سے بغیر اسراف و فضول خرچی کے فائدہ اُٹھانے کا حق بخشا۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ۔

کھاؤ پیو مگر حد سے نہ گزر جاؤ خدا انھیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گزر جانے والے ہیں۔

(اعراف - ۳۱)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو خدا کی زینتیں جو اُس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں، تم کہو یہ نعمتیں تو اسی لئے ہیں کہ ایمان والوں کے کام آئیں دُنیا کی زندگی میں، قیامت میں خالص ہوکر۔

(الاعراف - ۳۲)

ان کو دنیا کی قوموں اور انسانی گروہوں پر نگراں اور اتالیق مقرر کیا ہے اور وہ ان پر مامور ہیں کہ وہ ان کی رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں جو راہِ راست سے منحرف ہو جائے اُس کو صراطِ مستقیم پر لائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں، کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۔

تم سب امتوں سے بہتر ہو جو بھیجی گئی عالم میں اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

(آل عمران - ۱۱۰)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ ۔

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو، اللہ کی طرف سے گواہ بنو۔

(النساء - ۱۳۵)

ایک یوروپین نو مسلم عالم نے مسلمانوں کے اس امتیاز کو اور دنیا کی زندگی کے بارہ میں اس معتدل نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اس کا اقتباس نامناسب نہ ہوگا۔

"اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بری رائے نہیں رکھتا، وہ کی

تعلیم ہے کہ ہم دُنیاوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں، عیسائیت دُنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے، موجودہ یورپ رُوح عیسویت کے خلاف زندگی پر ایسا گرتا ہے جیسے بوالہوس کھانے پر وہ اسکو نگلتا تو ہے لیکن اسکی عزت کرنا نہیں جانتا، اسلام ان دونوں کے برعکس زندگی کو سکون واحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ زندگی کی پرستش نہیں کرتا بلکہ ایک بلند تر زندگی کے سفر کی ایک ضروری منزل سمجھتا ہو جس سے گزرجانا ہے، اس بنا پر انسان کو اسکی تحقیر اور اپنی اس دنیاوی زندگی کی بے وقعتی نہیں کرنی چاہئے، زندگی کے سفر میں ہمارا اس دنیا سے گزرنا ضروری اور اللہ کے یہاں مقدر ہو چکا ہے، پس انسان کی زندگی اپنی پوری قیمت رکھتی ہے، لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ محض ایک واسطہ اور آلہ ہے اور اسکی قیمت اس سے زائد نہیں جو واسطوں اور آلات کی ہوتی ہے، اسلام اس مادہ پرستانہ نظریہ کا روادار نہیں جس کا قول ہے کہ میری سلطنت یہی دنیا ہو اور نہ وہ عیسائیت سے متفق ہے جو زندگی کی تحقیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ دنیا میری سلطنت نہیں، اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے، قرآن ہم کو اس جامع دُعا کی تعلیم دیتا ہے "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (اے اللہ ہم کو دُنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی) اس دُنیا اور اسکی چیزوں کی قدر شناسی ہماری روحانی جدّوجہد

کے راستہ میں سنگ گراں نہیں، مادی ترقی اور خوش حالی نہ مقصود بالذات ہے اور نہ ناپسندیدہ شئ، ہماری ساری کوششوں اور جد وجہد کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ایسے انفرادی و اجتماعی حالات و اسباب پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے، اور اگر موجود ہے تو ہم اسکو باقی رکھیں جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں مددگار ہو، اس اصول کے مطابق اسلام مسلمان میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقع پر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، اسلام کا مذہبی نظام انجیل کی اس تقسیم کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو دو، اس لئے کہ اسلام ہماری زندگی کی ضروریات کو اخلاقی اور دنیاوی قسموں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں، اسکے نزدیک انتخاب کا ایک ہی حق ہے اور وہ یہ کہ انسان یا تو حق کو اختیار کرلے یا باطل کو، اس کے نزدیک کوئی درمیانی چیز نہیں، اس لئے وہ عمل پر زور دیتا ہے کہ وہ اخلاق کا ایک لازمی جزو ہے، اسلامی تعلیمات کی رو سے ہر فرد مسلم کو اپنے آپ کو ماحول اور اسکے گرد وپیش کے واقعات کا شخصی طور پر جوابدہ سمجھنا چاہیئے، اور اپنے تئیں دینی جد وجہد کے لئے مامور اور ہر وقت اور ہر سمت میں حق کے قیام اور باطل کے زوال کا ذمہ دار تصور کرنا چاہیئے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور

وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ   برائی سے روکتے ہو اور اللہ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط (آل عمران ۔۱۱۰) پر ایمان لاتے ہو۔

یہی بات اسلام کی جارحانہ کارروائی، ابتدائی اسلامی فتوحات اور اسلامی ملوکیت کو اخلاقی طور پر حق بجانب ثابت کرتی ہے، پس اسلام استعماری (Imperialist) ہے اگر یہ مفہوم انھیں الفاظ سے ادا ہو سکتا ہے، لیکن استعمار imperialism کی اس قسم کی محرک حکومت اور غلبہ کی محبت بالکل نہیں اور نہ اقتصادی اور خودغرضی کو اس میں کچھ دخل ہے، مجاہدین اوّلین کو جو چیز میدان جنگ میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ لے جاتی تھی وہ دوسروں کی دولت ومحنت کے ذریعہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کی لالچ نہ تھی اس کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسا دُنیاوی ڈھانچہ بنا دیا جائے جس میں انسان کے لئے بہتر سے بہتر روحانی ترقی ممکن ہو، اسلامی تعلیمات کی رو سے اخلاق وفضیلت کا علم انسان سے اخلاقی ذمہ داری کا مطالبہ کرتا ہے یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ انسان فطری طور پر حق و باطل میں امتیاز کرلے، پھر حق کی ترقی اور باطل کے زوال کے لئے جد وجہد نہ کرے، اسلام کی رو سے اگر انسان حق اور نیکی کے غلبہ اور حکومت کے لئے سعی وجانفشانی کرتا ہے تو وہ زندہ رہتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے اور اگر اسکی مدد اور تقویت میں دریغ کرتا ہے اور اسکی حمایت ونصرت

سے دست کشی کرتا ہے تو اس کو زوال ہو جائے گا اور وہ بالکل مغلوب ہو جائے گی۔[1]

اسلامی اقتدار اور اسلامی تمدن کے اثرات و نتائج

پہلی صدی ہجری میں اسلامی تمدن کا اپنی پوری روح اور نظام کے ساتھ ظہور، اور اسلامی حکومت کا اپنی صحیح شکل و نظام کے ساتھ قیام مذاہب و اخلاق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز اور سیاست و اجتماع کی دنیا میں ایک بالکل نیا واقعہ تھا، اس انقلاب نے تمدن کے دھارے کا رخ اور دنیا کے سفر کی سمت بدل گئی، اسلام کی یہ عظیم الشان فتح جاہلیت کے لئے ایک ایسی آزمائش اور خطرہ تھا جس سے اس کو اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، ابھی تک اس کے حریف (اسلام) کی حیثیت ایک دینی اور روحانی دعوت سے زیادہ نہ تھی، اب دفعتہ وہ سب کچھ ہو جاتا ہے، سعادت و نجات کا پورا نظام، روحانیت و مادیت کا مکمل مجموعہ، زندگی اور قوت کا پورا مظہر، ایک مکمل تمدن اور اجتماع، ایک طاقتور حکومت، ایک کامل نظام سیاسی۔

اب ایک طرف ایک ایسا معقول سہل الفہم اور ممکن العمل دین تھا

---

[1] Islam at the Cross Roads By Mohammad Asad (Formerly Leopold Weiss)

جو سراسر حکمت و معقولیت تھا، دوسری طرف محض اوہام و خرافات اور قصہ کہانیاں ایک طرف الٰہی شریعت اور آسمانی وحی تھی اسکے مقابلہ میں محض قیاسات اور انسانی تجربہ اور انسانوں کا بنایا ہوا قانون۔

ایک طرف ایسا بلند و برتر تمدن تھا جس کی بنیاد غیر متزلزل اور جس کے اُصول غیر متبدل خوف خدا احتیاط و امانت کی رُوح اسکے پورے نظام میں جاری و ساری تھی، اسکے حلقہ میں دولت و عزت کے مقابلہ میں اخلاق و پارسائی اور کھوکھلے مظاہر کے مقابلہ میں رُوح اور اصلیت کی عزت و قیمت زیادہ تھی، لوگوں میں مساوات تھی اور اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل تھی تو محض تقویٰ کی بنا پر، لوگوں کی بڑی توجہ اور اصل کوشش آخرت کے لئے تھی، اس لئے طبیعتوں میں اطمینان اور دلوں میں قناعت تھی، زندگی کے سامان و اسباب میں کوئی حرص و مسابقت اور دُنیا کی دولت پر پروانہ دار وارفتگی نہیں تھی، اسکے مقابلہ میں جاہلی تمدن تھا، پُر شور اور پُر تلاطم، متزلزل اور مضطرب، بڑا چھوٹے پر ظلم کرتا تھا، طاقتور کمزور کو کھائے ڈالتا تھا، لہو ولعب اور بداخلاقی میں مسابقت اور جاہ و دولت اور سامان عیش و راحت کے حصول میں سخت مقابلہ تھا، یہانتک کہ دنیا ایک میدانِ جنگ اور زندگی عذاب جان بنکر رہ گئی تھی

ایک طرف عادل اسلامی حکومت تھی جو اپنی رعیت کو ایک نظر سے دیکھتی تھی کمزور کو طاقتور سے اُس کا حق دلاتی تھی، لوگوں کے گھروں اور جان و مال کی طرح ان کے اخلاق کی نگرانی و حفاظت بھی اپنا فرض

سمجھتی تھی، ان میں سب سے بہتر ان کے حکام تھے، اور سب سے زاہدانہ زندگی اُن لوگوں کی تھی جن کو سب سے زیادہ عیش و راحت کا سامان اور اسکے مواقع حاصل تھے، اسکے مقابلہ میں جاہلی حکومتیں تھیں جہاں ظلم و ستم رانی کا بازار گرم تھا، جس کے کارکنانِ حکومت نے خیانت و ظلم پر گویا کمر باندھ رکھی تھی، جس کے افراد لوگوں کا مال ناحق کھانے اور ان کی لے آبروئی و خونریزی میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتے تھے اور اپنے عمل کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کے اخلاق خراب کرتے تھے، ان میں سب سے بڑے حکام اور بادشاہ تھے، اُن کی حکومت میں انسان بھوکوں مرتے اور ان کے جانور اور کتے شکم سیر ہوتے، ان کے محل زرنگار پردوں میں ملبوس ہوتے اور لوگوں کو تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نصیب نہ ہوتا۔

اب لوگوں کو اسلام میں کوئی رکاوٹ اور اسکے قبول کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی اور جاہلیت میں کوئی وجہ ترجیح نظر نہیں آتی تھی آدمی کو اسلام قبول کرنے پر کچھ کھونا نہیں پڑتا تھا اور سب کچھ حاصل ہو جاتا تھا، اس کو یقین کی ٹھنڈک، ایمان کی شیرینی، اسلام کی قوت ایک طاقتور حکومت کی سرپرستی اور ایسے دوستوں اور مددگاروں کی حمایت حاصل ہو جاتی تھی جو اس پر اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اطمینان قلب اور موت کے بعد کی زندگی کے بارہ میں اعتماد و سکون حاصل ہوتا تھا، لوگ آسانی کے ساتھ جاہلیت کے محاذ سے اسلام کے محاذ کی طرف منتقل ہونے لگے جاہلیت کے علاقہ میں اسلام پھیلنے لگا اور اسلام کو طاقت اور اقتدار حاصل

چھوٹا گیا، یہاں تک کہ کمزور طبیعتوں کے لئے بھی کفر و اسلام کے بارہ میں کوئی کشمکش باقی نہیں رہی، اور خالص اللہ کی فرماں برداری آسان ہوگئی۔

اس انقلاب کا اثر بہت دیکھا اور گہرا تھا، خدا پرستی کی راہ جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں دشوار اور خطرات سے بھری ہوئی تھی اب بہت سہل اور محفوظ ہوگئی، جاہلیت کے حلقہ اور ماحول میں خدا کی اطاعت مشکل تھی، اب اسلامی ماحول میں خدا کی نافرمانی مشکل ہوگئی، کل تک برسر بازار اور ڈنکے کی چوٹ پر فسق و فجور اور جہنم کی طرف دعوت دی جاتی تھی، اب ایسا کرنا بہت مشکل تھا، کل تک خدا کی ناراضی اور اسکی نافرمانی کے اسباب و مواقع بکثرت اور بالاعلان تھے اب ان پر بڑی پابندیاں اور ان کے لئے بڑی رکاوٹیں تھیں، کل تک اللہ ہی کی زمین میں اللہ کی طرف دعوت دینا ایک جرم تھا جس کے لئے بڑی احتیاط اور رازداری کی ضرورت تھی، اب وہ ایک ایسا کار خیر تھا جس کے لئے کسی رازداری اور پردہ کی ضرورت تھی، نہ دعوت دینے والوں کو کوئی خطرہ تھا اور نہ قبول کرنے والوں کو، قرآن مجید نے اس فرق کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ	اور وہ وقت یاد کرو جب تمہاری
مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ	تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم
تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ	ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے تم
النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ	اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ
بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ	تم کو اچک نہ لے جائیں پھر اللہ

الطَّیِّبَاتِ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝ (الانفال ۲۶)

نے تمہیں ٹھکانا دیا اپنی مددگاری سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا تاکہ تم شکر گزار ہو۔

اس اقتدار و طاقت کی وجہ سے مسلمان لفظی و لغوی معنیٰ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے لگے اور حکم و ممانعت کی قوت اُن کو حاصل ہو گئی۔

جس طرح موسم بہار میں نباتات اور انسانوں کے مزاج موسم سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح محسوس اور غیر محسوس طریقہ پر اسلامی اقتدار و تمدن کے زمانہ میں لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں متغیر اور اسلام سے متاثر ہونے لگیں، دلوں میں گداز و نرمی پیدا ہونے لگی اسلام کے اُصول و حقائق دل و دماغ میں پیوست ہونے لگے، اشیاء کی قدر و قیمت کے بارہ میں لوگوں کا نقطۂ نظر بدلنے لگا، کل تک جن چیزوں اور جن صفات کی لوگوں کی نگاہ میں بڑی وقعت و اہمیت تھی اب وہ جاتی رہی اور جو چیزیں بے وقعت تھیں اب وہ وقیع بن گئیں پرانے معیاروں کی جگہ نئے معیاروں نے لی، جاہلیت، رجعت پسندی اور جمود کی علامت بن گئی اور اس کے متبعین میں احساس کمتری پیدا ہو گیا اسلام کی طرف انتساب اس کے شعائر اور خصوصیات کو اختیار کرنا ایک فخر اور تعریف کی چیز بن گئی، دنیا اسلام سے آہستہ آہستہ قریب ہو رہی تھی جس طرح اس کرۂ ارضی کے رہنے والوں کو آفتاب کے گرد گردش کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح ان

قوموں کو اور ان کے افراد کو اپنے اسلامی رجحانات اور اسلام کے اندرونی اثرات کا احساس نہیں ہوتا تھا، ان اثرات سے نہ علم و فلسفہ خالی تھا نہ مذاہب و تمدن، لوگوں کے ضمیر اور اُن کے باطن ان اثرات کی شہادت دیتے تھے اور ان کے اصلاحی میلانات اسکی غمازی کرتے تھے، مسلمانوں کے تنزل کے بعد بھی جو اصلاحی تحریکات ان قوموں میں پیدا ہوئیں وہ اسلامی اثرات اور اسلامی خیالات کا نتیجہ ہیں۔

اسلام نے توحید کی دعوت پیش کی اور بت پرستی اور شرک کی ایسی مذمت اور ہجو کی کہ بت پرستی اور شرک ہمیشہ کے لئے بے وقعت اور ذلیل ہو گیا، لوگوں کو اس سے شرم آنے لگی اور اس سے وہ اپنے کو بری ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے، یا تو وہ بڑی جرأت اور صفائی کے ساتھ اس کا اقرار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهًا	کیا سب معبودوں کو (بدل کر)
وَّاحِدًا ۖ إِنَّ هٰذَا	ایک ہی معبود قرار دیدیا
لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۔ (ص-۵)	یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہو۔

یا اب اپنے مذہب کے مشرکانہ اجزاء و اعمال کی تاویل و توجیہ اور اسکی تشریح کی ایسی کوشش کرنے لگے کہ وہ توحید سے ملتی جلتی چیز نظر آئے، عیسائیوں میں ایسے گروہ پیدا ہوئے جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا انکار اور عقیدۂ تثلیث کی توحید نما تشریح کرتے تھے، ان میں ایسے مصلح بھی پیدا ہوئے جو عیسائیوں کے مذہبی گروہ اور اہل کلیسا کے اللہ اور بندہ کے درمیان وساطت کے

منکر تھے ان پر سخت تنقید یں کرتے تھے اور اُن کے مخصوص حقوق کو نہیں مانتے تھے، آٹھویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک ایسا گروہ ظاہر ہوا جو پادریوں کے سامنے اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کی مخالفت کرتا تھا اور جس کی دعوت تھی کہ صرف اللہ کے سامنے دعا و استغفار اور اپنے سابقہ گناہوں کا اعتراف و اقرار کرنا چاہیئے اور اس میں کسی انسانی وساطت کی ضرورت نہیں ہے[1]

اسی طرح آٹھویں صدی عیسوی سے نویں صدی تک یورپ میں اس تحریک کا بڑا دور رہا ہے کہ تصاویر اور بُت ایک خلاف مذہب فعل ہے اور ان میں کوئی تقدیس نہیں، اس تحریک نے اتنا زور پکڑا اور اتنا اثر و اقتدار حاصل کرلیا کہ لیو سوم، قسطنطین پنجم اور لیو چہارم جیسے عظیم الشان شاہانِ روما نے اسکی حمایت اور پشت پناہی کی، اوّل الذکر نے ۷۲۶ء میں ایک فرمان صادر کیا جس میں سرکاری طور پر تصویروں اور بتوں کی تقدیس کی ممانعت کی گئی تھی، ۷۳۰ء میں دوسرے فرمان میں اسکو اس نے بُت پرستی قرار دیا تھا، مسیحی اور بُت پرست یورپ اور رومی یونانی تمدن (جس کی تصویر تو ادی اور بُت تراشی شہرۂ آفاق ہے) میں تصویروں اور بتوں کے خلاف یہ انکار و جہاد یقیناً اسلام کی بُت شکنی اور اعلان توحید کی صدائے بازگشت تھی جو مغرب میں اسلامی اندلس اور اسلامی تبلیغ و اثرات کے ماتحت پہونچی، اس بات کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خدا بخش

تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلوڈیس (CLaDIUS) جو تورین کا ٹ
پادری اور اس تحریک دعوت کا بڑا پرجوش علم بردار تھا (یہاں تک کہ وہ اپنے
حلقۂ اثر میں تصویروں اور صلیبوں کو جلادیا کرتا تھا) اسکے متعلق تاریخی طور پر
معلوم ہے کہ اسکی ولادت اور نشو ونما اندلس میں ہوئی ہے اور یہ دوسری صدی
ہجری کا زمانہ ہے جبکہ وہاں مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کا تمدن اپنے عروج پر تھا۔[۱]

یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ
کیا جائے تو اسلام کے ذہنی اثرات کے اور بہت سے نمونے اور نظیریں ملیں گی،
خود لوتھر کی مشہور اصلاحی تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی
اور مورخین کو اس کا اعتراف ہو کہ اسکے بانی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات پڑے
تھے اور صرف مذہب ہی نہیں بلکہ یورپ کی پوری زندگی اور اس کا تمدن اسلام
سے متاثر ہوا ہے، رابرٹ بریفالٹ (Robert Brifiault) اپنی کتاب
(THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے:-

"یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہی جس میں اسلامی
تمدن کا دخل نہ ہو، اور اسکی ایسی نمایاں یادگاریں نہ ہوں جنہوں نے
زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"صرف طبیعی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان مسلم ہے) یورپ میں

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے ضحی الاسلام ج ۱ ص ۱۶۴-۱۶۵ بحوالۂ صلاح الدین خدابخش۔
[۲] ص ۱۹۰

زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں، اور اس کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئی ہیں؟[۱]

اسی طرح ہندوستان کی قوموں کے اخلاق و معاشرت اور قانون سازی میں اسلامی ذہنیت اور اسلامی شریعت کے اثرات نظر آئیں گے، عورت کا احترام اور اس کے حقوق کا اعتراف مختلف انسانی گروہوں کے درمیان مساوات کا اصول اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کے اختلاط کے بعد سے روز بروز زیادہ تسلیم کیا جانے لگا، غرض کسی تمدن اور آباد دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن بعثت محمدی اور ظہور اسلام کے بعد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔

اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب کے دور انحطاط میں بھی اسلام کی سابقہ دعوت اور قوت کے آثار اور یادگاریں باقی تھیں، انھیں میں سے ایک "خدا شناسی" تھی جو پوری اسلامی دنیا میں عام تھی، خدا کا خیال مسلمان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اُتار دیا گیا تھا کہ وہ ہر قسم کے انقلابات و تغیرات اور دینی تنزل میں کبھی نہیں نکل سکا، مسلمان کے لئے فسق و فجور ممکن تھا (اور مسلمانوں کے دور تنزل میں اس کا اچھی طرح ظہور ہوا) مگر خدا کا خیال دل و دماغ سے

---

[۱] ص ۲۰۲

دور نہیں ہوسکا، نفسِ لوّامہ کی ملامت، ضمیر کی سرزنش، خدا کی موجودگی کا خیال
اور آخرت کا کھٹکا بدمستی اور خود فراموشی کے عالم میں بھی دل میں چٹکیاں لیتا تھا
اور کبھی کبھی اپنا کام کرجاتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ فساق و فجار بعض اوقات
دفعۃً فسق و فجور سے توبہ کرکے صالحین و متقین کے گروہ میں شامل ہوجاتے،
رندانِ خرابات ایک ٹھوکر سے ہوشیار ہوکر کعبہ کی راہ لیتے، بڑے بڑے شاہزادے
اور نازپروردہ امیرزادے ایک معمولی سی غیبی تنبیہ سے (جس سے ہزار درجہ زیادہ
تنبیہیں مادیت و کفر کے دور میں بے اثر ثابت ہوتی ہیں) تخت و تاج چھوڑ کر
فقر و درویشی اور صلاح و تقوےٰ کی زندگی اختیار کرلیتے تھے، بعض مرتبہ قاری نے
قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا
أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ
اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ
وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ
أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ
فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ
فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ
مِنْهُمْ فَاسِقُونَ۔

(الحدید، ع ۲)

کیا ایمان والوں کے لئے اس بات
کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا
کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل
ہوا ہو اس کے سامنے جھک جائیں
اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں
جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی پھر
اسی حالت میں ان پر ایک زمانہ
دراز گزر گیا پھر ان کے دل سخت
ہوگئے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ
بہت سے آدمی ان میں کے آج کافر ہیں۔

بعض لوگ ایسے معلوم ہوئے کہ سونے سے چونک گئے اور اُن کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے انقلاب ہوگیا۔ تاریخ ان مثالوں سے لبریز ہے۔

بغداد کے انتہائی تعیش اور غفلت کے دور میں صاحب تاثیر واعظوں اور صاحب دل ناصحوں کی مجلس شکل سے ایسے واقعات سے خالی ہوتی تھی۔

مشہور عرب سیاح ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) جس نے ۵۸۰ھ میں بغداد دیکھا ہے شیخ رضی الدین قزوینی کی مجلس وعظ کا حال بیان کرتا ہے کہ "اثنار وعظ میں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں جاری تھیں، لوگ پروانوں اور متوالوں کی طرح توبہ کے لئے اُن کے ہاتھ پر گر رہے تھے اور اپنے بال کاٹ رہے تھے:"

حافظ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۹۷ھ) کی مجلس وعظ میں تو یہ حال تھا کہ لوگ چیخ مار مار کر روتے تھے۔ لوگوں پر غشی طاری ہوجاتی تھی اور بیہوش ہو ہوکر گرتے تھے اور لوگ ہاتھوں میں اٹھا کر لے جاتے تھے، اپنی پیشانی کے بال ان کے ہاتھ میں دیتے تھے اور وہ سر پر ہاتھ پھیرتے تھے۔[1]

حافظ ابن جوزیؒ نے خود ایک موقع پر تخمینہ لکھا ہے کہ ایک "لاکھ انسانوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی ہے۔[2] پانچویں صدی کے ایک محدث شیخ اسمٰعیل لاہوری کے متعلق مورخ کے الفاظ ہیں "ہزار ہا مردم در مجلس وعظ وے مشرف باسلام شدند"[3] ابن بطوطہ نے متعدد ہندوستانی واعظین کی تاثیر کے ایسے ہی

---

[1] رحلۂ ابن جبیر ص۲۰۲ [2] صید الخاطر، نفقۃ الکبد [3] تذکرہ علماء

واقعات لکھے ہیں۔

کفر اور بے دینی کے تسلط اور غلبہ کے زمانہ میں اثر پذیری کی ایسی مثالیں عنقا ہوتی ہیں، اس دور میں موثر سے موثر دینی خطابت اور اخلاقی نصائح بے اثر ہوتے ہیں۔

خدا کا خیال اس وقت کی زندگی میں داخل تھا جس سے کسی قوم یا مذہب یا فرقہ و خیال کا آدمی خالی نہ تھا، زبان و ادب میں خدا شناس طرز ادا، مذہبی تعبیرات اور وحی و رسالت کی زبان کے الفاظ و اصطلاحات روح و خون کی طرح جاری و ساری تھے کہ اس زبان و ادب کو اس سے معرّا نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلامی تعبیرات، دینی آداب اور جملے غیر مسلموں کی زبان پر اس طرح جاری ہو گئے تھے اور وہ ان کے اس درجہ خوگر ہو گئے تھے کہ دوسرے ہم معنی جملوں سے اُن کی تشفی نہیں ہوتی تھی، غیر مسلم ادیب اور فاضل قرآن مجید حفظ کرتے تھے، مشہور غیر مسلم ادیب ابو اسحٰق صابی کے متعلق منقول ہے کہ وہ رمضان مبارک کے روزے بھی رکھتا تھا۔

خدا طلبی کا ذوق ساری اسلامی دنیا میں عام تھا، ہزاروں لاکھوں اشخاص اسلامی ملکوں اور شہروں میں دین کی طلب اور مردانِ خدا کی تلاش میں صحراؤں پہاڑوں اور وادیوں کو عبور کر کے دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہنچتے تھے۔ خدا کی طرف بلانے والوں کی ذات مرجع خلائق اور ان کے مقامات طالبین خدا کے ہجوم سے معمور رہتے تھے، اور ان کی آبادی اور رونق حکومت کے مرکزوں اور اہل حکومت کے دفاتر سے کہیں بڑھ کر تھی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی مجلس خلفاء عباسیہ کے دربار سے زیادہ پُر ہیبت اور بارونق تھی۔ امراء و اغنیاء بھی دین کے خیال و خدا طلبی سے خالی نہ تھے۔ سوانح و تراجم کی کتابیں ایسی مثالوں سے پُر ہیں۔

باب چہارم

مسلمانوں کا تنزّل

مسلمانوں کے تنزل کا آغاز اور اسکے اسباب

ایک ادیب نے خوب کہا ہے کہ انسانی زندگی میں دو ایسے واقعات ہیں جن کا بالکل ٹھیک وقت ہم نہیں بتا سکتے، ان میں سے ایک جس کا تعلق فردی زندگی سے ہے نیند آنا ہے، کوئی شخص آج تک اس خاص لمحہ کا تعین نہیں کر سکا، جب جاگنے والا سو جاتا ہے، دوسرا واقعہ جس کا تعلق قومی زندگی سے ہے تنزل یا زوال ہے، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں قوم کا زوال کس تاریخ سے شروع ہوا سب کو اس کی خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ زور پکڑ جاتا ہے۔

یہ حقیقت اکثر قوموں کے بارہ میں متحقق ہے لیکن امت اسلامیہ کی زندگی میں زوال و تنزل کا آغاز دوسری قوموں کی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور روشن ہے۔

اگر ہم کمال وزوال کے درمیان کی حد کو متعین کرنا چاہیں تو ہم اپنی انگلی اس تاریخی خط پر رکھ دینگے جو خلافت راشدہ اور ملوکیت عرب یا مسلمانوں کی بادشاہی کے درمیان حد فاصل ہے۔

بات یہ تھی کہ براہ راست اسلامی قیادت اور بالواسطہ دنیا کی رہنمائی کی زمام اُن لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن کا ہر فرد اپنے ایمان وعقیدہ، اعمال و اخلاق، تربیت وتہذیب، نفس کی آراستگی، سیرت کی بلندی اور کمال و اعتدال میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک مستقل معجزہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کے قالب میں ایسا ڈھال دیا تھا کہ ان میں جسم کے علاوہ کسی چیز میں بھی اپنے ماضی سے مماثلت باقی نہیں تھی، نہ میلانات ورجحانات میں، نہ ذہنیت وطرز فکر میں، نہ خواہشات میں، یہ حضرات جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے دین و دنیا کی جامعیت کا نمونۂ کامل تھے، وہ بیک وقت نمازوں کے امام، مسجدوں کے خطیب، قاضی اور مفتی، بیت المال کے امین اور خازن اور لشکروں کے سپہ سالار تھے، اور ایک وقت میں امور جنگ کا انصرام ملکوں اور شہروں کا انتظام اور سلطنت کے مختلف صیغوں اور شعبوں کی نگرانی کرتے تھے، ان میں سے ایک ایک شخص ایک ہی وقت میں متقی و زاہد سپاہی اور مجاہد، معاملہ فہم قاضی، مجتہد فقیہ، صاحب تدبر حاکم اور تجربہ کار سیاسی تھا، اس لئے ایک ہی ذات میں (اور وہ خلیفہ و امیر المومنین کی ذات ہوتی تھی) دین و سیاست کا اجتماع تھا، اس کے گرد اُن لوگوں کی جماعت تھی جو اسی مدرسہ نبویؐ یا مسجد نبویؐ کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھے، ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ایک ہی روح کے حامل

اور ایک ہی سیرت سے متصف تھے، خلیفہ ان سے مشورہ لیتے اور کوئی اہم کام ان کے مشورہ اور مدد کے بغیر نہ کرتے، پس اُن کی روح تمدن کے پورے ڈھانچہ حکومت کے پورے نظام اور لوگوں کی پوری زندگی و معاشرہ و اخلاق میں جاری و ساری ہو گئی، ان کے میلانات اور خواہشات کا تمدن پر عکس اور ان کی خصوصیات کا پورا پرتو پڑا، وہاں نہ روحانیت اور مادیت میں کوئی کشمکش تھی، نہ دین و سیاست میں کوئی تصادم، نہ دین و دنیا کی تفریق تھی نہ مصلحت و اصول میں کوئی رسہ کشی، نہ اغراض و اخلاق کے درمیان کوئی مزاحمت تھی، نہ طبقوں اور گروہوں کی باہمی جنگ، اور خواہشات نفسانی میں باہمی مسابقت و تقابل غرض ان کا تمدن اور اسلامی سلطنت کی زندگی اس کے بانیوں کے اخلاق و خصوصیات اور اعتدال و جامعیت کی پوری آئینہ دار تھی۔

جہاد و اجتہاد کا فقدان اصل یہ ہے کہ اسلام کی امامت[1] بڑی نادر کا اور وسیع صفات کو چاہتی ہے جو فرد یا جماعت اس منصب پر فائز ہو اس کے لئے ذاتی صلاح و تقویٰ اور عدل کے علاوہ جہاد و اجتہاد کی قابلیت کی بھی ضرورت ہے، یہ دو لفظ بہت سادہ اور ہلکے ہیں لیکن معانی و مطالب سے لبریز ہیں، جہاد سے مراد ہے عزیز ترین اور اہم ترین مطلوب کے حصول کے لئے اپنی انتہائی طاقت اور وسائل صرف کر دینا، مسلمان کا سب سے بڑا مقصود اللہ کی

---

[1] یہاں اس سے مراد امامت (امارت) نہیں ہے جس کی تعریف و شرائط کتب فقہ و اصول میں ہیں بلکہ وہ قوت و قابلیت ہے جس سے کوئی مسلمان فرد یا جماعت دنیا کی رہنمائی و پیشوائی کر سکے

فرماں برداری اسکی خوشنودی کا حصول اور اسکی بادشاہی ....
اور احکام کے سامنے سپردگی اور سرافگندگی ہے، اسکے لئے ایک طویل جہاد کی ضرورت ہے، ہر اس عقیدہ، تربیت، اخلاق، اغراض اور خواہشات کے خلاف جو اس میں مزاحم ہوں اور ان تمام نفسی و آفاقی (داخلی و خارجی) آلہہ و معبودان باطل کے خلاف جو اللہ کی فرماں برداری اور اخلاص میں حریف اور رقیب ہوں جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی بادشاہی اور اسکے احکام کو اپنے گرد و پیش کی دنیا اور اپنے بنی نوع پر پھیلانے کے لئے جدوجہد کرے یہ اس کا دینی فریضہ ہے اور خلق خدا پر شفقت اور مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کا بھی یہ عین مقتضا ہے، اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات انفرادی اطاعت اور دین داری بھی ماحول کی سازگاری کے بغیر مشکل ہو جاتی ہے، اسی کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں "فتنہ" ہے، دنیا میں جتنے بھی جمادات نباتات وحیوانات اور انسان ہیں وہ اللہ کی تکوینی مشیت واحکام اور اسکے طبعی قوانین کے سامنے سرافگندہ ہیں۔

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۔

(آل عمران، رکوع ۹)

اور اُسی کے حکم میں ہو جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے اور اس کی طرف سب پھر کر جائیں گے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کوئی بھی آسمانوں میں اور جو کوئی بھی

الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۔ (الحج، ۱۸)

زمین میں ہو نیز سورج چاند تارے پہاڑ، درخت چار پائے سب اللہ کے آگے سر بسجود ہیں اور کتنے ہی انسان بھی اور آدمیوں میں بہت سے ایسے بھی جن پر عذاب لازم ہو گیا۔

اس میں انسان کی نہ کسی کوشش کو دخل ہے اور نہ اس کے لئے کسی جد وجہد کی ضرورت، موجودات کے لئے موت وحیات، نشو ونما کا جو قانون ہے اور ان کے جسم وفطرت کے لئے اللہ نے جو نظام مقرر کر دیا ہے اس پر وہ سب بے چون وچرا عمل کر رہے ہیں اور چلتے رہیں گے اور اس سے سر مو انحراف نہیں ہوگا، جس مقصد کے لئے مسلمان کی جد وجہد مطلوب ہے، وہ خدا کے اس قانون کا نفاذ ہے جو انبیاء لے کر آئے اور جس کے غلبہ اور قیام کے لئے ان کے پیرو مامور ہیں جس کی مخالف طاقتیں اور دعوتیں دنیا میں ہمیشہ رہیں گی، یہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اس کی بکثرت قسمیں اور صورتیں ہیں جن میں سے ایک جنگ بھی ہے جو بعض اوقات اس کی سب سے افضل قسم ہو جاتی ہے اسکی غایت یہ ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں کوئی برابر کی حریف طاقت باقی نہ رہے جو خواہشات اور طبیعتوں کو مخالف سمت کی طرف کھینچا اور بہت سے انسانوں کیلئے کفر واسلام کے درمیان کشمکش پیش آئے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔ (البقرہ، ۱۹۳)

اور اہل کفر سے یہاں تک جنگ کرو کہ کفر کا زور باقی نہ رہے اور اطاعت اللہ ہی کی ہو۔

اس جہاد کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے اور کفر و جاہلیت کے بارہ میں بھی جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس کو گہری واقفیت ہو تا کہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کو پہچان لے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشو ونما پایا اور جاہلیت کو وہ نہیں پہچانتا، یقیناً ہر مسلمان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کفر و جاہلیت سے گہری اور تفصیلی واقفیت رکھتا ہو اور اس کے مظاہر، اور صورتوں اور رنگوں کو پہچانتا ہو لیکن بلاشبہ اسلام کی رہنمائی اور کفر و جاہلیت کے خلاف اسلامی لشکر کی قیادت کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عام اور متوسط مسلمانوں سے زیادہ کفر و جاہلیت کو پہچانتا ہو۔

اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ اس منصب پر فائز ہوں اُن کی تیاری پوری اور اُن کی قوت مکمل ہو اُن کے پاس لوہے کو کاٹنے کے لئے لوہا بلکہ فولاد ہو، وہ کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو اُن کی دسترس میں ہو جس کا انسان اکتشاف کر سکا ہو اور جہاں تک انسان کے علم کی رسائی ہو، اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم	مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں
مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ	ہو قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ	رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے
وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن	اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ

دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

(الانفال، ۶۰)

اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے، نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمھیں خبر نہیں اللہ انھیں جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا پورا مل جائے گا، ایسا نہ ہوگا کہ تمھاری حق تلفی ہو۔

اجتہاد سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیادت و امامت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو نئے پیش آنے والے مسائل زندگی میں انفراداً یا اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتے ہوں اور روح اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے اتنی واقفیت اور مسائل کے استنباط کی قوت رکھتے ہوں جس سے وہ امت کی مشکلات کو حل کر سکیں اور اشتباہ اور تحیر کے موقع پر اسکی رہنمائی کر سکیں، نیز وہ اتنی ذکاوت مستعدی اور تنظیم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت و قوت کے جو چشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لئے مفید بنائیں، بجائے اس کے کہ اہل باطل ان کو اپنی خواہشات کے حصول کے لئے استعمال کریں اور زمین

میں سربلندی اور فساد کے لئے اُن سے مدد لیں، اہل حق اُن سے وہ کام لیں جن کے لئے اللہ نے اُن کو پیدا کیا ہے۔

اموی اور عباسی خلفاء

لیکن دنیا کی بدقسمتی تھی کہ خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی رہنمائی کے منصب جلیل پر وہ لوگ حاوی ہو گئے، جنھوں نے اس کے لئے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی، خلفائے راشدین کی طرح اور خود اپنے زمانہ کے بہت سے مسلمانوں کی طرح انھوں نے اعلیٰ دینی اور اخلاقی تربیت نہیں پائی تھی، ان کا دینی، روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو ملت اسلامیہ کے رہنماؤں کے شایان شان ہے، ان کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول کے اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہوئی تھیں، ان میں نہ روح جہاد تھی اور نہ قوت اجتہاد جو دنیا کی پیشوائی اور عالمگیر قیادت کے لئے ضروری ہو خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ١٠١ ھ) کی ذات کو مستثنیٰ کر کے عام خلفائے بنی اُمیّہ اور بنی عباس کا یہی حال تھا۔

ملوکیت کے اثرات و نتائج

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی دیوار آہنی میں کئی رخنے پیدا ہو گئے جن سے مسلسل فتنے اور مصائب نفوذ کرتے رہے، اُن کا اجمالی بیان یہ ہے:۔

١۔ دین و سیاست میں عملی تفریق ہو گئی اسلیئے کہ خلفاء علم اور دین میں ایسا مرتبہ نہیں رکھتے تھے جس سے اُن کو علماء اور اہل دین کی ضرورت نہ پڑتی، انھوں نے حکومت و سیاست کو تنہا اپنے ہاتھ میں رکھا اور مشیر یا ماہر فن خصوصی کے طور پر جب چاہا یا جب اُن کے مصالح کا تقاضا ہوا علماء اور اہل دین سے

مددی اور جتنی بات انھوں نے چاہی قبول کی اور جب چاہا ان کے مشورہ پر عمل
نہیں کیا، اس طرح سیاست دین کی نگرانی سے آزاد ہو گئی اور ایک بیل
بے زنجیر بن گئی، اب اہل دین اور اہل علم کی صورت یہ تھی کہ یا تو وہ حکومت
کے مخالف تھے اور اسکے خلاف وقتاً فوقتاً خروج کرتے تھے یا سیاسی زندگی
سے کنارہ کش تھے اور فوری انقلاب سے مایوس ہو کر افراد کی اصلاح و تربیت
کے کام میں مشغول تھے، بعض اپنے ماحول کی خرابی کو دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے
اور اس پر دینی و اخلاقی حیثیت سے سخت تنقید کرتے تھے لیکن مجبور تھے، بعض
کسی دینی مصلحت کی بنا پر حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے تھے اور اس
کے نظام میں شریک ہو کر جتنی اصلاح ان کے امکان میں تھی کرنے کی کوشش
کرتے تھے، اور کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اپنی ذاتی مصلحت اور کامیابی کے
لئے حکومت کے ساتھ اشتراک اور موالات کر رہے تھے، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ
نظری اور اعتقادی طور پر تو نہیں لیکن عملاً دین و سیاست میں علیحدگی ہو گئی
اور اس بارہ میں خلافت راشدہ سے پہلے دنیا کے نظام سلطنت کا جو حال
تھا اس کا ایک رنگ پیدا ہو گیا تھا، دین روز بروز بے زور اور بے دست
و پا ہوتا جاتا تھا اور سیاست کے ہاتھ کھل رہے تھے اور اسکی بے قیدی اور
خود اختیاری بڑھ رہی تھی، اسی وقت سے اہل علم و دین اور اہل دنیا کے
دو علیحدہ علیحدہ گروہ بن گئے اور ان کے درمیان اختلاف کی خلیج روز بروز
وسیع ہوتی گئی، اور بعض اوقات بیگانگی سے بڑھ کر مخالفت کی نوبت آ گئی۔
۲۔ ارکان حکومت یہاں تک کہ بذات خود خلفاء دین و اخلاق کا کامل

نمونہ نہیں تھے بلکہ اُن میں سے بعض اشخاص میں جاہلی جراثیم اور میلانات پائے جاتے تھے، قدرتی طور پر ان کی رُوح اور نفسیات کا اثر قومی زندگی پر پڑ رہا تھا اور لوگ عموماً انھیں کے اخلاق وعادات ورجحانات کی تقلید کرتے تھے، دین کی نگرانی ختم ہو چکی تھی، احتساب اُٹھ چکا تھا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا زور ختم ہو چکا تھا اسلئے کہ اسکی پشت پر کوئی طاقت اور حکومت کی حمایت نہیں تھی وہ محض چند دین دار اشخاص کا رضا کارانہ عمل تھا جن کے پاس کوئی قوت اور تعزیر نہیں تھی، اسکے برخلاف بے قید اور آزاد زندگی کی ترغیبات بہت تھیں، اس لئے جاہلیت کو اسلامی ممالک کے اندر سانس لینے کا موقع ملا اور اس نے سر اُٹھایا، عیش وعشرت، ترفع وتنعم کی زندگی عام ہو گئی ...... تفریحات اور لہو ولعب کی گرم بازاری ہوئی، لذت اندوزی اور نفس پروری کا غلبہ ہوا اور دنیا کی زندگی اور اسکی لذتوں کی ہوس بڑھ گئی اس اخلاقی تنزل اور اس تفریحی انہماک کے ساتھ کسی قوم کے لئے اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دینا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کی جانشینی کرنا، اللہ اور روز آخرت کو یاد دلاتے رہنا، تقویٰ اور دین داری کی ترغیب دینا اور لوگوں کے لئے اعلیٰ اخلاقی نمونہ قائم کرنا بہت مشکل ہے بلکہ ان حالات کے ساتھ اپنے وجود عزت اور آزادی کو برقرار رکھنا بھی دشوار ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ (الاحزاب ۶۲)	اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں میں بھی جو پہلے ہو گزرے ہیں یہی دستور (جاری) رکھا ہے جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور آپ خدا کے دستور میں کسی کی طرف سے ردوبدل نہ پائیں گے۔

۳۔ یہ لوگ اپنے اخلاق و اعمال و معاملات میں اسلام کی شرعی سیاست اس کے جنگی قانون، اسکے تمدنی نظام اور اسکی اخلاقی تعلیمات کی بہت کم نمائندگی کرتے تھے، اس طرح غیر مسلموں کے دلوں سے اسلام کے پیغام کا احترام اور اثر جاتا رہا اور ان کا اعتماد ان لوگوں سے زائل ہوگیا، ایک یورپین مورخ کے الفاظ میں "اسلام کو اس لئے زوال شروع ہوا کہ انسانیت کو ان لوگوں کی صداقت میں شبہ ہونے لگا جو دین جدید کی نمائندگی کر رہے تھے"۔

فلسفیانہ موشگافیاں

اس دور انحطاط میں مسلمان علماء اور مفکرین نے جس قدر علوم مابعد الطبیعات (Metaphysics) اور یونانیوں کی الٰہیات کی طرف توجہ کی اس قدر علوم طبیعہ اور عملی اور نتیجہ خیز فنون کی طرف توجہ نہیں کی، حالانکہ یہ یونانی فلسفہ اور الٰہیات محض یونانیوں کا علم الاصنام (Mythology) تھا جس کو انھوں نے اپنی چالاکی سے فلسفیانہ الفاظ و اصطلاحات میں ایک عقلی فن کے لباس میں پیش کیا تھا، وہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا جس کے پیچھے کوئی حقیقت و اصلیت نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو اس گنج کاوی اور لاحاصلی سے مستغنی کر دیا تھا اور نبوت کے ذریعہ ان کو ذات و صفات الٰہی کا وہ یقینی اور محکم علم بخشا تھا جس کی موجودگی میں اس بحث میں اور اللہ کی ذات و صفات کے بارہ میں اس کیمیاوی تحلیل و تجزیہ کی (جو فلسفۂ الٰہیات و کلام کا طرز ہے) قطعاً ضرورت نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ اہل فلسفہ و کلام نے اس نعمت عظیم کی قدر نہ کی اور ان مباحث میں جن کا دنیا و آخرت میں کوئی فائدہ نہ تھا صدیوں

تک دردسری و دیدہ ریزی کرتے رہے اور اپنی بہترین قابلیت و ذہانت اس لاحاصل شغل میں صرف کی، اس انہماک نے اُن کو ان علوم اور تجربوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا جو ان کے لئے کائنات کی طبعی قوتیں مسخر کر دیتے اور پھر وہ ان کو اسلام کے مقاصد و مصالح کا تابع اور خادم بنا کر اسلام کے مادی و روحانی تسلط کو تمام عالم پر قائم کر دیتے، اسی طرح سے انھوں نے فلسفۂ اشراق کے مباحث اور وحدۃ الوجود کے مسائل میں اپنا فرصت سے زیادہ وقت اور طاقت صرف کی۔

شرک و بدعات

اس دورِ انحطاط میں مسلمانوں میں شرک و جہالت قدیم جاہلی قوموں کے عقائد و خیالات اور دینی گمراہی نے بھی نفوذ کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کی زندگی میں اور ان کے مزاج میں ایسی بدعات نے درخور حاصل کر لیا، جنھوں نے مذہبی زندگی کی ایک بڑی جگہ کو گھیر لیا اور مسلمانوں کو صحیح دین اور کار آمد دنیا سے مشغول کر دیا، ظاہر ہے کہ دُنیا کی دوسری قوموں کے درمیان مسلمانوں کو جو کچھ امتیاز و خصوصیت حاصل ہے وہ اُس دین کی بدولت ہے جو رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پاس سے لیکر آئے اور اس دین کا امتیاز و اعجاز اسکی اصلیت میں ہے وہ اسی بارہ میں ممتاز ہے کہ وہ اللہ کی وحی و شریعت اسکی معجزانہ ساخت اور اُس کی حکیمانہ صنعت ہے۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ۔ — اس اللہ کی کاریگری جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔

پس جب اس میں انسانوں کی عقلیں دخل دینے لگیں گی اسکے خود ساختہ اعمال و رسوم داخل ہو جائیں گے اور وہ خدا نخواستہ اپنی اصلیت کھو دیگا تو دنیا

وآخرت کی سعادت کی ضمانت باقی نہیں رہے گی اور وہ اس کا مستحق نہ ہوگا کہ انسانی عقلیں اسکے سامنے سرافگندہ ہوں اور دلوں کو وہ تسخیر کرے۔

دعوت وتجدید کا تسلسل

لیکن واضح رہے کہ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے وہ اس پوری مدت میں ہر قسم کی تحریف وتبدیلی سے محفوظ رہا، مسلمانوں نے راہ راست سے جہاں جہاں انحراف کیا تھا، کتاب وسنت سے مقابلہ کرکے اس کا علم اور احساس ہوجاتا تھا، دین وشریعت نے مسلمانوں کی غلطی میں کبھی ساتھ نہیں دیا، بلکہ اُن کے مطالعے سے غیر اسلامی ماحول مشرکانہ اور مبتدعانہ اعمال ورسوم اور جاہلی اخلاق وعادات کے خلاف نیز طبقۂ امراء اور گروہ سلاطین کے تعیش اور استبداد کے خلاف ایک سخت احتجاج اور جذبۂ جہاد پیدا ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور اور اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں ایسے عالی ہمت اور اولوالعزم اشخاص پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اس اُمّت میں انبیاء کی جانشینی کا حق ادا کیا مسلمانوں کے تن مردہ میں رُوح جہاد پھونکی، اور برسوں کی ساکن سطح میں حرکت وتموّج پیدا کیا، اور مسائل اور علوم میں اپنی فکر تازہ اور مجتہدانہ قابلیت سے کام لے کر مسلمانوں میں نئی علمی رُوح اور ذہنی بیداری پیدا کردی، ایک مبصر مؤرخ کو جہاد اور تجدید کی تاریخ میں کوئی خلا اور وقفہ نظر نہیں آتا، اصلاح کی شمعیں اور چراغ مسلسل طریقہ پر ایک دوسرے سے روشن ہوتے رہے اور بڑی تیز وتند ہواؤں میں بھی عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرا نہیں پھیلنے پایا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت"

اسی کے ساتھ جب اسلام یا عالم اسلام کے لئے کوئی نیا خطرہ پیش آیا تو کوئی مرد مجاہد میدان میں آیا اور اس نے نہ صرف اس خطرہ کو دور کیا بلکہ عالم اسلام میں ایک نئی امنگ اور نئی زندگی پیدا کردی، اس کی واضح مثال نور الدین اور صلاح الدین کی شخصیتیں ہیں۔

صلیبی خطرہ اور زنگی خاندان

مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے خار کھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے اور اس کے تمام مقدس مقامات ان کے قبضہ اور تولیت میں تھے، لیکن طاقتور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پر ان کی مسلسل پیش قدمیوں کی بنا پر اس کو حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ پانچویں صدی ہجری اور گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں ایسے حالات واسباب پیش آئے کہ یورپ کے "صلیبی مجاہدین" نے شام وفلسطین کا رخ کیا اور ان کی فوجیں سیلاب اور طوفان کی طرح پھیل گئیں ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کرلیا اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ ان کے تصرف میں آگیا، مشہور انگریز مورخ سٹینلے لین پول Stancley Lane Poel لکھتا ہے:-

"صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کٹنے کو ہے پھر اس کی چھپٹیاں اڑادیں گے"[1]

---

[1] سلطان صلاح الدین از اسٹینلے لین پول مترجمہ مولوی محمد عنایت اللہ صاحب صـ ۲۱

صلیبیوں نے داخلۂ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہوکر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ان کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مؤرخ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہوکر گئے گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا"۔[1]

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور اسکی نوخیزی طاقت کی خبر دیتی تھی اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی تھی، مسیحیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ ریجی نالڈ والی کرک نے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ پر بھی چڑھائی کا ارادہ کیا تھا، واقعۂ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی تھی۔

عین اس کش مکش اور بڑھتی ہوئی ناامیدی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا جس گوشہ سے امید نہ تھی وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، یہ موصل کا زنگی خاندان تھا جس کے دو افراد عماد الدین زنگی (م ۵۴۱ھ) اور اسکے فرزند نور الدین زنگی (م ۵۶۹ھ) نے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور بیت المقدس

[1] Encyclopaedia Britannica V. II P. 62

کے علاوہ (جس کی فتح صلاح الدین کے لئے مقدر تھی) تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا نور الدین اپنی شرافت نفس، زہد و ورع، حسن انتظام، عدل و انصاف، انکسار و تواضع، شوق جہاد اور ایمان و یقین کے لحاظ سے اسلامی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، مشہور مورخ ابن الاثیر جزری جو اُن کے خورد سال معاصر ہیں تاریخ الکامل میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے گذشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا مطالعہ کیا ہے خلفائے راشدین اور عمر ابن عبد العزیز کے بعد نور الدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ عادل سلطان میری نظر سے نہیں گزرا"[1]

صلاح الدین کی قیادت

نور الدین کے بعد ان کے تربیت یافتہ سلطان صلاح الدین نے صلیبی دنیا کے مقابلہ میں عالم اسلام کی قیادت سنبھالی، بالآخر مختلف معرکوں کے بعد انھوں نے حطین (فلسطین) کے میدان میں ۱۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ (۴ جولائی ۱۱۸۷ء) کو صلیبیوں کو ایسی شکست دی جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی اور اُن کی قسمت پر مہر لگ گئی، لین پول اس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:۔

"ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو جنھیں خود اس نے گرفتار کیا تھا خیمے کی رسی میں باندھے لے جاتا دیکھا گیا، ٹوٹی ہوئی صلیبوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مُردوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے جیسے پتھر پر پتھر پڑے ہوں اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے

---

[1] الکامل، ج ۱۱ صہ ۱۲۴

پڑے تھے جیسے خربوزوں کے کھیت میں خربوزے پڑے نظر آتے ہیں
مدتوں تک جنگ کا میدان جس میں یہ خونی لڑائی ہوئی تھی اور
جہاں بیان کیا جاتا تھا کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے مشہور رہا۔[1]

حطین کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے ۲۷ رجب ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) کو بیت المقدس کو دوبارہ حاصل کیا اور اس آرزو کی تکمیل کی جو ۹۰ برس سے مسلمانوں کے دلوں کو بے چین کئے ہوئے تھی، سلطان کے رفیق و معتمد قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:۔

"ہر طرف دعاء تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹۰ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبۂ صخرہ پر جو صلیب نصب تھی وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا اور اسلام کی فتح مندی اور اللہ تعالیٰ کی مدد کھلی آنکھوں نظر آرہی تھی۔"[2]

سلطان صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:۔

"اگر صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شہامت

[1] سلطان صلاح الدین صفحہ ۲۱۸ [2] تاریخ ابی الفداء حموی

میں یکتا اور بے مثل شخص تھا۔[1]

بیت المقدس کی فتح اور حطّین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اُبل پڑا، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا اور اسکے اعزہ اور چند حلیف، جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز و خونِ آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۳ء میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عکہ کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اسکے سپرد کیا تھا اسکے ہاتھوں مکمل ہوا، لین پول لکھتا ہے:۔

"جنگ مقدس خاتمہ کو پہونچی، پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، جولائی ۱۱۸۷ء میں حطّین پر مسلمانوں کی فتح سے پہلے دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے تو صور سے لیکر یافا تک ساحل پر بجز زمین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ

[1] سلطان صلاح الدین صہ ۲۰۵

یہ تھا، اس صلح نامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی پہلے

سلطان صلاح الدین اعلیٰ تنظیمی قابلیت اور قائدانہ خصوصیات کا مالک تھا وہ نہ صرف سپہ سالار اور فاتح تھا بلکہ محبوب قائد اور ہر دلعزیز سپاہی بھی تھا، اس نے صدیوں کے بعد منتشر و پراگندہ اسلامی ریاستوں اور طاقتوں اور متفرق اور باہم مخالف مسلمان قوموں اور قبائل کو جہاد کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا، جو عرصۂ دراز کے بعد اسکی قیادت میں عالم اسلام نے ایک منظم اور پُرخلوص جنگ کی جس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ لین پول نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی مخدوش اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی مگر کسی کی زبان پہ حرف شکایت نہ تھا، کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا"[۲]

آگے چل کر لکھتا ہے:-

"کرد، ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم

۱؎ سلطان صلاح الدین ص ۳۱۰ ۲؎ ایضاً ص ۳۱۰-۳۱۱

تھے اور طلبی پر خادموں ہی کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے باوجود اس کے کہ اُن کی نسل و قوم جدا تھی اور باوجود قومی چشمکوں و رقابتی غرور و افتخار کے سلطان نے ان کو ایسا شیر و شکر رکھا کہ تمام لشکر تن واحد نظر آتا تھا۔ [1]

صلاح الدین کے بعد ۲۴ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں اور اس کی بروقت قیادت نے عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے عرصہ تک کے لئے محفوظ کر دیا، عالم اسلام کا مطلع صاف ہو گیا، لیکن صلیبیوں نے ان جنگوں سے فائدہ اٹھایا اپنی اور عالم اسلام کی کمزوری کا مطالعہ اور تجربہ کرنے کے بعد وہ نئے صلیبی حملہ کی (جس کی نوبت انیسویں صدی میں آئی) تیاری میں مصروف ہو گئے لیکن عالم اسلام پر پھر غفلت طاری ہو گئی اور باہمی اختلافات اور خانہ جنگیوں نے پھر سر اٹھایا، صلاح الدین کے بعد عالم اسلام کو پھر ایسا مخلص قائد اور رہنما نصیب نہیں ہوا جو اسلام کی بے غرض خدمت کے لئے بیتاب ہو اور جس کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ ہو اور جس پر عالم اسلام کو اس درجہ اعتماد اور اس کی ذات سے تعلق ہو جیسے صلاح الدین کے ساتھ تھا، عالم اسلام پھر ایک بار خود غرضیوں، خانہ جنگیوں اور سازش کا شکار ہو گیا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک انحطاط اور تنزل چھا گیا۔

جاہلیت کے لئے رکاوٹ لیکن مسلمان اپنی ساری خرابیوں اور کوتاہیوں کے

---

[1] سلطان صلاح الدین صہ ۲۱۱

باوجود اور اپنے انحراف کے باوصف اپنی تمام معاصر جاہلی قوموں کے مقابلہ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کی شاہ راہ سے قریب تر اور خدا کے زیادہ مطیع و فرمانبردار تھے ان کا وجود اور ان کا رہا سہا اقتدار جاہلیت کے لئے پھیلنے اور ترقی کرنے میں بڑی زبردست رکاوٹ اور سدِ سکندری کا کام دے رہا تھا، وہ اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود دنیا کی ایک اہم طاقت تھے جس سے حکومتیں خائف رہتی تھیں اور جس کی ان کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی، لیکن بغیر اسکے کہ باہر کے لوگوں کو محسوس ہو اندرونی طور پر یہ طاقت کمزور ہوتی رہی یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ان کا سیاسی انتشار، اخلاقی کمزوری اور ضعف پورے طور پر نمایاں ہو گیا اور اسلامی طاقت کا وہ ہیبت سایہ جو دور سے نظر آتا تھا اوجھل ہو گیا اور اس کے ہٹتے ہی مسلمانوں پر وحشی قوموں اور حریف طاقتوں کا نرغہ ہوا اور اسلامی ممالک ایک لاوارثی مال کی طرح فاتحوں میں تقسیم ہونے لگے۔

ہنگامۂ تاتار

ان وحشیانہ حملوں میں سب سے بڑا حملہ تاتاریوں کا حملہ تھا جو مور و ملخ کی طرح مشرق سے بڑھے اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے، تاتاری یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان مبہوت و ششدر تھے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالم اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آ گیا مؤرخ ابن اثیر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے

اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا ہے :۔

" یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں، اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے ؟ کاش میں نہ پیدا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا پھر بھی مجھے تردد تھا لیکن میں نے دیکھا کہ نہ لکھنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔

یہ وہ حادثۂ عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں نہیں پیش آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا اسلئے کہ تاریخ میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں تھا اور شاید دنیا قیامت تک (یاجوج و ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون، ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، یہ حادثہ عالم گیر و عالم آشوب تھا، ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم پر پھیل گیا۔[1]

سنہ ۶۵۶ھ میں یہ تاتاری دارالخلافہ بغداد میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، مورخ ابن کثیر بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کی زہرہ گداز خوں آشامی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پررونق ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے۔ ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں تعفن پھیلا، جس سے شہر کی ہوا خراب ہوئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہونچا اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری۔ گرانی، وبا، اور فنا تینوں کا دور دورہ تھا۔"[2]

مصری افواج کے مقابلہ میں تاتاریوں کی شکست

عراق و شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا

---

[1] الکامل ابن اثیر ج ۱۲ ص ۲۰۲-۲۰۳ [2] البدایۃ والنہایۃ

اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارتگری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بری طرح سے بھاگے اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا اور کثرت سے اُن کو قتل کیا اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیف الدین قطز کے بعد الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح

بایں ہمہ تاتاری عراق سے لے کر ایران و ترکستان تک قابض تھے اور خود دارالسلام بغداد ان کے قبضہ میں تھا، ایک نیم وحشی بت پرست قوم کا عالم اسلام کے علمی و تہذیبی مرکز پر قابض رہنا ایک افسوس ناک واقعہ تھا جس کا پورے عالم اسلام اور پوری زندگی اور تمدن و اخلاق پر اثر پڑ رہا تھا، عالم اسلام میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو اُن کو عراق سے بے دخل کر سکے، اس وقت اسلام کی روحانی طاقت اور قوت تسخیر کا ایک معجزہ ظاہر ہوا اور چند گمنام و مخلص داعیوں اور مسلمان اُمراء دربار کی توجہ اور کوشش سے تاتاری سلاطین و

امرا میں اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی اور اس طرح اسلام نے اس ناقابل تسخیر قوم کو فتح کرلیا جس نے سارے عالم اسلام کو ایک بار فتح کرلیا تھا۔

ابن کثیر سنہ ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

" اس سال چنگیز خاں کا پرپوتا قازان تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف باسلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہوگئے، جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر نچھاور کئے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے بت خانے گرادیئے اور ان پر جزیہ مقرر کیا بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا اور لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں دیکھیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا"[1]

تاتاری حملہ کا عالم اسلام پر اثر

تاتاری حملہ سے عالم اسلام کو ایسا دھچکا لگا تھا کہ اس کے سنبھلنے کے لئے مدت درکار تھی، تاتاری حملہ ہی سے مسلمانوں کے قوائے فکریہ میں اضمحلال وافسردگی اور طبیعتوں میں یاس انگیزی اور جمود پیدا ہوگیا، اس حملہ سے علوم دینیہ ادب وشاعری تصنیف و تالیف اور اخلاق ومعاشرت سب پر اثر پڑا تھا علمی وادبی سرمایہ میں اضافہ، جدت و

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۳۴۰

اصلاح اور تعمیر و ترقی کے بجائے اب اہل علم اور حاملین دین کو اسکی فکر تھی کہ وہ موجودہ سرمایہ کی حفاظت کا معقول انتظام کر سکیں اور کسی طرح اس فقہی علمی اور ادبی ذخیرہ کو تباہی سے بچا سکیں جو اب انکی تولیت اور امانت میں تھا، انسانیت و تہذیب کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ دنیا کی زمام قیادت ان جاہلی اور وحشی قوموں کے ہاتھ میں گئی جو نہ کوئی آسمانی دین رکھتے تھے اور نہ کسی علم و تہذیب اور تمدن کے سرمایہ کے مالک تھے، اُن کی قیادت میں کسی علمی و دینی ترقی کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی، ان کے اسلام قبول کر لینے کے بعد اگرچہ مسلمان اُن کی غارتگری اور خون آشامی سے محفوظ ہو گئے تھے اور اُن کو نئی تازگی حاصل ہو گئی تھی اور اسلام حکمراں طبقہ کا مذہب بن گیا تھا، مگر ان جدید الاسلام تاتاریوں میں بہرحال دینی و علمی قیادت اور اسلامی امامت کی صلاحیت نہ تھی اور اس صلاحیت کے پیدا ہونے کے لئے ایک طویل مدت درکار تھی، اس وقت ایک ایسی تازہ دم عالی حوصلہ مجاہد سیرت قوم کی ضرورت تھی جو گرتے ہوئے عالم اسلامی کو سنبھال سکے، اس میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا کر دے اور عالم اسلامی کی قیادت کا فرض انجام دینے کی کوشش کرے۔

میدان قیادت میں عثمانی ترکوں کی آمد اور عالم اسلامی کا ایک سنبھالا

کچھ ہی عرصہ کے بعد آٹھویں صدی میں عثمانی ترک تاریخ کے منظر عام پر آئے، انھوں نے دنیا کو عام طور پر اور مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف اس وقت متوجہ کیا جب سلطان محمد فاتح نے ۸۵۳ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں اپنی چوبیس برس کی عمر میں بازنطینی سلطنت

کے ناقابل تسخیر دار السلطنت قسطنطنیہ کو فتح کرلیا، اس واقعہ سے مسلمانوں میں ایک نئی اُمنگ اور نیا جوش پیدا ہو گیا ترک (جن کی قیادت آل عثمان کر رہے تھے) اس کے اہل تھے کہ ان پر اسلامی اقوام کی قیادت کے بارہ میں مسلمانوں کی طاقت کو از سر نو واپس لانے میں اور دُنیا میں اُن کے کھوئے ہوئے مرتبہ اور مقام کو حاصل کرنے میں اعتماد کیا جائے ان کا قسطنطنیہ کو فتح کر لینا جس کو مسلمان آٹھ سو برس تک بار بار کی کوششوں کے باوجود فتح نہیں کر سکے تھے انکی قابلیت قوت اور فنون جنگ میں مرتبۂ اجتہاد کو پہونچ جانے کی دلیل تھی، اور یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جنگی طاقت اور سامان جنگ میں اپنی تمام معاصر قوموں سے فائق ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے علم و عمل کی طاقت اور اجتہاد سے کام لے سکیں اور قائد قوم کے لئے یہ تمام صفات بمنزلۂ شرائط کے ہیں۔

(Baron Carra de Vaux) اپنی کتاب "مفکرین اسلام" کے پہلے حصہ میں محمد فاتح کے تذکرہ میں لکھتا ہے:۔

"یہ فتح محمد فاتح کو محض بخت و اتفاق سے حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ اسکا سبب محض بازنطینی سلطنت کی کمزوری تھی اصل وجہ یہ تھی کہ سلطان بہت پہلے سے اسکے لئے ضروری انتظامات کر رہا تھا اور اُس کے زمانہ میں علم کی جتنی طاقت تھی اس سے کام لے رہا تھا توپیں اس وقت نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں اس نے کوشش کی کہ جتنی زبردست اور بڑی توپ اس زمانہ میں بن سکتی ہو بنائی جائے

اس نے اسکے لئے ہنگری کے ایک انجینیر کی خدمات حاصل کیں جس نے اسکے لئے ایک ایسی توپ بنائی جو تین سو کیلو کے وزن کا گولہ پھینکتی تھی اور اس کی مار ایک میل سے زیادہ کی تھی، کہتے ہیں کہ اس توپ کو کھینچنے کے لئے سات سو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اسکے بھرنے کے لئے دو گھنٹے چاہئے تھے، جب محمد فاتح قسطنطنیہ فتح کرنے چلا تو اسکی قیادت میں تین لاکھ سپاہی تھے اور زبردست توپخانہ، اس کا بحری بیڑہ جو قسطنطنیہ کا سمندر کی جانب سے محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک سو بیس جنگی کشتیوں پر مشتمل تھا، اس نے اپنی عقل و اجتہاد سے یہ تجویز کیا کہ جنگی بیڑہ کا ایک حصہ خشکی سے خلیج تک پہونچایا جائے اس نے لکڑیوں پر چربی مل کر ستر جہاز قاسم پاشا کی سمت سے سمندر میں اتار دیئے۔

محمد فاتح سے یورپ اس قدر مرعوب اور خوف زدہ تھا کہ اسکے انتقال پر پاپائے اعظم نے جشن مسرت منانے کا حکم دیا اور فرمان صادر کیا کہ تین روز تک مسلسل شکرانہ کی نمازیں پڑھی جائیں۔[1]

مسلمان ترکی قوم میں درحقیقت کچھ ایسی خصوصیات جمع تھیں جن سے وہ مسلمانوں کی قیادت کی مستحق تھی۔ (ترکوں کی خصوصیات)

۱۔ وہ ایک بلند حوصلہ پرجوش اور زندہ قوم تھی جس میں جہاد کی روح تھی اور جو بدویت کی زندگی اور سادگی سے قریب العہد ہونے کی وجہ سے ان اخلاقی اور اجتماعی امراض سے محفوظ تھی جن میں اسلامی قومیں مشرق میں

[1] ملخصہ تاریخ العثمانی (محمد جلیل بیہم) ص ۲۰۴

مبتلا ہو کر کمزور ہو چکی تھیں۔

۴۔ اسکے پاس ایسی جنگی طاقت تھی جس سے وہ اسلام کے مادی اور روحانی تسلط کو پھیلا سکے اور حریف قوموں کی دست درازیوں کو روک سکے اور دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہو سکے، ایک وقت میں عثمانی سلاطین تین براعظم یورپ، ایشیا اور افریقہ میں حکومت کرتے تھے۔ اسلامی مشرق ایران سے مراکش تک اُن کے زیر فرمان تھا، ایشیائے کوچک کو وہ زیر کر چکے تھے اور یورپ میں آگے بڑھتے ہوئے وہ ویانا کی دیواروں تک پہونچ گئے تھے، بحر متوسط کے وہ تنہا مالک تھے، جس پر کسی دوسری قوم یا سلطنت کا کوئی اثر نہ تھا، بطرس اعظم Peter the Great کے معتمد نے ایک مرتبہ قسطنطنیہ سے قیصر کو لکھا تھا کہ سلطان بحر اسود کو اپنا گھر سمجھتے ہیں جس میں کسی غیر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں، ترکوں کے بحری بیڑہ کا مقابلہ سارا یورپ ملکر بھی نہیں کر سکتا تھا ۹۴۵ھ / ۱۵۴۷ء میں پاپائے اعظم، وینس، اسپین، پرتگال اور مالٹا کی متحدہ بحری طاقت نے اس بیڑہ کو شکست دینی چاہی لیکن شکست کھائی۔ سلیمان اعظم کے زمانہ میں ترکوں کو بحری، بری، اور سیاسی اور روحانی اقتدار حاصل تھا، اسکے زمانہ میں عثمانی حکومت کے حدود شمال میں دریائے صاوہ (Sava) جنوب میں نیل کے دہانہ اور بحر ہند تک، مشرق میں قفقاز کے سلسلہ کوہ اور مغرب میں کوہ اطلس تک پہونچ گئے تھے اور چار لاکھ مربع میل کا رقبہ اسکے زیر حکومت تھا سلطنت عثمانیہ کا بحری بیڑہ تین ہزار فوجی جہازوں پر مشتمل تھا، روم کے علاوہ قدیم دنیا کا ہر مشہور شہر حکومت عثمانیہ کے زیر فرمان تھا۔[1]

---

[1] فلسفۃ التاریخ العثمانی محمد جمیل بیہم ص ۲۰۰-۲۰۱

یورپ سارا ان سے ہیبت زدہ تھا، اس کے بڑے بڑے بادشاہ عثمانی سلاطین کی حفاظت اور پناہ میں داخل ہوتے تھے اُن کے احترام میں کلیساؤں کے گھنٹے بند ہو جاتے تھے۔

۳۔ بین الاقوامی قیادت کے لئے اُن کو بہترین جغرافیائی مرکز حاصل تھا وہ جزیرہ نمائے بلقان سے بیک وقت ایشیا اور یورپ کی نگرانی کرسکتے تھے، اُن کا دارالسلطنت بحر اسود اور بحر ابیض کے درمیان واقع اور ایشیا اور یورپ کی خشکیوں کا نقطۂ اتصال تھا، اسلئے ایک ایسی حکومت کا جس کو تینوں براعظم (یورپ، ایشیا اور افریقہ) کی بیک وقت نگرانی کرنی تھی وہ بہترین پایۂ تخت تھا، نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر کبھی ساری دنیا کی ایک متحدہ حکومت قائم ہوئی تو قسطنطنیہ ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ اُس کا دارالسلطنت بنے"[1]

وہ یورپ میں تھے اور یورپ کو مستقبل قریب میں بڑی اہمیت اور حیثیت حاصل ہونے والی تھی، زندگی کی طاقتیں اور ترقی کے محرکات وعناصر اس کے سینہ میں اُبل رہے تھے اگر اللہ توفیق دیتا تو ترکوں کے لئے یہ ممکن تھا کہ علم وعقل کے میدان میں پیش قدمی کریں، اور یورپ کی عیسائی قوموں سے بازی لے جائیں، اور دنیا کے پیشوا بن کر اس سے پہلے کہ یورپ دنیا کی عنان قیادت ہاتھ میں لے کر اس کو ہلاکت وتباہی کی طرف لے جائے وہ اس کو حق وہدایت کی منزل کی طرف جس کا نشان اُن کو اسلام کے طفیل میں مل چکا تھا لے چلیں۔

---

[1] خلیفہ الادارہ العثمانی از محمد جمیل بیہم ص ۱۵۹

ترکوں کا تنزل

لیکن ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عین ترقی وعروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزل و انحطاط شروع ہوگیا اور قوموں کے پرانے امراض اُن میں پیدا ہوگئے، آپس میں حسد و بغض کا نشو ونما ہوا، بادشاہ مستبد اور جابر ہونے لگے، حکمرانوں کی تربیت کا نظام بگڑ گیا، اخلاق میں انحطاط شروع ہوگیا۔ حکام اور سپہ سالار قوم وسلطنت سے خیانت اور غداری کرنے لگے، قوم میں راحت طلبی اور عافیت کوشی پیدا ہوگئی، غرض زوال پذیر قوموں کی وہ تمام صفات پیدا ہوگئیں جن کی تفصیل ترکوں کی تاریخ کی کتابوں میں ہے اور یہ اس کا موقع نہیں ہے[1]

ترکوں کا جمود اور پسماندگی

سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا، علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ اور عسکری تنظیم و ترقی میں بھی، قرآن مجید کی یہ آیت انھوں نے بالکل فراموش کردی۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا	مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں
اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ	ہے قوت پیدا کر کے، اور گھوڑے
وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ	تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ	لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو
اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ	کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے

[1] ملاحظہ ہو فلسفۃ التاریخ العثمانی

وَ اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ۔ (الانفال - ۶۰)

اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھوگے نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے حافظہ سے گویا محو ہو گیا تھا۔

"الحکمۃ ضالۃ المؤمن حیث وجدھا فھو احق بھا" (دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں اسکو مل جاوے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے) ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے اُن کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی وہ وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے تھی جو انھوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی کہ:۔

"اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو اور ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہوئے ہو اسلئے تم کو ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہئے کیوں کہ تمھارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمھارے ملک پر لگی ہوئی ہیں"[1]

لیکن افسوس ہے کہ ترک مطمئن ہو کر بیٹھ گئے وہ اپنی جگہ پر رہے اور یورپین قومیں کہیں سے کہیں پہونچ گئیں۔

مشہور ترکی فاضلہ خالدہ ادیب خانم نے ترکوں کے اس علمی اور تعلیمی جمود

---

[1] تاریخ مصر از جرجی زیدان

کا بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ لکھتی ہیں :-

"جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی ترکی کے علماء اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے، مدرسۂ سلیمانیہ اور مدرسۂ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے، مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئے علم و حکمت کی بنا ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت عملی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی، یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا، یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظام تعلیم پر حاوی رہا، ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کے علماء کا یہ طرز خیال جذبۂ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا، فلسفۂ کلام یا علم کلام خواہ وہ عیسائیوں کا ہو یا مسلمانوں کا یونانیوں کے فلسفہ پر مبنی ہے، اس پر کم و بیش ارسطو کے خیالات کا رنگ غالب ہے جو ایک دشتی فلسفی تھا، یہاں اسکی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم مختصر الفاظ میں عیسائی علماء اور مسلمان علماء کے طرز خیال کا مقابلہ کریں۔

قرآن کریم میں عالم طبیعی کی تخلیق کے مسئلہ کا کہیں تفصیل سے ذکر نہیں ہے، اسکی تعلیم میں زیادہ اہمیت اخلاقی و معاشرتی زندگی کو دی گئی ہے اس کا خاص مقصد حسن و قبح، خیر و شر میں امتیاز کرنا ہے وہ دنیا کے لئے ایک قانون عمل لے کر آیا ہے، مابعد الطبیعی

مسائل اور روحانی معارف بھی جہاں کہیں بیان کئے گئے ہیں ان میں کوئی پیچیدگی یا اشکال نہیں اسکی بنیادی تعلیم توحید ہے، اسی وجہ سے اسلام ایک نہایت سہل و سادہ مذہب ہے اور اس میں دوسرے مذاہب سے کہیں زیادہ اسکی گنجائش ہے کہ عالم طبیعی کے نئے نظریات کو قبول کر سکے، مگر یہ سادگی اور وسعت نظر جو نئی علمی تحقیقات کے لئے اس قدر سازگار تھی کہ مسلمانوں میں زیادہ دن نہیں رہنے پائی نویں صدی میں علماء اور متکلمین نے نہ صرف فقہ بلکہ الٰہیات کو بھی اصول وضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دیا، یعنی تحقیق واجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا، اسی زمانہ میں اسلامی فلسفہ میں ارسطو کے خیالات دخیل ہو گئے۔

بخلاف اسکے دین عیسوی میں جب مسیحؑ کے مذہب کی جگہ سینٹ پال کا مذہب جتنا زیادہ موزوں ہے، کتاب پیدائش کے اندر عالم طبیعی کی مفصل تفسیر موجود ہے، عیسائی اسے خدا کا کلام تسلیم کر چکے تھے اسلئے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ اس تفسیر عالم کی حقانیت کو ثابت کریں اس تاویل میں مشاہدہ ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اسلئے استدلال سے مدد لینا پڑی ارسطو کا دامن انھوں نے اس لئے پکڑا کہ اسکی منطق سحر کی سی خاصیت رکھتی تھی۔

جب مغرب نے فطرت کا مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ تحلیل اور تجزیہ کے ذریعہ سے کرنا شروع کیا تو ارباب کلیسا کے ہوش اڑ گئے، ادھر نئے علمی طریقوں کی مدد سے بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے اور

ادھر عیسائی علماء کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اب کلیسا کی حکومت کا خاتمہ ہے چنانچہ سخت جبر میں اس دور کا آغاز ہوا جس میں بڑے بڑے سائنسداں جو عالم طبیعی کے دائرہ کے اندر تحقیق میں مصروف تھے قتل کر دیئے جاتے تھے۔

سائنس اور مذہب کے خونریز معرکوں کے بعد آخر عیسوی کلیسا کو مصلحت شناسی سے کام لینا پڑا اس نے اپنے مدرسوں اور مکتبوں کے نصاب میں سائنس کو داخل کر لیا، اسکی یونیورسٹیاں جو پہلے بالکل اسلامی مدارس کی طرح تھیں سائنس اور علوم جدیدہ کا مرکز بن گئیں، مگر اسی کے ساتھ اس نے مابعد الطبیعی فلسفہ کو بھی نہیں چھوڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کا اثر تعلیم یافتہ طبقہ کے کم سے کم ایک حصہ پر بدستور باقی رہا، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پادری نئے علوم پر عبور رکھتے تھے اور نئے زمانہ کے نوجوانوں سے ہر موضوع پر بحث کر سکتے تھے۔

عثمانیوں کے یہاں علماء کی حالت اسکے بالکل برعکس تھی انھوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا، جب تک ملت اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا، ادھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی ہزیمتیں

اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدہ اور تجربہ کے جھمیلے میں پڑنے کی انھیں فرصت نہ تھی، سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا"[1]

عالم اسلام کا عام ذہنی وعلمی انحطاط

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا، دماغ تھکے تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں اور ایک عالمگیر جمود اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتداء نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ نویں صدی ہجری وہ آخری صدی تھی جب جدت فکر، قوت اجتہاد اور ادب وشاعری، حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں، یہی وہ صدی ہے جس میں مقدمہ ابن خلدون جیسی مفکرانہ تصنیف عالم اسلام کو حاصل ہوئی، دسویں صدی سے بہت واضح طور پر افسردگی، شدت تقلید اور نقالی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، یہ افسردگی اور اضمحلال کسی خاص شعبہ اور کسی خاص فن کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، دینی علوم، شعر وادب، انشا وتاریخ تعلیمی نصاب ونظام سب کے سب کم وبیش اس سے متاثر نظر آتے ہیں، پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھیے سیکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا

---

[1] ترکی میں مشرق ومغرب کی کش مکش، از خالدہ ادیب خانم۔

مشکل ہوگا جس پر عبقری (Genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو، یا کسی خاص علم میں اس نے کوئی گرانقدر اضافہ کیا ہو، پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثناء کر سکتے ہیں جو اپنے زمانہ کی عام علمی و ذہنی سطح سے بہت بلند تھے اور جنھوں نے دینی یا علمی دائرہ میں کوئی بڑا انقلابی کارنامہ یا علمی شاہکار پیش کیا، یہ خوش قسمتی ہے ان تمام مستثنیٰ افراد کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے، ان میں سے ایک حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) ہیں، جن کے مکتوبات اسلام کے علمی و دینی سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، اور جنھوں نے پورے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے، دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) ہیں جن کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ازالۃ الخفاء، الفوز الکبیر اور رسالہ الانصاف اپنے اپنے موضوع پر بالکل منفرد تصنیفات ہیں، تیسرے ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۳۳ھ) جنھوں نے اپنی تصنیفات تکمیل الاذہان اور رسالہ اسرار المحبت میں بعض نئے خیالات کا اظہار کیا، چوتھے شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی (ش ۱۲۴۶ھ) جن کی کتاب منصب امامت اور عبقات اجتہادی شان رکھتی ہے اور اپنے اپنے موضوع پر بے نظیر ہے، اسی طرح فرنگی محل کا خاندان اور پورب کے بعض تعلیمی سلسلے اپنی ذکاوت اور طباعی میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں اور انھوں نے اپنے وقت کے تعلیمی حلقوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، مگر ان کی ذہانت اور علمی کمالات درسیات کے دائرہ سے بہت کم تجاوز کرتے ہیں۔

صرف علم دین پر منحصر نہیں، ادب و شاعری بھی اپنی زندگی اور تازگی

کھو چکی تھی اور اُن پر بھی تقلید و تتبع کا غلبہ تھا، نثر و انشا پردازی کو تکلف و تصنع قافیہ پیمائی، لفظی صناعی اور عبارت آرائی نے بے رونق اور بے رُوح بنا رکھا تھا، دوستوں کے خطوط، تاریخ کی کتابیں اور دفتری تحریریں اور فرامین بھی اس عیب سے پاک نہیں تھے، کہیں کہیں ادب و انشاء کا کوئی ایسا نمونہ مل جاتا ہے جو اس زمانہ کے مذاق عام سے الگ اور پست سطح سے بلند نظر آتا ہے۔

تعلیمی حلقے اور مدارس سخت جمود و تقلید کا شکار، اور ایک علمی و فکری انحطاط میں گرفتار نظر آتے ہیں، متقدمین کی علم آموز اور ذوق آفریں کتابیں نصاب تعلیم سے رفتہ رفتہ خارج کردی گئیں اُن کی جگہ پر ان متاخرین کی کتابیں آگئیں جو اپنے فن میں درجۂ اجتہاد نہیں رکھتے تھے اور متقدمین کے صرف مقلّد یا شارح تھے، متون کی جگہ شروح و حواشی نے لے لی جن کی تالیف میں انکے مصنّفین نے کاغذ کے بارہ میں سخت کفایت شعاری سے کام لیا تھا اور عام فہم اور واضح زبان کے بجائے اشارات و رموز میں لکھا تھا اس سب سے اس ذہنی و علمی انحطاط اور پستی کا اندازہ ہوگا جو پورے عالم اسلام پر طاری تھی اور جس سے اس کا کوئی گوشہ اور زندگی کا کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں تھا۔

ترکوں کے مشرقی معاصر

دولت عثمانیہ کی ہمعصر و ہمسر دو طاقتور مشرقی حکومتیں تھیں، ہندوستان میں مغلیہ سلطنت، جس کی بنیاد ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں بابر کے مضبوط ہاتھوں سے پڑی تھی جو سلطان سلیم اوّل کا معاصر تھا اور جس کے تخت پر یکے بعد دیگرے طاقتور بادشاہ آئے، ترکی کے بعد مشرق کی سب سے بڑی عظمت اور پرشکوہ سلطنت تھی۔ اس خاندان کا آخری طاقتور بادشاہ

سلطان اورنگ زیب عالمگیر تھا جو سلطنت کی وسعت، فتوحات کی کثرت، شرع اور دینداری اور دینی علم اور واقفیت میں ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے اورنگ زیب نے ۹۰ سال سے زائد عمر پائی اور مسلسل پچاس برس حکومت کی، اس کی وفات ۱۱۱۸ھ یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی، یہ زمانہ یورپ کی بیداری اور تعمیر و ترقی کا خاص دور ہے، لیکن بدقسمتی سے اورنگ زیب کے سب جانشین نااہل، پست ہمت اور عیش پسند نکلے، وہ یورپ کے خطرات کا مقابلہ اور امت اسلامیہ کی حفاظت کرنے کے اہل تو کیا ثابت ہوتے، اپنے ملک و سلطنت کی حفاظت بھی نہ کرسکے، اور بالآخر اپنی نااہلی، کمزوری اور نااتفاقی سے انگریزی حکومت کے قیام و استحکام انگلستان کی ترقی و تمول اور صنعتی انقلاب کا باعث ہوئے اور بالواسطہ اکثر اسلامی ممالک کی غلامی کا سبب بنے۔[۱]

[۱] برک ایڈمز اپنی کتاب قانون تہذیب وانحطاط کے ص ۲۶۴-۲۶۳ پر لکھتا ہے، "جنگ پلاسی کے بعد بنگال کا مال غنیمت لندن میں آنا شروع ہوا اور اس کا نتیجہ بھی بہت جلد رونما ہوا، اتنا بڑا صنعتی انقلاب جس کے اثرات آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں نمایاں ہیں شاید وجود ہی میں نہ آتا اگر پلاسی کی لڑائی نہ ہوئی ہوتی، کیونکہ ہندوستان ہی کا خزانہ اس کا محرک اور ممد ومعاون ہوا۔ (۲) جب ہندوستان کا خزانہ انگلستان پر اُنڈنا شروع ہوا اور سرمایہ میں اضافہ ہوا تو ایجادات کی تحریک میں بہت جلد ایک روح پیدا ہوگئی (۳) جب سے دنیا وجود میں آئی ہے شاید کبھی روپئے سے اتنا نفع حاصل نہیں ہوا جتنا ہندوستان کے مال غنیمت سے ہوا کیوں کہ پچاس برس تک انگلستان کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔

سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے۔ (باقی ص۲۲۸ پر ملاحظہ ہو)

دوسری بڑی مشرقی حکومت ایران کی صفوی سلطنت تھی جو ایک بڑی متمدن اور ترقی یافتہ سلطنت تھی۔
لیکن شیعیت کے غلو و تعصب اور ترکی حکومت سے نبرد آزمائی نے اس کو کسی اور کام کی فرصت نہ دی، اس کا بہترین
زمانہ (جو یورپ کی تعمیر و تنظیم کا تھا) کبھی ترکی حکومت کے حدود پر حملہ کرنے اور کبھی اپنی حفاظت و مدافعت میں گزر گیا۔
یہ دونوں سلطنتیں اپنے مسائل و معاملات میں ایسی الجھی ہوئی تھیں اور بیرونی دنیا سے اتنی بے تعلق و
بے خبر تھیں کہ ان کو یورپ اور دور دراز کے ممالک تو الگ رہے مشرق اوسط اور اسلامی ممالک کے حالات و
واقعات کی خبر نہ تھی، دوسری اسلامی سلطنتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور معاہدے اور پورے اسلامی
ممالک کا اتحاد قائم کرنے کا مسئلہ تو شاید ان حکومتوں کے ذمہ داروں کے کبھی خیال میں بھی یہ بات
نہیں آتی تھی، نہ مشرق کی شخصی حکومتوں سے امید ہو سکتی تھی، یورپ کے تعلیمی اور جنگی حالات کا مطالعہ اور
بیرونی ممالک سے علمی و صنعتی استفادہ تو بہت دور کی بات تھی جس کی طرف کسی کا خیال جانا بھی مشکل تھا۔

اولوالعزم افراد

اس دور خزاں میں بھی اسلام کا درخت برگ و بار لاتا رہا اور خزاں میں اس
نے بعض ایسے پھول اور پھل پیدا کئے جن کی مثال موسم بہار میں بھی بکثرت نہیں ملتی اور جن کی
نظیر سے دوسری قوموں کی تاریخ خالی ہے، یہ دور قومی انحطاط و اضمحلال لیکن انفرادی عزیمت اور
شخصی جد و جہد کا دور نظر آتا ہے، متعدد ممالک میں ایسے صاحب عزم، بلند حوصلہ اور بیدار مغز قائد اور
مجاہد پیدا ہوئے جنہوں نے ان آمادۂ زوال اور بر سر انحطاط قوموں اور ملکوں میں کچھ عرصہ کے
لئے نئی زندگی پیدا کر دی، ہندوستان میں سلطان ٹیپو جیسا عالی ہمت، بلند نظر اور شیر دل قائد پیدا
ہوا جو قریب تھا کہ ہندوستان کو غیر ملکی خطرات سے پاک کر دے، دوسری طرف حضرت سید احمد شہید جیسا
صاحب عزیمت اور صاحب تاثیر داعی اور مجاہد پیدا ہوا جو خلافت راشدہ کے اصول و منہاج پر پہلی اسلامی

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) "پلاسی کی لڑائی سے پہلے جب تک ہندوستان کے خزانے ڈھل ڈھل کر
انگلستان نہیں گئے تھے ملک کا ستارہ عروج پر نہیں تھا (یہ حقیقت ہے) کہ انگلستان کی
صنعتی ترقی بنگال کی بے شمار دولت اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی۔" (ہمرو دیگلورں)

حکومت قائم کرنا چاہتا تھا جس کا حلقہ ہندوستان سے بخارا تک وسیع ہو، اس کی دعوت و تربیت نے ہزاروں کی تعداد میں ایسے بلند سیرت، مجاہد حوصلہ ایثار پیشہ داعی اور سپاہی پیدا کر دیئے جنھوں نے اپنے ایمان و یقین، للہیت و خلوص، اور دینی جوش و حمیت سے "قرون اولیٰ" کی یاد تازہ کر دی، لیکن قومی انحطاط اجتماعی پراگندگی اور بے نظمی، اور سیاسی بے شعوری اس درجہ کو پہونچ چکی تھی کہ ایسی عظیم اور طاقتور شخصیتیں بھی مسلمانوں کے حالات اور اُن کے تنزل و انحطاط کی رفتار میں کوئی بڑی تبدیلی نہ پیدا کر سکیں، اور اُمت بحیثیت مجموعی ان مجاہدانہ اور تجدیدی کوششوں سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔

یورپ کی صنعتی وطبعیاتی ترقیاں

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی پہلے ترک تنزل و انحطاط، علمی پسماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے، تاریخ انسانی کا یہ وہ اہم ترین عہد ہے جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے، یورپ اس میں اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا اور ایک جوش و جنون کی حالت میں اُٹھ کر غفلت اور جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا، وہ ہر شعبۂ حیات میں گریزپا ترقی کر رہا تھا، طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اثرات کو منکشف اور نامعلوم سمندروں اور اقلیموں کو دریافت کر رہا تھا، ہر علم و فن میں اسکی فتوحات اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسکے اکتشافات جاری تھے، اس مختصر سی مدت میں اُسکے یہاں ہر علم میں بڑے بڑے محقق، موجد اور مجتہد فن پیدا ہوئے، کوپرنیکس (Copernicus) برونو (Brunoe) گلیلیو (Gallio) کیپلر (Kepler) اور نیوٹن (Newton) جو

عالم اور محقق تھے جنھوں نے ہیئت وطبعیات کا ایک جدید نظام پیدا کردیا، سیاحوں اور جہاز رانوں میں کلمبس (Columbus)واسکوڈی گاما Vasco daGama اور میگلن (Maglin) جیسے عالی ہمت اولوالعزم پیدا ہوئے، جنھوں نے نئی دنیا اور نامعلوم ممالک دریافت کئے۔

قوموں کی تاریخ اس دور میں نئے سرے ڈھل رہی تھی، اس زمانہ کا ایک ایک لمحہ کئی کئی دن اور ایک ایک دن کئی کئی برس کے برابر تھا جس نے فرصت وتیاری کا ایک لمحہ کھودیا اس نے ایک طویل زمانہ ضائع کردیا افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت لمحات ضائع نہیں کئے بلکہ صدیاں ضائع کیں اور یورپین قوموں نے ایک ایک منٹ اور ایک سکنڈ کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا اور صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کی۔

علم وصنعت کے میدان میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہو کہ سولھویں صدی ہجری سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع نہیں ہوئی تھی اٹھارویں صدی عیسوی میں ترکی پریس ومطابع حفظان صحت کے مراکز اور فوجی تعلیم کے نئے طرز کے مدارس سے روشناس ہوا، اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دار السلطنت پر ایک غبارہ (BaLooN)کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے، نہ صرف یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ترکی سے اس میدان میں بازی لے جاچکی تھیں بلکہ مصر بھی بعض مفید نئی چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کرچکا تھا ترکی سے چار سال پہلے مصر میں

ریلوے کا نظام قائم ہو چکا تھا، ڈاک کے ٹکٹ بھی ترکی سے چند مہینے پہلے مصر میں رائج ہو چکے تھے[1]

جب ترکی کا یہ حال تھا جو عالم اسلام کا قائد تھا تو دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کا جو ترکی کے زیر اثر یا دست نگر تھے جو کچھ حال ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چھوٹی چھوٹی نئی صنعتیں بھی ابھی ان ملکوں میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھیں، ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی (Volney جس نے ۱۸ویں صدی میں مصر کی سیر کی ہو اور شام میں چار سال تک مقیم رہا ہے) اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہیں کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہو جائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا۔"[2]

پھر مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت و علوم نظریہ اور صنعت و حرفت ہی میں نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عمومی انحطاط تھا جو مسلمانوں پر پورے طور پر محیط تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے فنون جنگ میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے، جن میں ترکوں کو درجۂ امامت و اجتہاد حاصل تھا اور ان میں ان کی فوقیت کا دنیا کو اعتراف تھا، لیکن یورپ اپنی ایجاد و اجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنون حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت بڑھ گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی اور دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ ترک جنگی طاقت میں یورپ کی عیسائی قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں، اس واقعہ سے

---

[1] نئی ایجادات کی تاریخ مطبوعہ دار الہلال مصر۔

[2] زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث (ڈاکٹر احمد امین) ص ۲

حکومت عثمانی کی کچھ آنکھیں کھلیں، اور اس نے چند یورپین ماہرین فن کی خدمات حاصل کرکے تدریج کی از سر نو تنظیم و تربیت کا کام شروع کیا، لیکن اصلاح و ترقی کا اصل قدم سلطان سلیم ثالث نے (جس کی قصر شاہی سے باہر تعلیم و تربیت ہوئی تھی) انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا، نئے طرز کے مدارس قائم کئے جن میں سے انجینئرنگ کالج میں وہ خود تعلیم دیتا تھا، نظام جدید کے نام سے ایک نئی فوج کی بنیاد بھی ڈالی اور سیاسی نظام میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں، لیکن قوم اور سلطنت کے جمود کا یہ حال تھا کہ پرانی فوج نے بلوہ کرکے سلطان کو قتل کر ڈالا، اس اصلاحی مہم میں محمود ثانی (جس نے ۱۸۰۸ء سے ۱۸۳۹ء تک حکومت کی) اور اسکے بعد عبد المجید اوّل (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء) نے جانشینی کی اور ترکی نے ترقی کے کچھ قدم بڑھائے۔

ترقی کے میدان میں مسلمان ترکی نے جو فاصلہ طے کیا ذرا اس کا مقابلہ اس فاصلہ سے کیجئے جو یورپ نے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں طے کیا، ترقی کے میدان میں ان دونوں کی دوڑ میں کچھوے اور خرگوش کا مقابلہ تھا، فرق اتنا ہے کہ خرگوش برابر بیدار اور مشغول تھا اور کچھوا اپنی سست رفتاری کے باوجود کبھی کبھی سو بھی جاتا تھا۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مراکش، الجزائر، مصر، ہندوستان، اور ترکستان میں مشرق کی مسلمان اقوام اور مغربی قوموں اور طاقتوں کے درمیان جو معرکے پیش آئے ان کا فیصلہ دراصل سولھویں اور سترھویں صدی میں ہو گیا تھا، اور اسی وقت اُن کے نتیجہ کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔

باب پنجم

بین الاقوامی سیادت و قیادت کا مغربی عہد

اور اسکے اثرات

ترکوں کے تنزل و انحطاط سے عالمگیر طاقت و اقتدار، اور ذہنی اور تہذیبی قیادت یورپ کی غیر مسلم قوموں کی طرف منتقل ہو گئی، جنھوں نے عرصۂ دراز سے اس کی تیاری کی تھی اور جن کی کوئی حریف مساوی درجہ کی طاقت میدان میں نہ تھی، مغرب سے مشرق تک کوئی ملک اُن کے اثر اور نفوذ سے خارج نہ رہا، قومیں یا تو مادی اور سیاسی حیثیت سے اُن کی غلام اور زیر فرمان تھیں، یا ذہنی علمی اور تہذیبی حیثیت سے زیر اثر اور زیر اقتدار تھیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان اثرات کا جائزہ لیں جو قیادت کے اس انتقال اور تبدیلی نے دنیا کی ذہنیت، قوموں کے اخلاق، تمدن و اجتماع، اور انسانی میلانات و رجحانات میں پیدا کیا، اور اس کا فیصلہ کریں کہ انسانیت کو اس انقلاب سے فائدہ پہونچا یا نقصان، یہ ضروری ہے کہ ہم مغربی تمدن کی فطرت، ساخت اور روح کو اور ان مؤثر قوموں کے فلسفۂ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ کیسے پیدا ہوا اور اس نے کس طرح نشو و نما حاصل کی۔

مغربی تہذیب کا شجرۂ نسب

بیسویں صدی کی مغربی تہذیب (جیسا کہ بعض سطحی النظر سمجھتے ہیں) کوئی ایسی نوعمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں ہوئی ہے درحقیقت اسکی تاریخ ہزاروں سال کی پرانی ہے اس کا نسبی تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے ہے، ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ، اور عقلی و علمی سرمایہ چھوڑا تھا اسکے حصہ میں آیا اسکے سارے رجحانات اور خصوصیات اس کو نسلاً بعد نسل منتقل ہوئے۔

یونانی تہذیب مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا واضح مظہر اور نمونہ تھی، یہ پہلا تمدن تھا جو خالص مغربی فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوا اور اس میں مغربی نفسیات کا پورے طور پر ظہور ہوا، یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی، جس میں ایک ہی مغربی روح کام کر رہی تھی، مغربی قومیں صدیوں تک ان دونوں تہذیبوں کی خصوصیات اور مزاج، اُن کے فلسفہ، علوم و ادب و افکار کو سینہ سے لگائے رہیں، انیسویں صدی میں انھیں خصوصیات کے ساتھ انھوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا، اس لباس کی چمک دمک سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔

اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم پہلے یونانی اور رومی تہذیب سے واقفیت پیدا کریں اور اُن کے مزاج اور روح کو پہچان لیں تاکہ ہم بصیرت کے ساتھ بیسویں صدی کی مغربی تہذیب کی تنقید کر سکیں۔

یونانی تہذیب

یونانی تہذیب کی تحلیل و تنقید کرنے سے ان اجزا کو نظرانداز کردینے کے بعد جو اصل نہیں بلکہ فرعیات اور مظاہر ہیں اور جو عام انسانی تہذیبوں کے درمیان مشترک ہیں اس کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے، اسکی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔

۲۔ خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی۔

۳۔ دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید۔

۴۔ حب وطن میں افراط و غلو۔

ہم ان متعدد اجزا اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اسکے لئے تنہا "مادیت" کا لفظ کافی ہے، پس یونانی تہذیب کا مابہ الامتیاز "مادیت" ہے۔ یونانیوں کا علم فلسفہ، شاعری، حتیٰ کہ دین، سب اُن کی مادی روح کی غمازی کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسکی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کرسکے، انھوں نے ان صفات کے بُت تراشے اور ان کے لئے معبد تعمیر کئے تاکہ محسوس طریقہ پر اُن سے تعلق رکھیں، ان کے ہاں ایک روزی کا دیوتا تھا، ایک رحمت کا اور ایک قہر و عذاب کا، پھر اُن کی طرف انھوں نے مادی جسم کے تمام خصوصیات اور متعلقات منسوب کئے اور اُن کے گرد قصے کہانیوں کا ایک جال پھیلا دیا، انھوں نے معانی مجردہ کو بھی اجسام واشکال کی شکل میں پیش کیا، چنانچہ ان کے نزدیک محبت کا ایک دیوتا تھا اور ایک حسن کا۔ ارسطو کے فلسفہ میں عقول عشرہ اور افلاک تسعہ

کا جو شجرہ ملتا ہے، وہ بھی اسی مادی عقلیت کا کرشمہ ہے جس کے اثر سے یونانی نظر کبھی آزاد نہیں ہونے پائی۔

مغربی علماء نے بھی یونانی تہذیب میں مادیت کے غلبہ کو تسلیم کیا ہو اور اپنی تصنیفات اور علمی مباحث میں اس کی طرف متوجہ کیا ہے، چند سال پہلے ڈاکٹر ہاس نے جنیوا میں "یورپی تمدن کیا ہے" کے عنوان سے تین لکچر دیئے تھے، ان کا ایک اقتباس خالدہ ادیب خانم کے توسط سے پیش کیا جاتا ہو:۔

"موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا اس کا اصل اصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ نشو ونما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے، جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی ڈراما، فلسفہ، سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی، ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پائی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہونچنے پائے، یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا عنصر ہو نہ باطنیت کا، نہ علم دین ہے نہ پیشوایان دین کا طبقہ۔"

متعدد مغربی فضلاء نے یونانیوں کی دینی کمزوری اور اسکی بے اثری خشیت وخوف اور مذہبی اعمال ورسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی کثرت کا ذکر کیا ہے، تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف "لیکی" لکھتا ہے کہ "یونانی تحریک تمام تر عقلی اور دماغی تھی بخلاف اسکے مصری تحریک یکسر روحانی وباطنی

تھی"۔ وہ رومی مصنف آپولیس کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "مصری دیوتاؤں کی عزت آہ وزاری سے تھی اور یونانی دیوتاؤں کی رقص و سرود سے" پھر خود کہتا ہے کہ "اس میں شبہ نہیں کہ اس مقولہ کے آخری جزء کی تصدیق تاریخ یونان میں قدم قدم پر ہوتی ہے، درحقیقت کسی مذہب کے مراسم میں جشن، کھیل اور تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی جتنی اس میں اور نہ کسی مذہب میں خوف و دہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے جتنا اس میں، اس مذہب میں خدا کا تقدس بس اسی درجہ کا تھا جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے اور اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لئے بالکل کافی تھا"[1]

لیکن یہ حقیقت قطعاً قابل استعجاب نہیں، مغرب کی مادہ پرست اور خوگر محسوسات فطرت و مزاج کے علاوہ یونانیوں کا فلسفۂ الٰہیات اور اسکے عقائد کی ساخت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی تھی کہ خشوع و خضوع انابت اور رجوع الی اللہ کی کیفیت اُن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی، ذات باری کے تمام صفات ہر قسم کے اختیار، فعل و تصرف اور خلق و امر کی نفی کرنے والے اس کو بالکل بے صفت اور معطل قرار دینے اور اس کائنات کی پیدائش و انتظام کو اپنے خود تراشیدہ اور مفروضہ عقل فعال کی طرف منسوب اور اس سے وابستہ کرنے کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی میں خدا کی کوئی ضرورت اور اس سے کوئی تعلق اور دلچسپی باقی نہ رہ جائے، نہ اس سے کوئی

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ از لیکی ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۰۹-۲۷۶

امید ہو اور نہ اس کا کوئی خوف، نہ دل میں اُس کی ہیبت ہو اور نہ محبت اور نہ ضرورت و مصیبت کے وقت اس سے دعا و التجا ہو، اس لئے کہ وہ اس فلسفہ کے مطابق ایک بالکل معزول و معطل ہستی ہے جس کو عالم میں تصرّف کرنے کا نہ کوئی اختیار ہے نہ طاقت، وہ عقل اوّل پیدا کر کے عالم سے بالکل بے تعلق و کنارہ کش ہو گیا ...... اس لئے اس عقیدہ کے ماننے والوں کی زندگی عملاً ایسی گزرتی ہے اور گزرنی چاہیئے کہ گویا خدا نہیں ہے، اور منکرین خدا کی زندگی سے سوائے اس تاریخی بیان کے کہ خدا نے عقل اوّل کو پیدا کیا ہے اور کسی حیثیت سے ممتاز نہیں، پس جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یونانیوں میں خشوع اور خضوع کی کمی تھی اور اُن کی عبادات اور مذہبی اعمال ایک قالب بے روح سے زیادہ نہ تھے اور وہ یہ کہ خدا کی بزرگوں سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے تو ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ تاریخ میں آدمی سیکڑوں متناموں اور موجدوں کا تذکرہ پڑھتا ہے لیکن کبھی ان کی طرف سے اسکے دل میں خشوع اور خضوع اور اُن سے بندگی کا ربط نہیں پیدا ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا جب خدا کو اس کائنات میں متصرف اور کارفرما اور اپنے کو اُس کا محتاج سمجھے۔

دنیوی زندگی کے انتہائی شوق و محبت اسکی قدر و قیمت میں افراط و غلو، مجسموں اور تصاویر کے شغف، سرود و موسیقی کے انہماک، فنون لطیفہ کی قدردانی، اور غیر محدود شخصی آزادی پر مبالغہ آمیز زور دینے سے یونانی اخلاق و معاشرت پر بڑا اثر پڑا، اخلاقی ابتری اور ہر نظام کے خلاف بغاوت

احتجاج روزمرّہ کا فیشن بن گیا، خواہشات نفس کی پیروی، زندگی سے زیادہ سے زیادہ تمتع اور لطف امروزی اور بوالہوسی، روشن خیالی اور آزادی کا نشان سمجھا جانے لگا، ستراط ایک جمہوری نوجوان کی سیرت اور طرز زندگی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے روشن خیال اور زندہ دل نوجوان کا سراپا اس سے ذرا مختلف نہیں معلوم ہوتا۔

"اگر اس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے سارے شوق اور خواہشات یکساں قابل احترام اور تعمیل کے لائق نہیں، بعض خواہشات پسندیدہ اور لائق احترام ہیں اور ان کی تکمیل و تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں اور بعض ناروا اور ناپسندیدہ، ان سے اجتناب ہی بہتر ہے، اور ان پر پابندی اور بندش عائد کرنا ضروری ہے، وہ شخص اس صحیح قانون کو قبول نہیں کرتا اور اسکے سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا جب اُس کے سامنے یہ معقول باتیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ تمسخر کے ساتھ اپنا سر ہلاتا ہے اور بڑے زور کے ساتھ یہ تقریر کرتا ہے کہ انسان کی تمام خواہشات اور اسکے سارے شوق یکساں قابل احترام ہیں، اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی بھی گزارتا ہے اور اپنے تمام خواہشات نفس کی تسکین اور اپنے ہر شوق کی تکمیل کرتا رہتا ہے اور جس وقت اس کا جس بات کا جی چاہتا ہے کر گزرتا ہے، کبھی وہ مدہوش و بدمست نغمہ و سرود میں مشغول ملے گا، اور کبھی اس کو خیال کا کھانا

تربیت رکھ کر صرف پانی پینے پر اکتفا کرے گا کبھی فوجی تربیت اور قواعد سیکھتا ہوا نظر آئے گا، کبھی بالکل بیکار اور سست دکھائی دے گا اور ہر چیز کو بالائے طاق رکھدے گا، کبھی فلسفیانہ زندگی بسر کرنے لگے گا، دوسرے وقت میں سیاسی زندگی میں شریک ہو جائے گا اور وقت کے تقاضہ کے مطابق تقریر کرتا ہوا سنا جائے گا، کبھی فوجی لوگوں کی تعریف کرنے لگے گا اور ان کی طرف اس کا میلان پیدا ہو جائے گا۔ کبھی کامیاب تاجر پر رشک کر کے تجارت شروع کر دے گا، غرض اسکی زندگی کا کوئی نظام اور ضابطہ نہیں۔ لطف یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو بہت پر لطف اور خوشگوار اور آزاد کہتا ہے اور آخر تک اسی طرز پر زندگی گزارتا ہے[1]"

مغربی فطرت اور مزاج کا ایک خاصہ وطن پرستی ہے، ایشیا کے مقابلہ میں وطنیت کا جذبہ یورپ میں زیادہ قوی اور عام ہے اس میں کچھ جغرافیائی حیثیت کا بھی دخل ہے، ایشیا میں طبعی علاقے زیادہ وسیع، مختلف قسم کی آب و ہوا، پہاڑ اور انسانی کی مختلف قسموں پر مشتمل ہیں، وہ زیادہ زرخیز ہیں اور زندگی کے وسائل کی ان میں فراوانی ہے، اس بنا پر براعظم ایشیا میں مملکت کا میلان فطری طور پر وسعت اور عمومیت کی طرف ہے، اور

---

[1] "ریاست" از افلاطون

اس کی سرزمین میں دُنیا کی وسیع ترین سلطنتیں قائم ہوئیں، اسکے برخلاف یورپ میں زندگی کی کش مکش تنازع البقا شدید اور مسلسل طریقہ پر پائی جاتی ہے، اس کی آبادی گنجان، علاقے تنگ، اور وسائل معیشت محدود ہیں، پہاڑوں اور دریاؤں کی طبعی سرحدوں نے مغربی اقوام کو مستقل تنگ فطری دائروں میں محصور کر دیا ہے، خصوصاً یورپ کا وسطی مغربی اور جنوبی حصہ وسیع ریاستوں کے نشو ونما کے لئے موزوں نہیں، اس لئے قدیم یورپ میں کبھی سیاسی تصور شہری ریاستوں سے آگے نہیں بڑھ سکا، جن کا رقبہ چند میل سے زیادہ وسیع نہیں ہوتا تھا، لیکن وہ بالکل خود مختار ہوتی تھیں، اس کا سب سے بڑا نمونہ یونان میں ملتا ہے جہاں قدیم ترین عہد سے بیسوں چھوٹے چھوٹے خود مختار شہروں کا تذکرہ ملتا ہے

اس بنا پر یہ بات قابل استعجاب نہیں کہ یونانی، وطنیت پر محکم ایمان رکھتے تھے، لیکی تسلیم کرتا ہے کہ یونان میں وطنیت ہی کا غلبہ تھا اور جہانیت یا آفاقیت جس کے متعلق کبھی سقراط اور انکسا غورس نے اظہار خیال کیا ہے کوئی مقبول خیال اور مذہب نہیں تھا اور اسکے حامی یونان میں نہیں تھے، ارسطو کا سارا نظام اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے، اجماع حکماء سے فضائل اخلاق کی جو فہرست تیار کی گئی تھی اس کا عنوان اولین حب الوطنی تھا، ارسطو اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے، جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں، اس طرز خیال کا یونانی حلقوں میں اتنا اثر اور غلبہ ہو گیا تھا کہ جب ایک فلاسفر نے یہ کہا کہ میری

ہمدردیوں کا حلقہ صرف میسکر ذاتی وطن تک محدود نہیں بلکہ سارے یونان پر محیط ہے تو لوگ حیرت و استعجاب کے ساتھ اسکی طرف دیکھنے لگے[1]

رومی تہذیب

یونانیوں کے جانشین رومی ہوئے اور قوت، حکمت کی تنظیم، سلطنت کی وسعت، اور عسکری صفات میں ان سے فوقیت لے گئے، لیکن علم و فلسفہ، ادب و شاعری، تہذیب و شائستگی اور تمدن میں وہ یونانیوں کے درجہ کو نہیں پہونچ سکے، ان چیزوں میں یونانیوں کا سکہ تمام دنیا پر اور خود فاتح رومیوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، رومی ابھی نپے عسکری دور میں تھے، اس لئے انھوں نے طبعی طور پر ذہنی کمالات اور لطافت و نفاست کی باتوں میں یونانیوں ہی کو اپنا امام تسلیم کیا اور انھیں کے علوم فلسفہ اور خیالات کی خوشہ چینی کی، لیکی لکھتا ہے کہ "یونانی اپنا گرانقدر علم ادب صدہا سال سے رکھتے آئے تھے دراں حالیکہ روما دور عسکریت میں تھا جو ادب کا شائبہ تک نہیں رکھتا تھا، بلکہ جس کی زبان تک ادائے مطلب و خیالات عالیہ کی ترجمانی میں قاصر تھی، روما کی اس علمی پستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یونانی تمدن سے مغلوب ہو جائے اور ہر شعبہ علم میں اس سے مرعوب رہے، چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ قدیم ترین رومی مورخین یونانی ہی زبان میں تصنیف کرتے تھے اور یہ دستور عرصۂ دراز تک قائم رہا اور اگیلی تصانیف اور تالیف پر کیا موقوف ہے، اطوار و خصال، طرز معاشرت، جذبات و احساسات، غرض ہر شعبہ

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ صد ۱۶۲ و ۱۸۶

حیات میں یونانی تمدن رومی تمدن پر غالب آگیا رومی بلا تکلف یونانیوں کی تقلید کرتے تھے اور اس تقلید پر فخر کرتے تھے۔[ل]

اس طرح علم و ادب اور عادات و اخلاق کے ذریعہ یونانی قوم کا فلسفہ اور کلچر بلکہ یونانی نفسیات رومیوں میں منتقل ہوگئی اور ان کے رگ و پے میں پیوست ہوگئی، یوں بھی رومی اپنی مغربی فطرت و مزاج کی وجہ سے فطری خصوصیات میں کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں دونوں کے درمیان بڑی حد تک مشابہت تھی، محسوسات پر رومی بھی یقین کرنے کے عادی تھے، زندگی کی قدر و قیمت میں یہاں بھی اتنا ہی غلو اور افراط تھا۔ دینی عقائد و حقائق کے بارہ میں یہ بھی بہت ضعیف الایمان اور آزاد خیال تھے مذہبی نظام اور مذہبی اعمال و رسوم کا کوئی خاص احترام اور وقار نہ تھا، قومیت اور وطنیت میں یہاں بھی شدت اور مبالغہ پایا جاتا تھا، مزید یہ کہ طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ کو پہونچا ہوا تھا۔

رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی اپنے مذہب و عقائد میں راسخ الایمان نہ تھے اور درحقیقت وہ اس بارہ میں معذور بھی ہیں اسلئے کہ جو مشرکانہ اور وہم پرستانہ مذہب روم میں رائج تھا اس کا مقتضا یہ تھا کہ رومی علم میں جس قدر ترقی کرتے جائیں اور ان کے دماغ روشن ہوجائیں اتنی ہی اس مذہب کی بے توقیری اور اسکی عظمت میں کمی واقع ہوجائے اور یہ تو گویا انھوں نے

ل۔ تاریخ اخلاق یورپ ص ۲۰۲

پہلے ہی دن سے طے کرلیا تھا کہ دیوتاؤں کو سیاست و امورِ دنیا سے کوئی تعلق نہیں، سسرو (Cicero.) بیان کرتا ہے کہ تھیٹر میں جب اس مضمون کے اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں تو لوگ انھیں نہایت ذوق و شوق سے سنتے[1] ...... سینٹ آگسٹائن (S. AUGASTINE) وغیرہ حیرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ "یہ رومن بُت پرست مندروں میں تو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور تھیٹروں میں انکے ساتھ تمسخر کرتے تھے[2]" رومی مذہب کی گرفت اپنے پیروؤں پر اتنی ڈھیلی ہوگئی تھی اور جذبۂ مذہبی اتنا سرد پڑ چکا تھا کہ لوگ بعض اوقات دیوتاؤں کے ساتھ بے ادبی اور اشتعال میں آکر گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے، لیکی لکھتا ہے کہ مذہب کا اخلاقی اثر تقریباً بالکل فنا ہوگیا، جذبۂ تقدس تقریباً مٹ گیا اور اسکے مظاہر ہر شخص کو نظر آنے لگے چنانچہ جب آگسٹس (Augustus) کا بیڑہ غرق ہوگیا تو اس نے غصہ میں آکر نیپچون (Neptune) (سمندر کے دیوتا) کے بُت کو مسمار کردیا، جب جرمینکس (Iermanieus) کا انتقال ہوا تو لوگوں نے دیوتاؤں کے قربان گاہوں پر خوب پتھراؤ کیا[3]"

رومی قوم کے اخلاق، سیاست اور معاشرے میں مذہب کا کوئی اثر اور ان کے احساس اور میلانات پر اس کا کوئی اقتدار و نگرانی باقی نہیں رہی

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ ص۱۲۷ [2] ایضاً ص۱۳۱ [3] ایضاً ص۱۲۷

تھی، مذہب میں کوئی گہرائی اور قوت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ دل کی گہرائی سے ابھرتا اور روح پر حکومت کرتا، وہ محض ایک رسم ورواج بن کر رہ گیا تھا، سیاست ومصلحت کا تقاضا تھا کہ خواہ وہ برائے نام ہی سہی لیکن کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے۔ لیکی لکھتا ہے " رومی مذہب کی اصل بنا خودغرضی پر تھی، اس کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ افراد مرفہ الحال رہیں اور صعوبات اور مصائب سے محفوظ رہیں، چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ روم میں گو صدہا بیرد رجانباز پیدا ہوئے لیکن نفس کش زاہد ایک بھی نہ اٹھا۔ یہاں ایثار کی جو بہتر سے بہتر مثالیں ملتی ہیں وہ بھی مذہب کے اثر سے آزاد اور وطن پرستی پر مبنی تھیں"[1]

رومیوں کا ایک بڑا امتیاز وخصوصیت ان کی شاہنشاہیت پسندی اور استعماری روح اور زندگی کا خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نگاہ ہے، یہی وہ ترکہ ہے جو موجودہ یورپ کو اپنے رومی مورثوں سے ملا ہے، جرمن نومسلم عالم محمد اسد صاحب نے اپنی کتاب (Islam at the Cross Roads) میں اس کا بڑی خوبی سے تذکرہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

" رومی شہنشاہی پر جو خاص خیال حاوی تھا وہ محض ملک گیری کا خیال اور مادر وطن کے لئے دوسری قوموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لوٹ کھسوٹ کرنا تھا، رومی رؤسا وامراء اور اونچے طبقہ کے لوگ اپنے لئے فارغ البالی اور امارت کی زندگی کا سامان

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ صفحہ ۱۳۶

حاصل کرنے کے لئے کسی ظلم وبے دردی کو عیب نہیں سمجھتے تھے، باقی وہ رومی انصاف جس کا بڑا شہرہ ہے وہ محض رومیوں کے لئے تھا، بخصوص سیرت، اور کیرکٹر زندگی اور تمدن کے محض مادی تصور ہی پر قائم ہوسکتا تھا، اگرچہ ان کی مادیت میں کچھ آراستگی اور لطافت ذوق پیدا ہوگئی تھی لیکن تمام روحانی قدروں سے وہ بالکل بیگانہ تھی، رومیوں نے کبھی بھی سنجیدگی اور واقعیت کے ساتھ دینداری اختیار نہیں کی تھی، ان کے تقلیدی دیوتا محض یونانی حکایات وخرافات کی پھیکی نقل تھے، انھوں نے محض اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور قومی وحدت کے خیال سے ان ارواح کو تسلیم کرلیا تھا وہ ان دیوتاؤں کو اپنی عملی زندگی میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کا کام صرف اتنا تھا کہ جب ان سے فرمائش کی جائے تو اپنے مجاوروں کی زبانی پیشین گوئیاں کردیں، لیکن ان کو انھوں نے یہ حق کبھی نہیں دیا تھا کہ وہ لوگوں پر اخلاقی قوانین نافذ کریں۔[1]

جمہوری دور کے آخر میں روم میں اخلاقی انحطاط اور حیوانی ہوس رانی اور تعیش کا ایسا سیلاب آیا کہ رومی اس میں بالکل ڈوب گئے اور وہ اخلاقی نظام وضوابط جو رومی قوم کی ابتدائی خصوصیت تھی خس وخاشاک کی طرح

---

[1] ص ۳۸-۳۹

بہہ گئے، اجتماع اور معاشرت کی عمارت میں ایسا تزلزل آیا کہ قریب تھا کہ وہ زمین پر آرہے، "ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی مشہور کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" میں اسی کی قلمی تصویر کھینچی ہے، وہ لکھتا ہے :-

"جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما انتہائے ترقی پر فائز ہوگئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اسکی اخلاقی حالت فساد کے درجۂ اخیر کو پہونچ چکی تھی، اہل روما کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی، اُن کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ زندگی کو ایک سلسلۂ العیش بنادے، پاک بازی، حفظ نفس کے خوان نعمت پر بمنزلہ نمکدان ہے اور اعتدال سلسلۂ حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے، ان کے دسترخوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچہ کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے، ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے اُن کی خدمت کے لئے کمربستہ کھڑے رہتے تھے، ماہرویان روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لئے موجود رہتی تھیں، عالی شان حماموں، دل کشا تماشہ گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے

خاک و خون میں سونہ جائے، اہلِ روما کے سامانِ تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا، دُنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شئے ہے تو وہ قوت ہے، اس لئے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال اور املاک کی ضبطی، صوبہ جات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے، اور فرمانروائے دولت روما اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے، غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی، لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا[1]

عیسائیت کی آمد اور رومیوں کا قبول مسیحیت

ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ جس کی اہمیت کو کوئی مورخ نظر انداز نہیں کرسکتا، عیسائیت کا بُت پرست روما کے تخت سلطنت پر فائز ہوجانا ہے، یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ قسطنطین جس نے مسیحیت قبول کرلی تھی ۳۰۵ء میں شہنشاہان روما کے تخت پر پہنچا اور اس طرح سے مسیحیت نے قدیم بُت پرستی پر فتح پائی اور دفعۃً اس کو ایسی وسیع سلطنت اور غیر محدود اختیار و اقتدار

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس مترجمہ مولوی ظفر علی خاں ص ۴۹-۵۰

حاصل ہو گیا جس کا وہ خواب نہیں دیکھ سکتی تھی، چونکہ قسطنطین کو عیسائیوں کی سرفروشی، فداکاری اور زبردست قربانیوں سے تخت سلطنت ہاتھ آیا تھا اس لئے اس نے عیسائیوں کو اس کا پورا صلہ دیا اور سلطنت میں پورے طور پر شریک کیا۔

مسیحیت میں بُت پرستی کی آمیزش

لیکن حقیقۃً مذہب عیسوی کے لئے یہ ایک بڑا نامبارک واقعہ تھا اس نے عظیم الشان سلطنت تو حاصل کرلی لیکن بڑی قیمتی مذہبی متاع کھو دی، عیسائی میدان جنگ میں تو فتح یاب ہوئے لیکن مذاہب وادیان کے معرکہ میں انھوں نے شکست کھائی رومی بُت پرستوں اور خود عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا، اس میں سب سے بڑا ہاتھ خود مسیحیت کے محافظ ناموس، اور علم بردار اعظم قسطنطین کا ہے، ڈریپر لکھتا ہے:۔

"فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیادار لوگ جنھیں مذہب کی خس برابر بھی پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہو گئے چونکہ وہ بظاہر عیسائی، لیکن بباطن مشرک و بُت پرست تھے، لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بُت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی، قسطنطین نے کہ وہ بھی انھیں کا ہم مشرب تھا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا سدّباب ہو، قسطنطین

کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جاکر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔[1]

اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے گون کا سمجھا اسے تخت پر بٹھا دیا، لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی نہ حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصال کلی کرسکے، دونوں کی باہمی کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر وشکر ہوگئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا، جس میں بت پرستی وعیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں، عیسائیت اور اسلام میں اس بارہ میں یہ بڑا فرق ہے کہ اسلام نے اپنے مدمقابل کو مطلقاً نیست ونابود کردیا اور اپنے عقائد کو بلا کسی آمیزش کے شائع کیا۔

اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت رکھتے تھے اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ جہاں تک ہوسکے ان میں یگانگت و ارتباط پیدا کیا جائے اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک

---

[1] معرکۂ مذہب وسائنس ص۵۲، ۵۴

کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا اس لئے کہ شاید
یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا
گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار رکجا ستوں
کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔[1]

بُت پرستی اور مسیحیت کا یہ معجون مرکب جس سے کسی مذہب کی رُوح اور اس کا حُسن نکل چکا تھا، اس لائق نہ تھا کہ رومیوں کی یہ پُر انحطاط سیرت و اخلاق کو سنبھال سکے اور ان میں پاک صاف مذہبی زندگی کی رُوح پھونک سکے، اور رومیوں کی تاریخ میں اور بالواسطہ دنیا کی تاریخ میں ایک نئے تابناک عہد کا آغاز کر سکے، اس کے برخلاف اس نے رہبانیت کی بدعت نکالی جو شاید انسانیت و تمدن کے حق میں بُت پرست روما کی حیوانیت سے زیادہ وبال جان تھی، یورپ کی مادہ پرستی اور لادینیت میں اس مروم آزار، اور آدم بیزار دشمن فطرت رہبانیت کو بہت کچھ دخل ہے اسلئے کچھ تفصیل کے ساتھ اسکے تذکرہ کی ضرورت ہے۔

جنون رہبانیت

رہبانیت میں اتنا غلو، اور افراط پیدا ہو گیا تھا کہ اس زمانہ میں اس کا قیاس کرنا بھی مشکل ہے، تاریخ اخلاق یورپ سے اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

راہبوں اور زاہدوں کی مجموعی تعداد مورخین کے اختلاف بیان کی

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس صـ ۶۳

وجہ سے قطعی طور پر نہیں بتائی جا سکتی تاہم ان کی کثرت اور تحریک رہبانیت کی اشاعت و مقبولیت کا اندازہ اعداد ذیل سے ہو سکتا ہے، سینٹ جردم کے زمانہ میں ایسٹر کی تقریب پر تقریباً پچاس ہزار راہبوں کا مجمع ہوتا تھا، چوتھی صدی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے، سینٹ سراپین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے اور چوتھی صدی کے خاتمہ پر تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں اور راہبوں کی تھی، دو چار سال نہیں کوئی پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی، مورخین نے اسکی بڑی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں، سینٹ میکریس اسکندری کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کئے تاکہ اُن کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں، نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے، ان کے مرید سینٹ یوسیبس تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنویں کے اندر مقیم رہے، ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ متصل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے ایک مدت میں ایک لمحہ کے لئے کبھی نہ بیٹھے نہ لیٹے، جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے، بعض زاہد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے، ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے تھے، راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے، بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے، اہل زہد کا ایک

طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا، جسم کی طہارت، روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مرتبہ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ مجسمۂ عفونت وغلاظت ہوتے، سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انٹونی، بایں کبرسنی کبھی مدت العمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا مرتکب نہیں ہوا، سینٹ ابراہام نے پنجاہ سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرہ یا پیر پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی، راہب الگزنڈر بڑے تاسف اور تحسر سے فرماتے ہیں کہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منھ دھونا حرام جانتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں، راہب مقلوں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا جو اولاد انھیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہوجاتی تھی اسکے نام پر پبلک میں ہر طرف سے داد و داد ہوتی تھی پہلے جو اثر و اقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا وہ اب پادری لوگوں درماہبوں کی طرف منتقل ہوگیا، پادری رہبانیت کے لئے لڑکوں کا اغوا کرتے تھے، سینٹ ایمبروز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اُسے دیکھ کر مائیں اپنے اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند کر دیتی تھیں، تحریک رہبانیت کا اخلاقی نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی وجوانمردی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر معیوب قرار پاگئے مثلاً زندہ دلی، خوش طبعی، صاف گوئی، فیاضی، شجاعت جرأت کہ عابدان مرتاض کبھی اُن کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے، دوسرا اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشرت کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں

اور دلوں سے اعزا کا احترام و ادب کافور ہوگیا، اس زمانہ میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزا کے ساتھ قساوت قلبی کی جو کثرت سے نظیریں ملتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، یہ زاہدان صحرا اور عابدان مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے تھے، بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انھیں بے والی وارث محض دوسروں کے ٹکڑوں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے، ان کا مقصود زندگی تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اخروی حاصل ہو، انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین جئیں یا مریں، لیکی نے اس سلسلہ میں جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر آج بھی آنسو نکل آتے ہیں، عورتوں کے سایہ سے وہ بھاگتے تھے، ان کا سایہ پڑجانے سے اور راستہ گلی میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد و ریاضت کی کمائی خاک میں مل جاتی ہے، اپنی ماؤں، بیویوں اور حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی وہ معصیت کبیرہ سمجھتے تھے، لیکی نے اس سلسلہ کے جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر کبھی ہنسی آتی ہے کبھی رونا۔

فطرت دشمنی کا اثر اخلاق و تمدن پر

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس انتہا پسند رہبانیت نے رومیوں کی مادیت کے غلو اور شدت میں اور ان کی بے پناہ خواہشات پرستی میں کچھ اعتدال و تخفیف پیدا کر دی ہوگی، ایسا عموماً نہیں ہوتا، یہ بات فطرت انسانی کے خلاف ہے اور مذاہب و اخلاق کا تجربہ بھی اسکے برخلاف ہے، در اصل جو چیز سرکش مادیت میں اعتدال پیدا کرکے اس کو ایک معتدل زندگی میں تبدیل کر سکتی ہے

وہ صرف ایسا روحانی دینی و اخلاقی، حکیمانہ نظام ہے جو انسان کی فطرتِ سلیم کے عین مطابق ہو اور اس بات کے درپے نہ ہو کہ وہ فطرت کو بالکل تبدیل کر دے، اس کا مقصد اس کا ازالہ (مٹا دینا) نہ ہو بلکہ امالہ (پھیر دینا) ہو، وہ اس کا رُخ شر سے خیر کی طرف تبدیل کر دے، اسلام کا طرزِ عمل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ مبارک یہی ہے، عرب بہادر و جنگجو تھے، آپ نے ان کی شجاعت کو سرد نہیں کیا بلکہ صرف قبائلی خانہ جنگی اور جاہلی جذبۂ انتقام سے اُس کو موڑ کر جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف پھیر دیا، عرب فیاض اور عالی حوصلہ تھے، لیکن اُن کی فیاضی اور عالی حوصلگی فخر و ناموری میں صرف ہوتی تھی، آپ نے اس کو راہِ خدا میں خرچ کرنے پر لگا دیا، غرض یہ کہ آپ نے اُن کے جاہلی خصائص و اخلاق کو اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا اور ان کو مفید اور کار آمد بنا دیا، آپ نے جاہلیت کے بجائے اسلام کا پورا نظام اور ہر چیز کا بدل (اور نعم البدل) عطا فرمایا، جائز اور تفریح کے مواقع بھی عطا فرمائے، اسلئے کہ بقول ایک جلیل القدر عالم (شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ) کے "انسانی طبیعتیں ہمیشہ کسی چیز کو اسی وقت دست بردار ہوتی ہیں جب اُن کو اس کا بدل ملتا ہو، انسان فطرتاً کچھ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اسکی فطرت کا تقاضا عمل اور مشغولیت ہے کلیۃً بیکار اور معطل ہو جانا اسکی فطرت کے خلاف ہے۔[1] انبیاء کرام تبدیلِ فطرت کے لئے نہیں بلکہ تکمیل فطرت کے

[1] کتاب اقتضاء الصراط المستقیم صد ۱۴۲!

لئے مبعوث ہوتے ہیں"[۵۱] حدیث و سیرت میں اسکی متعدد نظیریں ملیں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت اہل مدینہ کے دو تہوار تھے جن میں وہ تفریح کرتے تھے، آپنے دریافت فرمایا کہ یہ کیسے دو دن ہیں، لوگوں نے کہا کہ ہم ایام جاہلیت میں ان میں تفریح کرتے تھے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں، عید الاضحیٰ و عید الفطر،[۵۲] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عید کے دن ایک مرتبہ میرے پاس انصار کی دو لڑکیاں وہ گیتیں گا رہی تھیں جو بعاث کی جنگ میں کہی گئی تھیں اور وہ کچھ گانے والی نہ تھیں، اتنے میں حضرت ابوبکر تشریف لائے، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں شیطان کی گیتیں ہو رہی ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکرؓ ہر قوم کی ایک عید ہے اور یہ ہماری عید ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ ابوبکر جانے دو یہ عید کے دن ہیں[۵۳]

اس کے برخلاف رومی عیسائیت نے بیکار فطرت کو تبدیل اور فنا کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور ایسا نظام پیش کیا جس کی فطرت متحمل نہیں ہو سکی، اس نے انسان کی طاقت سے زیادہ انسان پر بوجھ ڈالا، روم کی سابقہ انتہائی مادیت کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر لوگوں نے طوعاً و کرہاً اس کو برداشت کیا لیکن جلد ہی اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور دبی ہوئی مظلوم فطرت نے

---

۵۱ کتاب النبوات از امام ابن تیمیہؒ ۵۲ ابو داؤد، احمد، نسائی۔

۵۳ بخاری و مسلم

سخت انتقام لیا، اپنی اس خالی رہبانیت، فطرت کے حقائق سے چشم پوشی اور ناعاقبت اندیشی سے مسیحیت لوگوں کے اخلاق و عادات اور ہلاکت کے غار میں گرتے ہوئے تمدن کا ہاتھ نہ پکڑ سکی، حالت یہ تھی کہ عیسائی ممالک میں بیک وقت عیشیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چل رہی تھیں بلکہ شاید زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ رہبانیت تو صحراؤں میں گوشہ نشین تھی اور شہری زندگی پر اس کا کوئی اقتدار نہ تھا اور اس کے برخلاف فسق و فجور کی تحریک شہروں کے اندر اپنے پورے جوش و تلاطم پر تھی۔ "لیکی" مسیحی دنیا کے اخلاقی انحطاط کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:-

"اخلاق میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کرگئی تھی، دربار کی عیش پرستیاں ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی، دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت، اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی، بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد و راہبین پیدا ہوئے تھے وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی، غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہوگیا تھا جو انسان کی شرافت وعظمت کا قطعی دشمن ہے، رائے جمہور اس قدر ضعیف ہوگئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا، البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ

دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہوسکتے ہیں
مکاری، دغا بازی دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ
کے زمانہ میں بھی نہ تھی، البتہ ظلم و تشدد، شقاوت و بے حیائی
اتنی نہ تھی لیکن اس کے ساتھ حریت فکر، آزاد خیالی و جوش
قومیت میں بھی کمی تھی۔[1]

ارکان کلیسا کی عیش پرستی اور دنیاداری

رہبانیت اور مذہب کا یہ سلبی نظام خلاف فطرت ضرور تھا لیکن نئے مذہب کے اثرات اور اسکے روحانی اقتدار نے فطرت کو دبا رکھا تھا، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد خود مذہبی مرکزوں اور حلقوں میں وہ تمام عیوب اور عیش پرستی شروع ہوگئی جس کے خلاف رہبانیت کی تحریک شروع کی گئی تھی یہاں تک کہ وہ اخلاقی انحطاط و پستی، اور اپنے تنعم و عیش پرستی میں خالص دنیادار حلقوں سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے، حکومت کو مجبوراً ان مذہبی عرسوں کا سلسلہ بند کرنا پڑا جن کا مقصد مسیحیوں میں اخوت و محبت پیدا کرنا تھا اسی طرح سے شہدا دا ولیاء کے عرس اور ان کی برسیاں ممنوع قرار دی گئیں کیونکہ یہ خالص مذہبی تقریبات فسق و بے حیائی کا اڈا بن گئی تھیں، بڑے بڑے پادریوں پر بڑے بڑے اخلاقی جرائم کا الزام تھا، سینٹ جیروم کا مقولہ ہے کہ اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امرا اور دولتمندوں کی عیش و عشرت

[1] تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم ص ۱۰۳

بھی شرماتی ہے، خود پوپ اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عہدے معمولی سامان تجارت کی طرح بکتے تھے اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا، جنت کے قبالے جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح، مغفرت کے پروانے، نقص قانون کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکٹ بے تکلف بکتے تھے، مذہبی عہدہ دار سخت عیاشی و سود خوار تھے، فضول خرچی اور اسراف کا حال یہ تھا کہ پاپائے انوسینٹ ہشتم نے پاپائی کا تاج رہن رکھا اور پاپائے لیو دہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی، پہلے وہ خرچ کی اسکے بعد اپنی دولت جب یہ بھی کافی نہ ہوئی تو اپنے جانشین کی آمدنی کو پہلے سے وصول کر کے صرف کر ڈالا بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔[1]

غرض یہ کہ کلیسا کی تاریخ اور ارباب کلیسا کی سیرت قرآن کی اس آیت کی پوری پوری تفسیر تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ	مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں
كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ	کے علماء اور مشائخ میں ایک
لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ	بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو

---

[1] معرکۂ مذہب وسائنس۔

بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (التوبۃ - ۳۴)

لوگوں کا مال ناحق و ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انھیں روکتے ہیں۔

حکومت و کلیسا کی کشمکش

گیارھویں صدی عیسوی میں حکومت و کلیسا کی کشمکش شروع ہوئی اور اس نے بڑی شدت اختیار کرلی، ابتدا میں پوپ کو اس جنگ میں فتح ہوئی اور پوپ کا اقتدار واختیار اتنا بڑھ گیا کہ شہنشاہ ہنری چہارم ۱۰۷۷ء میں اس بات پر مجبور ہوا کہ کانوسا کے قلعہ میں پوپ کے حضور میں حاضر ہو، چناں چہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا، پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں کی سفارش پر اپنے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت دی اور شہنشاہ ننگے پاؤں اُون پہنے ہوئے آیا، پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے اسکی غلطی معاف کی، اسکے بعد حکومت و کلیسا کی آویزش میں کبھی پوپ کو فتح اور کبھی شکست ہوئی، یہاں تک کہ انجام کار حکومت کے مقابلہ میں کلیسا کو دبنا پڑا، اس پوری مدت کشمکش میں لوگ مذہب و سیاست اور کلیسا و ریاست کی دُہری غلامی میں گرفتار تھے۔

اقتدار کا غلط استعمال اور یورپ کے تمدن پر برا اثر

پوپ قرون وسطیٰ میں بڑے وسیع اقتدار اور ایسی عظیم الشان طاقت کے مالک تھے جو شاہانِ روما کو بھی حاصل نہ تھی، ان کے لئے یہ بہت آسانی سے ممکن تھا کہ وہ دین کے زیر سایہ یورپ کو علم اور تمدن میں ترقی دیتے، ڈریپر لکھتا ہے کہ اگر پاپایانِ روما اپنی ہوس رانیوں اور دُنیا پرستیوں میں مبتلا

نہ ہوتے تو وہ اس بات پر قادر تھے کہ اُن کے ایک اشارہ پر تمام براعظم بالاتفاق ایسی ترقی کرتا کہ دُنیا دنگ رہ جاتی، ان کے تائب بے روک ٹوک ہر ملک میں جاسکتے تھے اور آئرلینڈ سے لے کر بوہیمیا اور اٹلی سے چل کر اسکاٹ لینڈ تک بلا تکلف آپس میں بات چیت کرسکتے تھے، ایک زبان ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی امور کے نظم و نسق میں دخیل ہوگئے اور ہر ملک میں انھیں ایسے ہوشیار اور معاملہ فہم حلیف ہاتھ آگئے تھے جو ایک ہی زبان بولتے تھے اور عام امور میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار تھے۔

لیکن مسیحیت اور مسیحی اقوام کی بدقسمتی تھی کہ ارباب کلیسا نے اس زبردست طاقت کا ناجائز استعمال کیا، انھوں نے اس سے اپنے شخصی اثر و اقتدار کے لئے فائدہ اٹھایا اور یورپ بدستور پستی، جہالت و خرافات کی تاریکیوں میں پڑا رہا، اور تمدن اور شہریت کو ترقی ہونے کے بجائے سخت تنزل ہوا، براعظم یورپ کی آبادی ہزار سال میں بھی اور ملک انگلستان کی آبادی پانچ سو سال میں بھی دوچند نہ ہوسکی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں بڑا دخل اس بات کو ہے کہ پادری اور راہب تجرد کی زندگی کی بڑی تبلیغ کرتے تھے، اس کے ساتھ کلیسا نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طبیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے اس لئے کہ اس کا خانقاہوں کی آمدنی پر جو دعا و تبرکات کے ذریعہ ہوتی تھی اثر پڑتا تھا اور طبیب اس منفعت میں کلیسا کے رقیب بن سکتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک زبردست وبائیں اور امراض پھیلے اور موت

کی گرم بازاری ہوئی، انٹیس سلومیس نے ۱۸۲۳ء میں جزائر برطانیہ کی جو سیاحت کی ہے اور اپنے سفر کے حالات لکھے ہیں اس سے اس ملک کا تمدنی انحطاط، افلاس اور فاقہ زدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتب مقدسہ میں الحاق و تحریف اور اسکے نتائج

لیکن اہل دین کی سب سے خطرناک غلطی جس سے انھوں نے اس مذہب کو جس کے وہ نمائندے تھے اور خود اپنے کو سخت ترین نقصان پہونچایا، یہ تھی کہ انھوں نے اپنی مقدس دینی کتابوں میں ان تاریخی جغرافیائی اور طبیعی نظریات اور مشہورات کو داخل کر دیا جو اس زمانہ کی تحقیقات اور مسلمات تھے اور انسانی علم اُن کے زمانہ تک اسی حد تک پہونچا تھا لیکن وہ انسانی علم کی حد نہ تھی اور اگر اس زمانہ میں وہ حد سمجھ لی گئی تھی تو وہ دراصل آخری حد نہ تھی اس لئے کہ انسان کا علم تدریجی، ترقی پذیر، اور مسافر ہے جس کا قیام عارضی ہے، اس پر کوئی پائدار عمارت نہیں قائم کی جاسکتی وہ بعض اوقات ریت کی طرح کھسک جاتا ہے اور عمارت منہدم ہو جاتی ہے ارباب کلیسا نے غالباً خوش نیتی سے ایسا کیا تھا اُن کا مقصد شاید یہ تھا کہ اس سے ان آسمانی کتابوں کی عظمت و شان اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا لیکن آگے چل کر یہی چیز ان کے لئے وبال جان اور مذہب و عقلیت کے اس تامبارک معرکہ کا سبب ہوئی جس میں مذہب (وہ مذہب جس میں انسانی علم کی آمیزش تھی) نے شکست کھائی اور یورپ میں اس مذہب کو ایسا زوال ہوا جس کے بعد پھر عروج نہ ہوسکا اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ یورپ

لادینی ہوگیا۔

اہل مذہب نے صرف اسی الحاق اور تحریف پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان تمام جغرافیائی، تاریخی اور طبعی معلومات کو جو لوگوں میں زبان زد اور مشہور تھے یا کتب مقدسہ کے بعض شارحین ومفسرین نے ان کا تذکرہ کیا تھا، دینی تقدیس کا جامہ پہنا دیا اور ان کو مذہبی رنگ دے کر ان مسیحی تعلیمات واصول میں شامل کرلیا جن پر اعتقاد رکھنا ایک مسیحی کے لئے ضروری ہے اس موضوع پر انھوں نے کتابیں تصنیف کیں اور اس جغرافیہ کو جس کی کوئی آسمانی سند نہ تھی جغرافیہ مسیحی (TAPOGRAPHY CHRISTIAN) کا نام دیا اور اسکے تسلیم کرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ جن لوگوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا اُن کی تکفیر کی۔

مذہب وعقلیت کی کش مکش اور ارباب کلیسا کے مظالم

اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں عقلیت کا کوہ آتش فشاں پھوٹ چکا تھا، علماء طبیعیات اور محققین تقلید کی زنجیریں توڑ چکے تھے انھوں نے ان بے اصل نظریات کی تردید کی جو جغرافیہ اور تاریخ اور طبیعیات سے تعلق ان مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے، اور بڑی جسارت اور آزادی کے ساتھ ان کی علمی تنقید کی اور بے سمجھے ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کردیا اس کے ساتھ انھوں نے اپنے علمی انکشافات اور تجربوں کا بھی اعلان کردیا، اب کیا تھا مذہبی حلقوں میں قیامت برپا ہوگئی، ارباب کلیسا نے (جو اقتدار اور طاقت کے مالک تھے) ان کی تکفیر کی اور دین مسیحی کے لئے ان کے خون بہانے اور ان کے مال ومتاع ضبط کرلینے کی اجازت دی۔ احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جو بقول پوپ کے

"ان ملاحدہ اور مرتدین کو سزا دیں جو شہروں، گھروں، تہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔" ان عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا، اس کے جاسوس براعظم کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس بارہ میں محکمۂ احتساب نے تفتیش اور تجسس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ایک عیسائی عالم کہتا ہے کہ "ناممکن ہے کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے" اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزا دی ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں، جن میں تیس ہزار کو زندہ جلایا گیا، انھیں زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو (BRUNOE) بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا، محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کیا کہ اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے، اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو Galilio کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔

اہل تجدد کی مذہب کے خلاف بغاوت اور بیزاری

آخر کار روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے مذہب و قدامت کے نمائندوں کے خلاف علم جنگ بلند کر دیا، وہ مذہبی گروہ کے اس تشدد و جمود اور محکمۂ احتساب کے ان مظالم سے ایسے بیزار اور مشتعل ہوئے کہ ان کو ان تمام عقائد، علم، اخلاق و آداب سے

نفرت ہوگئی جن کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی ہے یا اس سے ان کا تعلق ثابت ہوتا ہے، ان کے دل میں ابتداءً مسیحی مذہب کے خلاف اور رفتہ رفتہ مطلق مذہب کے خلاف عداوت کا جذبہ پیدا ہوگیا اور وہ جنگ جو ابتداءً علوم و عقلیت کے علم برداروں اور مذہب مسیحی (درحقیقت سینٹ پال کے مذہب) کے نمائندوں کے درمیان تھی، بعد میں علم و دین کی باہمی جنگ کی صورت اس نے اختیار کرلی۔

روشن خیالی اور عقلیت کے علم برداروں نے بطور خود یہ طے کرلیا کہ علم و مذہب ایک دوسرے کے ضد اور متقابل واقع ہوئے ہیں جو کبھی جمع نہیں ہوسکتے اور دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف ہیں جن میں کبھی صلح نہیں ہوسکتی، اس لیے علم و عقلیت کے ساتھ وفاداری کے لیے یہ ضروری ہے کہ مذہب سے منہ موڑ لیا جائے، ان کے سامنے جب دین و مذہب کا نام آتا تو دفعتاً نمائندگان مذہب اور ارباب کلیسا کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہوجاتی اور ان بے گناہ علماء اور محققین کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں جنھوں نے انتہائی مظلومیت اور بے بسی کی حالت میں ان جلادوں کے ہاتھوں پُر اذیت موت پائی مذہبی گروہ کے نام سے ان کی نگاہوں کے سامنے پُر غضب چہرے چڑھی ہوئی تیوریاں، شرر فشاں آنکھیں، تنگ سینے اور پادریوں کے بھدّے دماغ ہی آتے، چنانچہ مذہب سے وحشت اور نفرت کو انھوں نے ایک اصول زندگی کے طور پر طے کرلیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی نفرت و کراہیت کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔

روشن خیالوں کی عجلت پسندی اور جمود و تعصب

ان روشن خیالوں اور تجدد پسندوں میں اتنا صبر و سکون مطالعہ اور غور کی قوت اور عقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان واقعات میں دین کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک ارباب کلیسا کا جمود، جہالت، استبداد اور غلط نمائندگی اس کی ذمہ دار ہے اور اگر دوسری شکل ہے تو دین کو اس کی سزا دینا اور اس سے بے تعلقی اختیار کر لینا کہاں تک حق بجانب ہے، لیکن غصہ اور اہل مذہب کی عداوت اور عجلت پسندی نے اس بارہ میں ان کو غور کرنے کا موقع نہ دیا اور جیسے کہ دنیا میں عموماً بغاوت اور احتجاج کے موقع پر ہوتا ہے، انھوں نے دین کے ساتھ کوئی رواداری اور مفاہمت پسند نہیں کی۔

ان میں اتنی طلب صادق اور اپنی قوم کی خیر خواہی، فراخ حوصلگی بھی نہ تھی کہ وہ دین اسلام کا مطالعہ کرتے جو ان کی بہت سی معاصر قوموں کا دین تھا اور جو نہایت آسانی کے ساتھ اس مخمصہ اور مذہب و عقلیت کی اس غیر ضروری کشمکش سے نجات دیتا جو معقول و مستحسن امور کا مطالبہ کرتا، غیر معقول اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتا، دنیا کی بے ضرر اور پاک لذتوں اور فوائد کی ان کو اجازت دیتا، مضر اور قابل نفرت اشیاء کو ممنوع قرار دیتا اور ان بے جا زنجیروں اور بیڑیوں کو کاٹ دیتا جو تحریف شدہ مذاہب اور تشدد پسند اہل مذہب اور اہل حکومت نے ان کے جسم میں ڈال رکھی تھیں۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَ	(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)
يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ	ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی
وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ	سے روکتے ہیں، پسندیدہ چیزیں
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۤئِثَ	حلال کرتے ہیں، گندی چیزیں حرام
وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ	ٹھہراتے ہیں، اس بوجھ سے نجات
وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ	دلاتے ہیں جس کے تلے وہ دبے
عَلَيْهِمْ.	ہوئے ہیں، ان پھندوں سے
(اعراف - ۱۵۷)	نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں.

لیکن قومی عصبیت اور ان دیواروں کی وجہ سے جو صلیبی جنگوں نے عیسوی مغرب اور اسلامی مشرق کے درمیان اور ارباب کلیسا کی افترا پردازیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف کھڑی کر دی تھیں، نیز مطالعہ و تحقیق کی محنت برداشت نہ کرنے اور موت کے بعد کی زندگی اور نجات اخروی سے آزاد و بے فکر ہونے کی وجہ سے انھوں نے اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

اس میں کچھ دخل مسلمانوں کی تبلیغی کوتاہیوں کو بھی ہے کہ انھوں نے صدیوں یورپ جیسے اہم براعظم میں اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے تعارف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی حالاں کہ اسلامی حکومت کے عروج اور یورپ کی سلطنتوں سے معاصرانہ اور مساویانہ تعلقات ہونے کی وجہ سے ان کو اس کے مواقع حاصل تھے۔

غرض اہل یورپ ایسے نازک موقع پر اسلام کی رہنمائی اور اس کی

مسیحائی سے محروم ہے۔

بہرحال جس کا خطرہ تھا وہ پیش آگیا اور یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہو گیا، خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست غرض زندگی کے

یورپ کی مادیت

تمام شعبوں میں مادیت غالب آگئی، اگرچہ تدریجی طور پر ہوا اور ابتدا میں اس کی رفتار سست تھی لیکن قوت و عزم کے ساتھ یورپ نے مادیت کی طرف حرکت کرنی شروع کی، علما، فلسفہ و علوم طبیعیات نے کائنات میں اس طرز پر غور اور بحث کرنی شروع کی کہ گویا نہ اس کا کوئی خالق ہے، نہ منتظم و حاکم اور طبیعیات اور مادہ کے ماورا کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس عالم میں تصرف اور اس کا نظم و نسق کرتی ہے، وہ عالم طبیعی اور اس کے ظواہر و آثار کی تشریح و توجیہ خالص میکانیکی طریقہ پر کرنے لگے اور اس کا نام علمی اور تحقیقی طرز قرار پایا، اور ہر ایسا بحث و نظر کا طریقہ جس کی بنیاد خدا کے وجود اور اس کے یقین پر ہو، تقلیدی اور غیر علمی طریقہ کہا جانے لگا اور اس کا مذاق اُڑایا جانے لگا، اس راستہ کی منزل یہ تھی کہ انھوں نے چلتے چلتے حرکت اور مادہ کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیا اور ہر اس چیز کے ماننے سے عذر کیا جو حواس اور تجربہ کے اندر نہ آسکے اور جس کا وزن شمار و پیمائش نہ ہو سکے، اس کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کا وجود اور تمام حقائق مابعد الطبیعیات ایسے مفروضات بن گئے جن کی گویا عقل و علم سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔

ان لوگوں نے ایک زمانہ دراز تک خدا کا انکار نہیں کیا اور مذہب سے

صاف صاف اعلان جنگ کبھی نہیں کیا اور فی الواقع سب کے سب اس کے منکر بھی نہ تھے، لیکن جو طریق فکر اور بحث و نظر میں جو پوزیشن انھوں نے اختیار کی تھی وہ ایسے دین کے ساتھ جمع ہی نہیں ہو سکتی تھی جس کی پوری عمارت ایمان بالغیب اور وحی و نبوت کی بنیاد پر ہے اور جو حیات اُخروی پر اس قدر زور دیتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی حواس و تجربہ کے تحت میں نہیں آتی اور وزن و شمار اور پیمائش سے اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی اس لیے روز بروز ان کو دینی عقائد میں اشتباہ اور ان کے ماننے میں تذبذب پیدا ہوتا گیا۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد کے لوگ مدت دراز تک مادی نقطۂ نگاہ، دی زندگی اور مسیحی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے، مذہبی تقلید سے وہ ابھی پورے طور پر آزاد نہیں ہوئے تھے اور عیسوی دنیا میں مذہبی ماحول ابھی باقی تھا، اخلاقی اور اجتماعی مصالح کا بھی تقاضا تھا کہ خواہ برائے نام لیکن مذہبی نظام ضرور برقرار رہنا چاہیے جو قوم کے افراد کے درمیان رابطہ قائم رکھے اور ملک کو اجتماعی انتشار اور اخلاقی ابتری سے محفوظ رکھے لیکن مادی تہذیب کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مذہب اور اس کے رسوم اس کا ساتھ نہ دے سکے، مادیت اور روحانی مذہب کے جمع کرنے میں خاصی تکلیف بلکہ تکلف اور تضیع اوقات تھا، اس نے کچھ مدت کے بعد اس تکلف کو برطرف کیا اور صاف صاف لادینیت اور مادہ پرستی اختیار کر لی، اسی زمانہ میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مصنف ادیب، معلم اجتماعی اور سیاسی پیدا ہوئے جنھوں نے مادیت کا صور پھونکا اور اہل ملک کے دل و دماغ میں

مادہ پرستی کے بیج بو دیئے، علماء اخلاق، اخلاق کی مادی تشریح کرتے تھے کبھی فلسفۂ افادیت کی اشاعت کرتے اور کبھی لذتیت کی، میکاولی Machiavelli (۱۴۶۹ - ۱۵۲۷) جیسے اہل سیاست نے دین و سیاست کی تفریق کی دعوت پہلے ہی دے دی تھی، اور اخلاق کی دو قسمیں قرار دی تھیں پبلک اور پرائیوٹ، اور طے کر دیا تھا کہ اگر مذہب کی ضرورت ہی ہے تو وہ محض انسان کا ایک پرائیوٹ معاملہ ہے جس کو امورِ سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے، حکومت ہر چیز پر مقدم اور ہر شے سے بیش قیمت ہے، مذہب عیسوی کا تعلق دوسری زندگی سے ہے، ہماری دنیاوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں، مذہبی اور نیکوکار انسانوں کا وجود حکومت کے لیے کچھ مفید نہیں، اس لیے کہ وہ دین کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اور ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتے، بادشاہوں اور حکام کو لومڑیوں کے صفات اختیار کرنے چاہئیں اور اگر حکومت کا فائدہ ہوتا ہو اور کوئی سیاسی مصلحت مقتضی ہو تو عہد شکنی، دروغ گوئی، فریب دہی، خیانت اور نفاق میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے، یہ دعوت و تبلیغ پورے طور پر مؤثر و کامیاب ہوئی اور وطنیت و قومیت (جو مذہب قدیم کی جگہ لے رہی تھی) نے بھی اس کی پوری امداد کی۔

مصنفین، اہلِ قلم اور اہلِ دماغ نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی، اور خطابت و شاعری سے قدیم اخلاق اور اجتماعی نظامات کے خلاف سارے ملک میں ایک بغاوت برپا کر دی انھوں نے معصیت کو خوش نما اور دلفریب

بنا کر پیش کیا، طبیعتوں کو ہر قید و بندش فرد کو ہر ذمہ داری و جواب دہی سے آزاد ہونے کی اور مطلق آزادی و بے قیدی کی کھلی تبلیغ کی، زندگی سے پورے پورے تمتع، مطالبات نفس کی پوری تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی، اور اس زندگی کی قیمت میں بڑے غلو اور مبالغہ سے کام لیا، نقد لذت اور ظاہر و محسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا انکار و تحقیر کی۔

اس طرح سے انیسویں اور بیسویں صدی کی مغربی زندگی کی بت پرست یونان اور روما کی جاہلی زندگی کا مرقع بن گئی، یہ گویا اس کا نیا اڈیشن تھا جو انیسویں صدی میں نئے اہتمام کے ساتھ تیار کیا گیا، یونان اور روما کے جن نقوش کو مشرقی عیسویت نے مدھم کر دیا تھا، انیسویں صدی کے نقاشوں نے ان کو پھر اجاگر کر دیا، اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے، آج کی مغربی قومیں انھیں یونانی، رومی اور مغربی اقوام کی جائز وارث اور خلف الرشید ہیں، موجودہ مغربی تہذیب اور قدیم یونانی اور رومی تہذیب میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے، یورپ کی موجودہ مذہبی زندگی بھی روحانیت اور باطنی کیفیت سے اسی طرح عاری ہے جیسے یونانیوں کی مذہبیت تھی، مذہبی کمزوری کا خشوع اور خضوع اور مذہبی سنجیدگی کی کمی زندگی میں لہو و لعب کی کثرت کا بھی وہی حال ہے جو یونان میں تھا، اور یہ نتیجہ ہے علماء طبعیات و حکمت کے ان نظریات اور تحقیقات کا جنھوں نے یورپ میں پوری مقبولیت حاصل کر لی اور دین و مذہب کی پوری پوری جگہ لے لی ہے، اسی طرح زندگی کی ہوس، لذت طلبی اور ذاتی

اور دنیا میں شوق گل چینی کی بھی بعینہ وہی کیفیت ہے جو سقراط نے اپنے زمانہ کے جمہوری نوجوان کی بیان کی ہے، نیز مذہبی شک و تذبذب' دینی نظام اور مذہبی فرائض و رسوم کی بے وقعتی میں بھی یورپ، یونان و روما سے پیچھے نہیں ہے۔

مسیحیت یا مادہ پرستی؟

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں اور روح پر حکومت ہے وہ عیسائیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے، مغربی نفسیات اور مغربی زندگی سے اسکی قدم قدم پر تصدیق ہوتی ہے۔

Islam at the Cross Roads. کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریق پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں' اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں یورپ کا عام اور متوسط آدمی وہ جمہوری ہو یا فاشستی، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب جانتا ہے، وہ کیا؟ مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض و غایت اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پُر راحت اور آزاد اور بے قید بنائے، اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں زبردست

کارخانے ہیں، تھیٹر و تفریح گاہیں، کیمیاوی دارالصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مرکز، اس مذہب کے پروہت بینکوں کے افسران ہیں، انجینیر، اداکار، جوہری (ایکٹر میس) فلم اسٹار اور تجارت و صنعت کی بڑی بڑی مرکزی شخصیتیں اور رکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں، طاقت و لذت کی اس ہوس اور چھچھورپن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کر دینے کے لئے پر تول رہے ہیں اگر ان کی خواہشات اور مصالح میں تصادم ہو گیا، اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے عملی فائدہ کا اسکے نزدیک معیار محض مادی کامیابی ہے۔[۱]

مغربی تہذیب صاف صاف پُر زور طریقہ پر خدا کا انکار نہیں کرتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسکے ذہنی نظام میں اللہ کی کوئی جگہ نہیں اور اسکے ماننے میں وہ کوئی فائدہ محسوس کرتی ہے اور نہ اسکی ضرورت سمجھتی ہے۔[۲]

---

۱ Islam at the C oss Roads, (Fifth ed ition) P 50

۲ " " " " " P. 40

پروفیسر جوڈ (Jaod) جو لندن یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ وعلم النفس کے صدر ہیں اپنی کتاب (Guide to Modern Wickedness) میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں:۔

"میں نے بیس طلبا اور طالبات کی جو سب کے سب بیس سے کچھ اوپر عمر کے تھے ایک جماعت سے سوال کیا کہ ان میں سے کتنے کسی معنی میں عیسائی ہیں؟ صرف تین نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا اور عیسائی ہونے کا اقرار کیا، سات نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا، باقی دس نے صاف صاف کہا کہ وہ کھلے طور پر مسیحیت کے خلاف ہیں، میرا خیال ہے کہ مسیحیت کے ماننے والوں نہ ماننے والوں کا یہ تناسب اس ملک میں کوئی استثنائی اور غیر معمولی مثال نہیں، ہاں البتہ اگر یہ سوال پچاس سال یا بیس سال اُدھر کیا جاتا تو اسکے جوابات ان جوابات سے مختلف ہوتے اس بنا پر بہت تھوڑے لوگ ہوں گے جو کینن بیری (Canon Barry) کے اس بارہ میں ہم خیال ہوں کہ ایک بڑے پیمانہ پر کوئی بیداری اور ترقی دنیا کو نجات دے سکتی ہے، میری رائے میں ان کے اس دعوے کو حق بجانب ثابت کرنے والی کوئی چیز نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ اُن کی خواہش ہو۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ خواہشات خیالات پیدا کر دیتی ہیں، لیکن وہ دلائل اور ثبوت نہیں پیدا کر سکتی، اس ملک کے حالات و آثار صاف

مبتلا رہے ہیں کہ یہی کلیسا آئندہ صدی میں اپنی عمر پوری کرے گا
ایک روزانہ اخبار کے اقتباس ذیل سے اسکی تائید ہوتی ہے۔
ستتر برس کے ایک بوڑھے نے ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے
وہ کتاب مقدس کے پرانے نسخوں کو بندوقوں کی ڈاٹ مصنوعی
ریشم، گتا پارچہ اور نوٹوں میں تبدیل کر سکے گا، یہ مشین کارڈف
فیکٹری (Cardif Factory) اور آٹھ دوسرے
کارخانوں میں لگادی گئی ہے اور کتاب مقدس کے نسخوں سے
جنگی سامان تیار ہورہا ہے، موجد نے اس مشین سے بڑی دولت
پیدا کی ہے۔[1]
پس سن لیں وہ لوگ جن کو اشر نے کان دیئے ہیں یہ
زر پرستی
یہی مصنف اپنی دوسری کتاب (Philosophy for our Times) میں لکھتا ہے۔
صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے
حصول دولت کی خواہش پچھلے دوسو سال سے دیگر جملہ محرکات
عمل سے زیادہ کام کرتی رہی ہے کیوں کہ دولت حصول ملکیت
کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی یہ بات اور شان و عظمت ہی سے
انسان کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے، سیاسیات، ادب سینما

GUIDE TO MODERN WICKEDNESS ص ۱۱۹ و ۱۱۵ [1]

ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال اپنے پڑھنے سننے والوں کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہو جس میں جذبۂ حصول انتہائی طور پر ترقی کر چکا ہے۔

" یہ دولت پرستی ہمارے مذہبی عقائد سے متصادم ہے کیونکہ مذہب یقین دلاتا ہے کہ غریبی اچھی اور دولت مندی بری ہی نہیں بلکہ دولت مند کو نیک بننے کا اتنا ہی کم امکان ہے جتنا کہ غریب کو زیادہ ہے اگرچہ تقاضائے دانش و تعلیم مذہب متفقہ طور پر یہی سکھاتے ہیں کہ خدا پرستی اور حصول جنت غریبی کے ساتھ ہے تاہم لوگوں نے تعلیم مذہب کو سچا سمجھ کر اس پر عامل ہونے کا کوئی رجحان ظاہر نہیں کیا اور موجودہ حصول دولت کو مستقبل حصول راحت آسمانی پر بخوشی ترجیح دیتے رہے ہیں، غالباً ان کا یہ خیال رہا ہے کہ بستر مرگ پر توبہ کرکے وہ آخرت میں اتنا ہی فائدہ حاصل کر سکیں گے جتنا کہ یہاں اس دنیا کی مخزونہ دولت سے، اُن کے اس تخیل کو (Samjle Butler) نے اپنی کتابوں میں یوں ظاہر کیا ہے کہ بدشعار مصنفین کہتے ہیں کہ ہم خدا اور دولت کی ساتھ ساتھ پرستش نہیں کر سکتے ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ آسان نہیں لیکن قابل حصول چیزیں آسان ہوتی ہی کب ہیں؟

ہمارے اصول کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہم ٹبلر کے پکے مقلد ہیں، ہم دولت کے اتنے ہی دلدادہ ہیں اور

ہمارا یہ اعتقاد کہ دولت ہی فرد و سلطنت کی عظمت کا باعث ہوتی ہے، اس قدر راسخ ہے کہ اس سے دنیا کے دو محرک اُصول قائم کئے گئے ہیں جو کہ اعلیٰ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، ان میں سے ایک عدم مداخلت کا معاشی اُصول ہے جو کہ انیسویں صدی پر غالب رہا، اس اُصول کا دعویٰ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے عمل کو زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ پر منحصر رکھتا ہے گویا اُن کا مذہب لذتیت یہ ہے کہ عمل کا محرک لذت جذبات دلی نہیں بلکہ لذت تقاضائے دولت ہے۔

دوسرا اُصول جو کہ بیسویں صدی میں غالب نظر آتا ہے، مارکس کا اُصول معاشی تقدیر و تنظیم ہے، یہ اُصول بتلاتا ہے کہ انسان کا معاشی نظام ہمیشہ ان کی مالی ضروریات پر مبنی ہوتا ہے اور یہی نظام اُن کے ادب، اخلاقیات، مذہب، منطق، نیز نظام حکومت کا خالق ہوتا ہے، ان دونوں اُصولوں کی مقبولیت کا انحصار اسی قدر و منزلت پر ہے جو کہ ہمارے مرد و عورت نمایاں طور پر دولت کے انفرادی اور سیاسی معیار حُسن پر رکھتے ہیں۔[1]

یہی مصنف اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مقبول اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ اور جیب کے نقطۂ نظر سے

---

[1] Philosophy for our Times

دیکھنا اور جانچنا ہے۔"[1]

مسٹر جان گنتھر ممتاز امریکی اخبار نویس نے اپنی کتاب (Inside Europe) میں اس زر پرستی کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:۔

"انگریز ہفتہ میں چھ روز پرستش تو بینک آف انگلینڈ میں کرتا رہتا ہے صرف ساتویں روز کلیسائے انگلستان کا رُخ کرتا ہو۔"

خدا فراموشی و خود فراموشی

ان لوگوں سے جو کسی دوسری زندگی پر ایمان اور لذت و تمتع یا شخصی و قومی سربلندی کے علاوہ کسی مقصد عالی پر یقین نہیں رکھتے اور اللہ سے اُن کو کچھ یوں ہی سا برائے نام تعلق ہے۔ اسکی توقع کرنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ ان میں کسی مصیبت یا خطرہ کے موقع پر تضرع اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوگی، قرآن مشرکین کے متعلق کہتا ہے کہ وہ خطرہ اور مصیبت کے وقت خدا ہی کو پکارتے ہیں اور اُن کو ایسے موقع پر صرف خدا ہی یاد آتا ہے، لیکن یورپ کے مادہ پرست مادیت میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں، اور ظاہری اسباب و علل ان پر اتنے غالب آگئے ہیں اُن کی زندگی میں خدا سے اتنا استغنا اور دلوں میں اتنی سختی اور بے حسی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ قرآن مجید کی ان آیتوں کا مصداق بن گئے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی اُمَمٍ ۔ اور ہم تم سے پہلے بہت سی اُمتوں

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 114, 115

مِنْ قَبْلِكَ فَأَخَذْنٰهُمْ
بِالْبَاْسَاۤءِ وَالضَّرَّاۤءِ
لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۔
فَلَوْلَاۤ اِذْ جَاۤءَهُمْ بَاْسُنَا
تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ
قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ
وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ
فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا
يَتَضَرَّعُوْنَ ۔

پر رسول بھیجے تھے پھر ہم نے انکو سختی
اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ وہ
(خدا کے حضور میں) گڑگڑائیں پھر
کیوں نہ گڑگڑائے جب ان پر ہمارا
عذاب آیا لیکن (الٹے) ان کے دل
سخت ہوگئے اور شیطان نے انکے
کام کو آراستہ کرکے دکھایا۔
اور ہم نے پکڑا تھا ان کو آفت
میں پھر نہ عاجزی کی اپنے رب
کے آگے اور نہ گڑگڑائے۔

(المومنون - ٧٦)

چنانچہ آپ کو جنگ کے سخت ترین مواقع اور نازک ترین گھڑیوں میں بھی خدا کی طرف توجہ، انابت کی کیفیت، دل کی شکستگی اور شان عجز و بندگی نظر نہ آئے گی، اور نہ قوم کے اخلاق و اعمال اور تفریحات و دلچسپیوں میں کوئی فرق نظر آئے گا، مغرب کے مفکرین اہل قلم اور رہنما اسی پر فخر کرتے ہیں، اور اس کا نام ان کے یہاں استقلال نفس، قوت قلب اور قومی عزت نفس و خودداری ہے، مشرقی خدا پرست اور مسلمان کے نقطۂ نظر سے یہی قساوت قلب غفلت، لہو و لعب میں انہماک اور مدہوشی و خود فراموشی ہے۔

"لندن کی ایک رات" کے عنوان کے تحت لندن میں بسنے والے ایک

ہندوستانی ۱۹۴۰ء کے ہوائی حملوں کے زمانہ کی آپ بیتی سناتے ہیں :۔

"..... اس رات ہم سب دوست احباب کئی دن اور کئی رات کے متواتر حملوں سے تنگ آکر ایک نہایت پُرتکلف ملی جُلی ہندوستانی انگریزی، دعوت کے انتظام میں مصروف تھے، مالکہ مکان نے اپنا باورچی خانہ اور اس کا سب سامان ہمارے حوالہ کر دیا تھا اور اوپر کا بڑا کمرہ بھی ناچ کے لئے خالی کر دیا تھا، کوئی پچیس عورتیں اور مرد سب نے مل کر اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا، کھا پی کر ہم لوگ ناچ رہے تھے کہ یکایک خطرہ کا سائرن بجا، پہلے تو ایک دم سب خاموش ہو گئے، مگر ناچ بند کئے بغیر ایک بولا، کیا صلاح ہے؟ ایک لڑکی نے جواب دیا ناچتے رہیں گے چنانچہ ہم سب ناچتے رہے اور گانوں اور قہقہوں سے سارا مکان تو کیا سارا محلہ گونجنے لگا"[1]

اس اقتباس سے کچھ اوپر کی سطریں :۔

"تھوڑے دن کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ روز شام کے وقت رات آٹھ بجے سائرن بجتا، دشمن کے ہوائی جہاز کی گھر گھر سنائی دینے لگتی، سرچ لائٹ کا جلتا ہوا اجال آسمان پر بکھر جاتا توپیں دغنے لگتیں اور زمین و آسمان ہل جاتے، اس وقت اگر سینما ہوتا تو تصویر کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے بند ہو جاتا، اور پردہ پر یہ لفظ آجاتے" ابھی

---

[1] ہوائی حملہ ص ۱، مصنفہ آغا اشرف دہلوی ایم اے۔

ہوائی حملہ شروع ہوا ہے مگر یہ تصویر جاری رہے گی جو لوگ پناہ خانہ میں جانا چاہیں اُن کا راستہ نیچے "بائیں طرف کو ہے" مجمع سب سنتے رہتے اور تصویر پھر جاری ہو جاتی ہے[1]

اس تفریحی انہماک اور خود فراموشی کی مثال قدیم یونان ورومامیں ملتی ہے، تاریخ کی روایت ہے کہ پامپی آئی، کا کوہ آتش فشاں جب پھٹا ہے اور آسمان سے آگ کے شعلے اور انگارے زمین سے زلزلہ آیا ہے تو، دن کا وقت تھا اور لوگ ایمفی تھیٹر میں (اس عظیم الشان منڈوے میں جو بیک وقت بیس ہزار انسانوں کا جلسہ گاہ تھا) بیٹھے ہوئے درندوں کو زندہ انسانی جسموں کو اپنے پنجوں اور دانتوں سے نوچتے اور چیرتے پھاڑتے دیکھ رہے تھے، اس ظالمانہ لہو ولعب کی عین مشغولیت میں زلزلہ آیا اور آگ آسمان سے برسنا شروع ہوئی، کچھ جہاں بیٹھے لیٹے تھے وہیں جل کر اور بھسم ہو کر رہ گئے، کچھ باہر نکلے تو اندھیرا گھُپ، جسم سے جسم، سر سے سر ٹکرائے، کتنے یوں ختم ہوئے، کچھ خوش نصیب تھے جنھوں نے کشتیوں اور جہازوں میں بھاگ بھاگ کر جان بچائی، شہر اٹھارہ سو برس تک دُنیا کے نقشہ سے غائب ہو گیا، انیسویں صدی کے وسط میں پتہ چلا کہ معدوم نہیں ہوا ہے صرف گرد خاکستر سے پٹ گیا ہے، کھدائی شروع ہوئی اور برسوں کے بعد شہر عبرت کا عجائب خانہ بنا ہوا اسی طرح جوں کا توں نکل آیا۔

اَوَاَمِنَ اَھۡلُ الۡقُرٰیۤ — کیا بستیوں والے اس بات سے نڈر

---

[1] ہوائی حملہ۔ ص ۰۰

اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۔	ہیں کہ اُن پر ہمارا عذاب آ پہنچے دن چڑھے جب وہ کھیل میں
(الاعراف، ۹۸)	مشغول ہوں۔

خدا شناس، خدا پرست انسانوں کا طرز عمل اور سیرت و اخلاق جنگوں اور خطرات کے موقع پر اس طرز عمل سے جس قدر مختلف اور متبائن ہے اس کا اندازہ کچھ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (الانفال - ۴۵)	اے ایمان والو! جب تمہارا دشمن سے سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اس موقع پر اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

صحابہ کرام بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی پریشان کن امر پیش آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے، بدر کے معرکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیں برابر کیں اور عریش میں تشریف لا کر اللہ سے مناجات اور گریہ وزاری شروع کر دی، آپ فرماتے جاتے تھے کہ اے اللہ اگر یہ جماعت آج ہلاک ہو گئی تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہ جائے گا۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

مغربی مزاج ایک مشرقی کی نظر میں

پس مادیت طبعی تاریخی اور علمی اسباب کی بنا پر تاریخ کے قدیم ترین عہد سے مغربی تہذیب اور مغربی زندگی کی روح اور اس کا مزاج بن گئی ہے، مغرب کے امتیاز

کی طرف مغرب و مشرق کے متعدد علماء نے توجہ دلائی ہے، علماء مشرق میں سے صاحب نظر اور صاحب فراست سیاح عبدالرحمٰن کواکبی (م ۱۳۲۰ھ) نے اس صدی کی ابتداء میں اپنی کتاب طبائع الاستبداد میں اس حقیقت کا ذکر کیا ہے:

"مغربی اپنی زندگی میں مادہ پرست، طبیعت کا مضبوط اور معاملہ کا سخت ہوتا ہے، اسکی طبیعت خود غرض، کینہ ور اور انتقامی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بلند اصولوں اور شریفانہ جذبات میں سے اب اسکے پاس کچھ باقی نہیں رہا، جو مشرق کی مسیحیت نے اس کو عطا کئے تھے، ایک جرمن ہی کو لو، مزاج کا خشک اور طبیعت کا اکھڑ، اس کے نزدیک ایک کمزور انسان زندہ رہنے کا مستحق ہی نہیں، اس کے نزدیک ہر قسم کی برتری قوت ہی میں پائی جاتی ہے اور قوت کا مرکز مال ہے۔ وہ علم کا قدر دان ہے، لیکن مال ہی کے خاطر، وہ عزت کا بھی شائق ہے لیکن مال ہی کی غرض سے لاطینی اور اطالوی کی فطرت میں خود پسندی اور بے عقلی ہے اسکے نزدیک عقل نام ہے آزادی اور بے قیدی کا، زندگی کہتے ہیں بے حیائی کو، عزت نام ہے زینت و لباس اور لوگوں پر غالب آجانے کا۔"

مغربی فطرت و نفسیات کی یہ صحیح تفسیر و تحلیل ہے، مرحوم کواکبی نے ان دونوں قوموں کو محض نمونے کے طور پر انتخاب کیا، ورنہ جزئی، قومی خصائص کے علاوہ مادہ پرستی، دولت کے عشق، خود غرضی اور معاملہ کی شدت میں مغرب کی ساری

قومیں شریک ہیں۔

روحانیت میں مادّیت

یہ مادہ پرستانہ روح یورپ کے تمام سیاسی اجتماعی اور اخلاقی قدیم وجدید نظامات میں جاری و ساری نظر آئے گی حتیٰ کہ اس روحانی تحریک کی جس سے یورپ کو بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے، روح بھی مادیت ہی ہے، وہ بھی دوسری صنعتوں اور فنوں کی طرح ایک سائنس اور آرٹ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عالم روحانیت کے عجائبات کی سیر کی جائے اس کے اسرار معلوم کئے جائیں، مُردوں کی روحوں سے بات چیت کی جائے اور تفریح و تسکین نفس کا سامان بہم پہونچایا جائے، مشرق کی اسلامی روحانیت و تصوف کے برخلاف اس کو تزکیۂ نفس، اصلاح قلب، خشیت الٰہی، عمل صالح، مجاہدۂ نفس اور موت کے بعد کی زندگی اور اسکی تیاری سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح سے وہ کام جس میں یورپ میں لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں محض مادی اغراض کے لئے ہوتے ہیں، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو کسی نہ کسی مادی غرض و غایت پر وہ مبنی اور منتہی ہوتے ہیں مثلاً شہرت، تاریخ میں ذکر، جذبۂ مسابقت، قومی و وطنی اعزاز و فخر، ان میں کہیں خدا کی رضا مطلوب نہیں ہوتی، اسکے برخلاف مسلمان ہر کام میں خدا کی خوشنودی کا طالب ہوتا ہے اور خالص اسکی رضا کے لئے عمل کرنا چاہتا ہے جو چیزیں مغرب میں عین مقصود ہیں وہ یہاں قابل احتراز اور لائق اجتناب ہیں جو چیز مغرب میں فخر و ناز کی ہے، مسلمان کے لئے ننگ و عار ہے۔ ع

انچہ فخر تست آں ننگ من است

قرآن مجید کی آیت ہے:-

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝

(الکہف - ۱۰۳-۱۰۵)

کہو ہم تمھیں خبر دیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکہ میں پڑے ہیں کہ وہ خوب کام انجام دے رہے ہیں۔ یہی ہیں جو اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اس کے حضور میں حاضر ہونے سے منکر ہوئے پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور اس لئے قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن تسلیم نہ کریں گے

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَنْثُورًا

(الفرقان - ۲۳)

اور دنیا میں جو یہ لوگ عمل کر گئے ہیں ان کی طرف ہم متوجہ ہوں گے اور ان کو اس طرح رائیگاں کر دیں گے جیسے بکھری ہوئی دھول۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری کی بنا پر لڑتا ہے ایک شخص غیرت و جوش میں آکر، اور ایک شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے، ان میں سے کون سا اللہ کے راستہ میں شمار ہوگا، آپ نے فرمایا صرف وہ جنگ جو اس غرض سے کی جائے کہ اللہ کی بات اونچی ہو وہی فی سبیل اللہ ہے، اس اصول و

حقیقت کے جو لوگ قائل تھے ان کو اپنے کاموں اور نیکیوں کے چھپانے کا بڑا اہتمام رہتا تھا اور اس پر بھی ہر وقت ریا کا کھٹکا لگا رہتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خاص دعا کے الفاظ ہیں "اللّٰھُمَّ اجْعَلْ عَمَلِیْ کُلَّہٗ صَالِحًا وَاجْعَلْہُ کُلَّہٗ لِوَجْھِکَ خَالِصًا وَلَا تَجْعَلْ لِغَیْرِکَ فِیْہِ شَیْئًا" یعنی اے اللہ میرے تمام اعمال کو صالح بنا اور اُن کو خالص اپنی ذات ہی کے لئے رکھ اور اپنے سوا کسی کا اس میں حصہ نہ بنا۔

اقتصادی وحدۃ الوجود

مادی نقطۂ نظر اور مادی طریق فکر یورپ میں استغراق و فنا کے ایسے درجہ کو پہونچ گیا ہے کہ مغربی اشخاص اور اہل فکر ماسوا کو بالکل بھول گئے، فلسفۂ اشتراکیت کا امام کارل مارکس (KARL MARX) (۱۸۱۸ - ۱۸۸۳) اس مادی استغراق اور فنا کی بہترین مثال ہے، اس کے نزدیک پوری انسانی تاریخ (سوائے اس زمانہ کے جب زندگی عالم طفولیت میں تھی)، معاشرتی طبقوں کی باہمی جنگ کی داستان ہے، وہ اقتصادی پہلو کے علاوہ انسانی زندگی کے تمام دوسرے پہلوؤں کی اہمیت اور اثر کا منکر ہے وہ دین، اخلاق روح، قلب، حتیٰ کہ عقل کو کوئی وزن نہیں دیتا اور اسکے نزدیک ان میں سے کسی کو بھی انسان کی تاریخ میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، تاریخ کی تمام جنگیں، بغاوتیں و انقلابات محض ایک انتقام تھا جو چھوٹا اور خالی پیٹ ایک بڑے اور بھرے ہوئے پیٹ سے لینا چاہتا تھا، وہ محض ایک جد و جہد تھی جو اقتصادی نظام کی تشکیل جدید، اور صنعتی پیدا وار کے طریقوں کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں پیش آئی، اور اس بنا پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ مذہبی جنگیں بھی اسکے

نزدیک اقتصادی طبقات کی باہمی کش مکش کا نتیجہ تھیں ایک جماعت دولت کے ذرائع اور پیداوار کے طریقوں پر قابض ہوگئی تھی اور دوسری اس میں شرکت کرنا اور اپنا واجبی حصّہ لینا چاہتی تھی یا ان کی از سر نو تشکیل و تنظیم کرنا چاہتی تھی، پہلی جماعت کے مدافعت کرنے پر وہ جنگیں، شورشیں اور انقلاب واقع ہوئے جن کو تاریخ مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے، یہ یکطرفہ فلسفہ کسی مذہبی جہاد، کسی دینی اصلاح، کسی روحانی جد و جہد کو اس کلیہ سے مستثنیٰ کرنے کے لئے تیار نہیں، یہ ہے مغرب کا مادّی تصوّف اور یورپ کا اقتصادی فلسفۂ وحدۃ الوجود۔

یورپ کا نعرہ، لاموجود الّا البطن والمعدہ

چوں کہ مشرقیوں پر روحانیت اور خدا شناسی اور خدا طلبی کا غلبہ تھا اس لئے اس سلسلہ میں جن لوگوں پر استغراق طاری ہوا اور مغلوب الحال ہوئے انھوں نے اللہ کے سوا ہر شئے کے وجود کی نفی کی اور غلبۂ حال میں لاموجود الا اللہ، کا نعرہ بلند کیا یورپ کے مفکرین پر چوں کہ مادّیت کا غلبہ تھا اور اس میں ان کو درجۂ استغراق و فنا حاصل تھا اس لئے اپنے غلبۂ حال میں انھوں نے اقتصادی پہلو کے علاوہ ہر چیز کی نفی کی اور لاموجود الّا البطن والمعدہ کی آواز بلند کی، مشرق کے صوفی انسان کو سایۂ ربّانی سمجھتے تھے اور بعض مغلوب الحال "انا الحق" پکار اٹھتے تھے مغرب کے مادّہ (یا معدہ) پرست، انسان کو صرف ایک وجود حیوانی سمجھتے ہیں اور آج ہر طرف سے انا الحیوان کی صدائیں آرہی ہیں۔

ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کا اثر

یہ محض خیال آرائی نہیں ہے انیسویں صدی عیسوی سے یورپ میں ایسے نظریات اور علمی تحقیقات پیش آئے جن سے انسان اور اس کے مسائل زندگی کے متعلق حیوانی نقطۂ نگاہ کی تائید اور تقویت ہوئی، ڈاروِن نے ۱۸۵۹ء میں اپنی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ جانور ہے جو اپنے ہزاروں سال کے نوعی سفر میں منزل بمنزل درجہ بدرجہ (Amoeba) سے بندر اور بندر سے انسانی شکل کو پہونچا، اس کتاب نے سارے یورپ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور وقت کا سب سے بڑا موضوع بحث اور موضوع سخن بن گیا، اس نظریۂ ارتقا نے انسانی مسائل پر غور کرنے کا رُخ بدل دیا، اور حیوانات کی تاریخ نشاۃ وارتقا اور اُنکے عادات و اطوار و خصائص سے خاص دلچسپی پیدا کردی، اس نظریہ نے یہ اعتقاد پیدا کردیا کہ کائنات بغیر کسی غیر طبیعی طاقت کی مداخلت کے چل رہی ہے اور طبیعی قوانین کے علاوہ اس کی کوئی علت نہیں۔

مبادی اور نتائج اور ذہنی و اخلاقی، اور عملی اثرات میں یہ نظریہ دین سے تناقض رکھتا ہے بلکہ یہ ایک مستقل دین ہے جو کسی اور دین کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا، اہلِ مذہب کی مخالفت اور اُن کے خطرات اس بارہ میں حق بجانب تھے، پروفیسر جوڈ لکھتا ہے :-

"اس پریشانی اور استعجاب کا اندازہ لگانا ہمارے لئے اس وقت مشکل ہے جو ہمارے اسلاف کو ڈاروِن کی کتاب کے شائع ہونے

پر پیش آیا، ان شہادتوں سے جن پر اسکے نتائج تحقیق مبنی تھے ڈارون نے ثابت کیا (یا خیال کیا جاتا ہے کہ ثابت کیا) کہ کرۂ ارض پر زندگی کا ارتقا اموبا (Amoeba) اور جیلی فش (Jenytisn) کے ابتدائی ظہور سے اسکی انتہائی شکلوں تک مسلسل ہوا ہے، ہم زندگی کے ترقی یافتہ ترین اور آخری شکل ہیں۔

اسکے برعکس وکٹوریہ کے زمانہ کے لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ انسان بجائے خود ایک خاص مخلوق ہے اور اس نے درحقیقت فرشتہ کے درجہ سے تنزل کیا ہے، لیکن ڈارون کے نزدیک انسان ایک ترقی یافتہ بندر ہے، اس زمانہ کے لوگوں کو یہ بڑا شاق گزرا کہ انسان انحطاط پذیر فرشتہ کے بجائے ایک ترقی یافتہ بندر ثابت ہو، ان کو یہ نظریہ بالکل پسند نہیں آیا اور انھوں نے انسان کو اس مخمصہ سے نجات دینے اور اس عار کو دور کرنے کی مختلف کوششیں کیں۔ [۱]"

علمی اور تحقیقی طور پر مختلف تقائص اور خلا موجود ہونے کے باوجود عوام اور لوگوں کی اکثریت نے سمجھے اور بے سمجھے اس نظریہ کو قبول کر لیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہن پہلے سے اس کے لئے تیار تھے، لوگوں کو اس میں ایک خوبی یہ بھی نظر آئی کہ وہ مذہب اور اہل مذہب کا حریف تھا، اہل مذہب کے لئے

---

[۱] GIUDE TO MODERN WICKEDNESS P 235.

خیالات اور ذوق کے اس بہتے ہوئے دھارے اور رسائل و مطبوعات کے اس سیلاب کا مقابلہ ناممکن ہو گیا اور بالآخر کلیسا نے اس جنگ میں ہتھیار ڈال دیئے۔

خیالات، تہذیب، ادب و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں اس نظریہ نے بڑا گہرا اور وسیع اثر ڈالا عہد فطرت کی طرف بازگشت کا خیال عریانی کا ذوق اور بہت سے اعمال و اخلاق اسی خیال کا نتیجہ ہیں کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بقول مسٹر شپرڈ "انگلستان میں ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جو انسانوں کی خانگی زندگی کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہو وہ صرف حیوانات کے گلہ کی زندگی ہی سے واقف ہے۔"

وطنیت و قومیت کا نشو ونما

اوپر گزر چکا ہے کہ وطنیت و قومیت کا جذبہ قومی فخر، اور جغرافیائی تقسیم کا زیادہ لحاظ، مغربی فطرت کا خاصہ ہے جو مغربی نسل میں برابر منتقل ہوتا رہا ہے، مسیحیت جب یورپ میں پہنچی تو اگرچہ وہ اپنی اصلی شکل میں نہ تھی اور اس میں کمزوری پیدا ہو چکی تھی، لیکن اس میں بہرحال حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا اثر اور آسمانی مذاہب کی خصوصیات تھیں، مذہب خواہ کتنا بگڑ جائے، نسل و وطن کی بنا پر انسانوں کے درمیان تفریق کا قائل نہیں ہو سکتا اس لئے اس نے یورپ کی منتشر قوموں کو رومی کلیسا کے ماتحت دین کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا اور عیسوی دنیا کو ایک خاندان بنا دیا، تاریخ اخلاقیات کے مصنف کے بقول حب وطن اور قومی عصبیت عام خلائق دوستی میں منتقل ہو گئی، اور اس ذہنی تبدیلی کا

اندازہ مسیحی علماء کے اقوال سے ہوتا ہے مثلاً ٹرٹولین کہتا ہے کہ ہم ایک جمہوریت کو جانتے ہیں اور وہ عالم ہے اور بیکن کہتا ہے کہ ہمارا ایک وطن ہے جس کی بنا لفظ خدا سے پڑی ہے۔

لیکن جب لوتھر (Martin Lutner (۱۴۸۳، ۱۵۴۶) نے اپنی مشہور دینی اصلاحی تحریک کا علم بلند کیا اور رومی کلیسا کی مخالفت میں جرمن قوم سے مدد لی اور بالآخر رومی کلیسا کو اس مقابلہ میں شکست ہوئی تو قومیں جس ہار میں گندھی ہوئی تھیں اس کی لڑی ٹوٹ گئی اور وہ منتشر و متفرق ہو گئیں، وہ روز بروز اندرونی طور پر خود مختار ہوتی گئیں، یورپ میں مسیحیت کے زوال کے ساتھ ساتھ قومیت و وطنیت کا عروج ہوتا گیا گویا کہ دین و مذہب اور قومیت و وطنیت ترازو کے دو پلڑے تھے کہ جس قدر ایک نیچا ہوتا تھا اسی قدر دوسرا اونچا ہوتا تھا اور یہ معلوم ہی ہے کہ دین کا پلڑا ہلکا ہی ہوتا چلا گیا، اس لئے اس کے حریف یعنی قومیت و وطنیت کا پلڑا بھاری ہوتا گیا، مشہور انگریز فاضل لارڈ لوتھین (Lord Lothian) نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"جب لوتھر کی تحریک نے (جس کو دینی اصلاح کی تحریک کہا جاتا ہے) یورپ کی ثقافتی (کلچرل) اور دینی وحدت کا خاتمہ کر دیا تو براعظم مختلف قومی حکومتوں میں منقسم ہو گیا، جن کے جھگڑے اور مقابلے دنیا کے امن کے لئے ایک دائمی اور مستقل خطرہ بن گئے"

دینی انحطاط اور دینی اصول و اخلاق کے زوال کی وجہ سے قومیت اور

وطنیت کے طرز خیال کو جو فروغ ہوا اس کی طرف بھی فاضل موصوف نے توجہ کیا ہے:۔

"دین جو انسان کا ضروری رہنما، اخلاقی مقصد کے حصول اور انسانی زندگی کی عزت اور معنویت کا واحد ذریعہ ہے اسکے اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا ایسے سیاسی مذاہب و خیالات کی گرویدہ ہو گئی جن کی بنیاد نسل اور طبقات کے اختلاف پر ہے علوم طبیعی کے اثر سے اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مادی ترقی ہی اعلیٰ مقصد ہے اس وجہ سے زندگی کی مشکلات اور اسکی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یورپ کے لئے اپنی روح اور زندگی کے درمیان ایسی تطبیق دینا مشکل ہو گیا جو اس کو اس عصر کی سب سے بڑی مصیبت قومیت سے نجات دے سکے"

مغرب کا تکبر اور مشرق کے خلاف تعصب

مذہبی نظام کی شکست اور جذبہ قومیت کے فروغ کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ پورا یورپ پورے مشرق کے مقابلہ میں ایک حریف کیمپ بن گیا اس نے مغرب و مشرق آرین نسل اور دوسری نسلوں کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ لیا اور یہ طے کر لیا کہ اس خطہ کے اندر جتنی قومیں، تہذیبیں اور علم و ادب واقع ہیں ان کو دنیا کی تمام قوموں، تہذیبوں اور علم و ادب پر برتری اور فوقیت حاصل ہے ان کو حکومت کرنا، باقی رہنا اور پھولنا پھلنا چاہئے اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کو مغلوب و محکوم رہنا چاہئے اور زندگی و ترقی کا کوئی حق نہیں، بعینہ یہی

طرز خیال اپنے زمانہ میں یونانیوں اور رومیوں کا تھا، وہ دنیا میں صرف اپنے کو مہذب شمار کرتے تھے اور باہر کی ہر چیز کو خصوصاً جو چیز بحر اٹلانٹک کے مشرق میں واقع ہو بربری کے نام سے پکارتے تھے۔

قومیت کی حد بندیاں

یورپ کی قوموں اور سلطنتوں نے اپنے کو ایک مستقل دنیا فرض کر لیا ہے، قدرت نے پہاڑوں اور دریاؤں کے جو طبعی حدود قائم کر دیئے ہیں اور خود انھوں نے اپنے گرد سیاسی مقصد اور استعمار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچ لئے ہیں اُن کے نزدیک اُن کے باہر دنیا اور انسان کا وجود نہیں پایا جاتا ان کو ان گھروندوں کے باہر کسی چیز کا احترام اور قدر نہیں انھوں نے خود اپنے کو ایک مستقل معبود بنا لیا ہے اور عبادت و تقدیس کا جو تعلق عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہیئے انھوں نے اس خود ساختہ معبود کے ساتھ قائم کر لیا، اسی کے لئے ان کی قربانیاں ہیں اسی کے راستہ میں جنگ ہو اسی کی خاطر جینا اور مرنا ہے، اس پر چڑھاوے کے لئے بے تکلف صدہا انسانوں کا خون بہایا جاتا ہے، اس دین قومیت کا عقیدۂ اولین یہ ہے کہ قوم ہر چیز پر مقدم اور ہر چیز سے بالا و برتر ہے، اس قوم سے افضل، زیادہ شریف، زیادہ ذکی، زیادہ طاقتور، حکومت و سیادت، قوموں کی نگرانی و اتالیقی اور دنیا کی حفاظت کی اہل، سطح زمین پر کوئی دوسری قوم نہیں پائی جاتی، اس کے دریاؤں کا پانی امرت، اس کی مٹی سونا، اور اسکے کانٹے پھول ہیں، یہ دین قومیت کسی انسان کو کسی ملک میں رہنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دیتا جب تک وہ اس پر ایمان نہ لائے۔

قوم پرستی کا تخم ایک ہی طرح کے برگ و بار لاتا ہے یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم، قوم پرستی پر ایمان رکھتی ہو اور دست درازی نہ کرتی ہو یا نہ کرنا چاہتی ہو، اور اپنے سوا دوسروں کی تحقیر و تنقیص سے پاک ہو جیسے کہ یہ ممکن نہیں کہ انسان شراب کے جام پر جام چڑھائے اور نہ وہ بہکے نہ اُسے نشہ آئے، ~~۵~~

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

خصوصاً جب کہ علم، ادب، شعر، فلسفہ، تاریخ، یہاں تک کہ علوم طبعیہ اس نشۂ قومیت کو اور تیز اور اس شراب کو دو آتشہ بناتے رہتے ہیں اور ہر طرح سے قوم میں نسلی غرور و تعلّی اور اپنے ماضی پر فخر و تکبر کی پرورش ہوتی رہتی ہے اور کسی قسم کی اخلاقی اور مذہبی رکاوٹ نہیں ہوتی اور رہنمائی بھی ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو قومی شوکت و عظمت کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتے۔

قوم پرستی کے عناصر نفرت اور خوف

نفرت اور خوف قوم پرستانہ زندگی کے ضروری عناصر ہیں جن کے بغیر اس میں جان نہیں آتی، قوم پرستی کا جوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا اور اگر پیدا ہو جائے تو باقی نہیں رہتا جب تک کہ قوم کے لئے کوئی چیز نفرت کرنے کے لئے اور کچھ ڈرنے کے لئے نہ ہو، چنانچہ قومی رہنما، نفرت اور خوف کے ذریعہ اسکے جذبات برانگیختہ کرتے رہتے ہیں اور اسکی اس دُکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان و اشتعال اور جوش و خروش پیدا کر دیتے ہیں، وہ نفرت اور خوف کی آگ بجھنے نہیں دیتے بلکہ رائی کا پہاڑ بنا کر، چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بڑھا کر اور کسی نہ کسی حقیقی یا فرضی حریف کو سامنے لا کر قوم کے جذبۂ نفرت و خوف کو زندہ اور

متحرک رکھتے ہیں، اور اسی میں اپنی حکومت یا قیادت کی زندگی اور اپنی بقا سمجھتے ہیں، پروفیسر جوڈ نے اسکی جو فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل و توجیہ کی ہے ــــ وہ حسب ذیل ہے :۔

"وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں، جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لئے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لئے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کرلیں جس سے وہ نفرت کرے، اور اس کے لئے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کرلیں جس سے وہ ڈرے، میں ہی اگر قوموں کو متحد کرنا چاہوں تو مجھے چاہئے کہ میں اُن کے لئے کسی اور سیارہ پر کوئی دشمن ایجاد کردوں، مثلاً چاند پر جس کو یہ سب قومیں ڈریں، اس بنا پر قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرنے میں نفرت اور خوف ہی کے جذبات کے زیر اثر ہیں انھیں جذبات پر ان سلطنتوں پر حکمرانی کرنے والوں کی زندگی موقوف ہے اور انھیں جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد ہے"[1]

---

[1] Guide to moder n Wiekedness P. 153

واقعہ یہ ہے کہ خالص قوم پرستانہ ذہن اور اس کا طریقۂ کار Tech-nique یہی ہے کہ نفرت اور خوف کو قائم رکھا جائے، انھیں دو جذبات پر گزشتہ و موجودہ قوم پرست حکومتوں کی بنیاد رہی ہے اور انھیں دونوں جذبات نے ان بڑی بڑی جنگوں کو پیدا کیا ہے جن کی داستان تاریخ میں نظر آتی ہے اور جن کے آثار دنیا میں ابھی موجود ہیں، اسلام اس قوم پرستی کو (جو اپنی قوم کی جا و بے جا پاسداری اور دوسروں سے نفرت اور خوف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور جس میں اصول و صداقت کا سوال نہیں) "عصبیت" اور "حمیت جاہلیت" قرار دیتا ہے اور ہر ایسی امداد و حمایت و جوش و حمیت اور جنگ و جدال کو حرام قرار دیتا ہے جس کی بنیاد محض قومی یا جماعتی عصبیت پر ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف ارشاد فرمایا:۔

لیس منا من دعا الیٰ عصبیۃ، ولیس منا من قاتل علیٰ عصبیۃ، ولیس منا من مات علیٰ عصبیۃ[1]	وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی جتھہ بندی کی دعوت دے وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی جتھہ بندی اور پاسداری کے لئے جنگ کرے، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہو جو جتھہ بندی کی حالت میں مرے۔

جو شخص اس قوم پرستی اور جاہلی عصبیت کی جنگ میں مارا جائے اسکی موت "جاہلی" (غیر اسلامی) قرار دی گئی ہے اور ایک حدیث میں اسکو

[1] ابوداؤد

امت سے خارج بتلایا گیا ہے۔

من قاتل تحت راية عمية يغضب بعصبية او يدعو الى عصبية او ينصر عصبية فقتل فقتلة جاهلية [1]

جو شخص کسی اندھا دھند جھنڈے کے نیچے کسی جتھہ بندی کے جوش حمایت میں یا کسی جتھہ بندی کی دعوت میں یا کسی جتھہ بندی کی امداد میں جنگ کرے گا اور مارا جائے گا تو اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

ومن قتل تحت راية عمية يغضب للعصبية ويقاتل للعصبية فليس من اُمتي [2]

جو کسی اندھا دھند جھنڈے کے نیچے کسی پاسداری کے جوش میں یا پاسداری کی جنگ میں مارا جائے گا تو وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

اسلام نے عالم انسانی کو دو ہی حصوں میں تقسیم کیا ہے، خدا کے پیرو اور حق کے حامی شیطان کے پیرو اور باطل کے حامی، اس نے دوسرے شیطان کے پیروؤں، باطل کے حامیوں زمین میں فساد کرنے والوں اور

---

[1] مسلم ونسائی [2] مسلم

ظلم و سرکشی اور فسق و فجور پھیلانے والوں سے نفرت رکھنے اور اُن کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا ہے خواہ وہ کسی نسل اور وطن سے تعلق رکھتے ہوں، نفرت اور جنگ کے لئے اسکے یہاں تقسیم قومی و نسلی بنیادوں اور ملکوں اور شہروں کے حدود پر نہیں ہے بلکہ اصول عقائد و اعمال اور خدا سے وفاداری اور بغاوت اور انسانیت کے لئے نفع و مضرت کی بنیاد پر ہے۔

قومی عظمت و تکبر

قوم پرستوں کا قاعدہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی کمزور قوموں میں بھی قوم پرستی کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں، اس کے ادب زبان اور تہذیب کے حق میں قصیدہ خوانی اور اسکے عہد ماضی کی عظمت و شوکت میں مبالغہ آرائی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ قومیں قوم پرستی کے جذبات سے مغلوب اور نشۂ قومیت سے سرشار ہو جاتی ہیں، ان میں اپنے اوپر غلط اعتماد اور فخر و تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کر کے قومیت کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں محدود و محصور ہو جاتی ہیں، اُن کو کسی بین الاقوامی طاقت کسی عالمگیر رشتہ کی پرواہ نہیں ہوتی اور وہ اپنے وسائل اور طاقت پر پورا اعتماد کرتی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چند گھنٹوں میں کسی بڑی طاقت کا لقمہ بن جاتی ہیں، اور دنیا دُور سے اس کا تماشہ دیکھتی رہتی ہے اور سوائے زبانی ہمدردی کے اُن کو وقت پر کوئی مدد نہیں ملتی، قومیت کے حصار کو قائم کر کے اور اپنے کو دنیا سے علیحدہ اور ممتاز قرار دے کر وہ گویا بڑی طاقتوں کو شکار کی دعوت دیتی ہیں، وسط یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا اس جنگ میں جو کچھ انجام ہوا وہ دنیا کو معلوم ہے، لیکن افسوس

یہ ہے کہ وہ اسلامی ممالک جو عالمگیر دعوت و تحریک رکھتے ہیں اور جن کے پاس ایسی طاقت ہے جو (اگر ان میں اس سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو) یورپ کے قومی و وطنی اور سیاسی فلسفوں اور دعوتوں سے زیادہ طاقتور وسیع اور عمومی دعوت و تحریک ہے، ان کا رجحان بھی محدود قومیتوں کی طرف ہے، حالانکہ وہ اپنے وسائل سامان جنگ اور تعداد کے لحاظ سے یورپ کی ریاستوں سے کچھ زیادہ بہتر حالت میں نہیں ہیں اس لئے یہ توقع کرنا خوش فہمی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ اپنے ان محدود وسائل اور قومیت و وطنیت کے حدود کے اندر کسی خطرہ کا زیادہ دنوں تک مقابلہ کر سکیں گے۔

قوم پرست حکومتوں کا معیارِ عزت و عظمت

قوم پرست حکومتوں کا معیارِ عزت و عظمت یہ ہے کہ زمین کے بڑے بڑے رقبہ پر ان کا تسلط و اقتدار ہو، ملک کے حدود وسیع اور ذرائع آمدنی وافر ہوں، اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے اور ہمسایہ قوموں، یا حریف سلطنتوں کو خوف زدہ کرنے کا ان کے پاس پورا سامان ہو، ملک کے افراد میں قومی برتری، نسلی تفوق، اپنی قدیم تہذیب اور ادب و زبان اور تاریخ ماضی پر فخر و مباہات کا جذبہ پایا جاتا ہو اور دوسری معاصر قوموں کی کمزوری اور تہذیبی و ادبی بے مائیگی پر ایمان راسخ ہو، وہ ملک و سلطنت کی عزت و عظمت کی خاطر بڑے بڑے مجرمانہ و وحشیانہ اعمال کا بے تکلف ارتکاب کر سکتے ہوں، اور اپنی قوم اور اسکے افراد

کو حقیر سے حقیر فائدہ پہونچانے کے لئے بڑی سے بڑی حق تلفی اور ناانصافی میں ان کو باک نہ ہو، ایسی حکومت کا اخلاقی معیار خواہ کتنا پست ہو اسکے شہری، اخلاقی شعور، انسانیت کے احترام، اصُول کی پابندی سے خواہ کتنے ہی بیگانہ ہوں اور وہ حکومت اور اسکے ذمہ دار اخلاقی حدود قیود سے کتنے ہی آزاد ہوں وہ حکومت عزت و عظمت کے بلند معیار پر فائز اور دنیا کی ایک خاص قابل احترام اور لائق تقدیس حکومت ہے، پروفیسر جوڈ نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"قومی عظمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے پاس ایسی طاقت ہو جس سے وہ بوقت ضرورت اپنی خواہش و ارادہ کو دوسروں پر مسلط کر سکے، یہ قومی عظمت ان قوموں کے نزدیک آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے، اسکی نامعقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ معیار اخلاقی صفات کے بالکل ضد ہے، اگر کوئی ملک ایسا ہے جو صرف سچ ہی بولتا ہے، وعدے وفا کرتا ہے اور کمزوروں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرتا ہے تو ان قوموں کے نزدیک اسکی عزت کی سطح پست ہے، مسٹر بلڈون کے بقول عزت نام ہے اس قوت کا جس سے قوم خاص شرف و اعتبار کی مالک ہو اور نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ظاہر ہے کہ ایسی قوت جس سے قوم کو ایسا اعزاز و امتیاز حاصل ہو صرف قوت ہے آتش فشاں گولوں اور بموں پر، ان نوجوانوں

کی وفاداری اور وطن دوستی پر جن کا شہروں پران گولوں اور بموں کو پھینکنا محبوب مشغلہ ہے، پس جس عزت کے لئے کسی قوم کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان صفات و اخلاق کے بالکل ضد واقع ہوئی ہے جن کی بنیاد پر فرد کی تعریف کی جاتی ہے، میرے نزدیک تو قوم کو اسی قدر وحشی اور غیر مہذب سمجھنا چاہیئے جس قدر وہ ایسی عزت کی مالک ہو، فریب دہی، دغابازی اور ظلم سے عزت حاصل کرنا کسی انسان اور قوم کے لئے قطعاً باعث عزت نہیں ہے۔[1]

ہدایت یا تجارت

لادینی حکومتیں دراصل ایک ترقی یافتہ منظم اور محفوظ تجارتی ادارے ہیں، یہ حکومتیں بنیادی و اصولی طور پر نفع پہونچانے کے لئے نہیں بلکہ نفع اٹھانے کے لئے قائم ہوتی ہیں، وہ سرے سے کوئی اخلاقی پیغام اور اخلاقی مقصد نہیں رکھتیں نہ ان کے پیش نظر ملک یا قوم کی اخلاقی و روحانی ترقی، انسانوں کی ہدایت اور انسانیت کی حقیقی خدمت و بہبود ہوتی ہے، قدرتی طور پر ان کی اصل توجہ آمدنی کے ابواب نفع اٹھانے کی تدابیر اور سرکاری محاصل و مطالبات کی طرف ہوتی ہے اس غرض کے لئے وہ بے تکلف اخلاق و شرافت کے اصول کو نظر انداز کر دیتی اور اخلاقی تعلیمات و مصالح کو پس پشت ڈال دیتی ہیں جہاں کہیں

[1] GUID TO MODERN WICKEDNESS P. 153

اخلاقیات و مالیات کا تصادم ہوتا ہے وہاں وہ ہمیشہ مالیات کو ترجیح دیتی ہیں، ہر مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر معاشی و اقتصادی ہوتا ہے، اس طرز کی حکومتیں بداخلاقی و بے حیائی کی بہت سی قسموں کو کچھ قانونی قیود کے ساتھ (جو جرائم کا سدباب نہیں کرتا بلکہ اُن کو صرف نظم و ضابطہ میں لے آتے ہیں) جائز قرار دیتی ہیں، عصمت فروشی کا پیشہ ان کی حکومت میں قانوناً جائز ہوتا ہے، وہ خود وسیع پیمانہ پر اور منظم طریقہ پر سودی کاروبار کرتی ہیں، مہذب ناموں سے جوے کی اجازت ہوتی ہے، ناموں کی تبدیلی اور بعض ایسے قیود کے ساتھ جو حکومت کے مفاد کو محفوظ رکھتے ہیں، بہت سے اخلاقی جرائم جائز ہوتے ہیں، شراب کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ حکومت بعض اوقات اسکی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور اسکے خلاف جد و جہد کرنے والے کو سزا دیتی ہے، سینما اور فلم سازی کی صنعت جو اپنی موجودہ روح اور شکل میں اجرائے جرائم اور قوم میں بداخلاقی کا رجحان اور شہوانی میلانات پیدا کرنے کی سب سے بڑھ کر ذمہ دار ہے، حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، اور اسکے اخلاقی نقصانات کو جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی حکومت اس کو روک نہیں سکتی، ریڈیو کا سرکاری محکمہ قوم کی اخلاقی رہنمائی اور تربیت کے بجائے داروغۂ ارباب نشاط کی خدمت انجام دیتا ہے اور قوم میں سنجیدگی اور صحیح ذوق پیدا کرنے کے بجائے اسکے فاسد ذوقی اور سطحی رجحانات کا ساتھ دیتا ہے بلکہ اپنے پروگرام سے فخریہ رجحان پیدا کرتا ہے اور تعلیم و تربیت کا ذریعہ بننے کے بجائے آلۂ تفریح بن کر رہ جاتا ہے، قانون مطالع اور

حکومت کا محکمۂ احتساب جہاں سیاسیات و انتظامیات میں نہایت ذکی الحس، خورد بین اور سخت گیر ہوتا ہے، اور کسی ادنیٰ تنقید کو بھی بعض اوقات گوارا نہیں کرتا، وہاں اخلاقیات کے بارہ میں نہایت فراخ دل، فیاض اور بے پناہ واقع ہوتا ہے، غیر ذمہ دار اخبار نویس اور فحش نگار ادیب اور افسانہ نگار اپنے حقیر مادی فوائد کے لئے قوم میں اخلاقی طاعون پھیلاتے ہیں، لیکن جب تک پانی سر سے نہ گزر جائے حکومت کی مشین متحرک نہیں ہوتی، اس طرز حکومت میں اخلاق کے ساتھ قوم کی صحت بھی محفوظ نہیں رہتی، بعض تجارتی ادارے اپنے مضر صحت مصنوعات سے اہل ملک کی صحت کو مسلسل نقصان پہونچاتے رہتے ہیں اور نسلوں کو کمزور و بیمار بناتے رہتے ہیں لیکن حکام کو رشوت دیکر یا حکومتی و قومی اداروں کو گرانقدر مالی امداد پہونچا کر حکومت کے عتاب و احتساب سے بچتے رہتے ہیں، یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ حکومت کا نقطۂ نظر اور اس کا فکری محور اصول و اخلاق، ہدایت و اصلاح نہیں بلکہ مالی منفعت اور ظاہری خوشحالی ہے۔

اس طرز سیاست کا لازمی نتیجہ ہے کہ اہل ملک کے اخلاق روز بروز پست ہوتے چلے جائیں اور ایک خطرناک اخلاقی انحطاط اور اخلاقی امراض رونما ہوں، اور پوری قوم میں اور اسکے ہر طبقہ میں تاجرانہ ذہنیت اور نفع اندوزی اور موقع پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جائے اور ایک عام لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو، ہر شخص دوسرے کو زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی کوشش کرے اور اصول و اخلاق کا مسئلہ بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

اسکے برخلاف جو حکومتیں منہاج نبوت پر قائم ہوتی ہیں، ان کی بنیاد تجارت کے بجائے ہدایت پر ہوتی ہے، خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے ایک عامل سے (جس نے ان کے طرز حکومت کی وجہ سے آمدنی کی تخفیف اور حکومت کے مالی نقصان کی شکایت کی تھی) فرمایا "کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیلدار اور محصل بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے" اس ایک مختصر سے جملہ میں دینی حکومت کا پورا اصول سیاست اور طرز حکمرانی آگیا۔

دینی حکومت کی بڑی توجہ جمہور کے مذہب واخلاق اور ان کے اُخروی نفع وضرر کی طرف ہوتی ہے، اس کا اصل کام خراج اور محاصل کی تحصیل نہیں اور آمدنی کا اضافہ نہیں ہے، یہ سب چیزیں بالکل ضمنی اور ثانوی ہیں اور محض اصلاحی ودینی مقاصد کی تکمیل اور انتظام حکومت کے آلہ کار کے طور پر ہیں، وہ تمام سیاسی ومالی امور میں دینی نقطۂ نظر سے غور کرتی ہے، دینی اور اخلاقی اُصول ومبادی کو مادی فوائد ومصالح پر مقدم رکھتی ہے، اس کے حدود حکومت میں سود، جوا، شراب، زنا، فسق وفجور، بے حیائی کی قسمیں اور اسکے تمام محرکات وترغیبات اور ایسے مالی معاملات جن سے انفرادی نفع اور اجتماعی مضرت ہو، ممنوع اور خلاف قانون ہوتے ہیں، اگرچہ اسکی وجہ سے عظیم الشان مالی خسارہ برداشت کرنا پڑے اور حکومت کو وسیع آمدنی سے محروم ہونا پڑے، وہ مختلف قسم کی اصلاحات نافذ کرتی ہے اس کو صرف قوم کے افعال واعمال ہی سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کے

رجحانات اور ذہنیت پر بھی اس کی نگاہ ہوتی ہے، اس لئے کہ اخلاقی رجحانات ہی افعال و اعمال کو وجود میں لاتے ہیں، اگر اخلاقی رجحان درست نہ ہو تو اعمال و افعال کی اصلاح اور جرائم اور بداخلاقیوں کا سدباب کسی طرح ممکن نہیں، اسلئے وہ ان تمام چیزوں پر پابندی عائد کرتی ہے جو قوم میں بداخلاقی قانون شکنی اور نفس پرستی اور عشرت پسندی کا رجحان پیدا کرتی ہیں اور ان تمام اشخاص کو مجرم اور ملک کا دشمن گردانتی ہے جو لوگوں میں بے حیائی اور معصیت پسندی پیدا کرتے ہیں خواہ وہ اہل فن ہو یا تاجر یا اہل حرفہ، اس کو قیام امن و انتظام سلطنت کے ساتھ ساتھ اخلاقی نگرانی اور تہذیب نفس کا بھی پورا پورا اہتمام ہوتا ہے اس لئے کہ اسکی حیثیت صرف پولیس اور چوکیدار کی نہیں ہوتی بلکہ ایک شفیق مربی اور اتالیق کی بھی ہوتی ہے۔

اس نوع کی حکومت کا طبعی نتیجہ وہی ہے جو قرآن مجید میں مہاجرین اولین کے تذکرہ میں ایک پیشین گوئی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ	یہ (مظلوم) مسلمان وہ ہیں کہ اگر
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا	ہم نے زمین میں انھیں صاحب اقتدار
الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	کردیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ	وہ نماز کا نظم قائم کرینگے، زکوٰۃ کی
عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔	ادائیگی میں سرگرم ہوں گے نیکیوں
(الحج: ۴۱)	کا حکم دیں گے اور برائیاں

روکیں گے، اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

تجارت و صنعت کا اخلاق کے ساتھ عدم تعاون

افزائش دولت کے بحرانی عہد میں یا لارڈ میکالے کے پُر معنی الفاظ میں "کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولتمند بن جانے کا شوق رکھنے والے" لوگوں کے اقتدار میں ایک زبردست تجارتی مقابلہ جاری ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تفریحی صنعتوں آسائش کے سامان اور لباس و زینت کے انواع و اقسام کا ایک سیلاب ہر روز کارخانوں اور صنعت گاہوں سے شہروں پر اُمنڈا آتا ہے، بازار نئی تراش خراش کے لباس، نئی نئی قطع کے جوتوں اور جوتیوں سے اور دوسرے سامان آرائش سے جگمگاتے رہتے ہیں، پھر فوراً یہ چیزیں پرانی اور فرسودہ قرار پاجاتی ہیں اور برائے نام ترمیم کے ساتھ نیا سامان ان کی جگہ لیتا ہے، زینت حسن و ترقی کا معیار روزانہ بدلتا ہے اور برابر بڑھ رہا ہے، اس میں بڑا دخل کارخانوں کی اس بے ضرورت تفریحی پیداوار اور اس مسابقت و رقابت کو ہے جو تجارتی مرکزوں اور صنعت گاہوں میں کام کر رہی ہے، اور جو لوگوں کے اخلاق و معاشرت نیز قوت خرید سے بالکل بے نیاز ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی روز بروز گراں، معیار زندگی ہر گزرتے ہوئے دن سے بلند، زندگی کے مطالبات اور فرضی لوازم زندگی روز افزوں اور ان کی تکمیل کے لئے بڑی سی بڑی آمدنی ناکافی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قناعت ایک لفظ بے معنی بنتا جارہا ہے، سکون و اطمینان قلب خواب و خیال ہوگیا ہے، ہر شخص اپنے سامنے اپنے سے بلند معیار زندگی رکھتا ہے اور وہاں تک پہونچنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے، ماحول بھی اس سے اسی کا مطالبہ اور اسی کی توقع کرتا ہے

اور اسکے بغیر اس کو ذلیل سمجھتا ہے، ایک مدت اسی جد و جہد میں گزرتی ہے جب وہ بام مقصود تک پہونچنے لگتا ہے تو وہ اور بلند ہو جاتا ہے، اور ایک دوسرا بلند معیار زندگی سامنے آجاتا ہے اس طرح زندگی ایک غیر مختتم جد و جہد اور ایک ایسا ریس کا میدان ہے جس کا سرا اور کوئی انتہا نہیں، اس کا نفسیاتی اثر یہ ہے کہ زندگی میں تلخی اور کوفت بہت بڑھ گئی ہے، اور جو گھر آسانی کے ساتھ جنت کا نمونہ ہو سکتے تھے اور جن میں زندگی کے فطری و حقیقی لوازم سب پائے جاتے ہیں کسی نہ کسی موہوم اور خیالی چیز کی کمی کی وجہ سے دوزخ کا نمونہ ہیں، جہاں حقیقی عیش اور قلبی سکون عنقا ہو۔

ایک مسلمان عالم نے رومی و ایرانی تمدن کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جو کتاب کے ابتدائی صفحات میں گزر چکا ہے، اس کو سامنے رکھ کر دیکھئے موجودہ تمدن کا نقشہ اس سے ذرا بھی مختلف ہے؟ اس کا اخلاقی اثر یہ ہے کہ اخلاقی حدود و ضوابط برقرار نہیں رہے، محدود آمدنی میں غیر محدود مطالبات و تقاضوں اور فرمائشوں کی تکمیل رشوت اور غیر قانونی وسائل آمدنی کے بغیر ممکن نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رشوت (مختلف ناموں کے ساتھ) مجرمانہ داد و ستد اور مخفی ذرائع آمدنی کا بازار گرم ہے، اور ان سے زندگی میں جو مشکلات اور نظام میں جو ابتری پیدا ہو سکتی ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

یہ نتیجہ عموماً زندگی کے فطری اور حقیقی ضروریات کے تقاضے کا نہیں بلکہ فرضی اور غیر حقیقی ضروریات کے مطالبہ کا ہے، اسکی بندش محض قانونی گرفت اور استیصال رشوت کی کوششوں سے ممکن نہیں، اس کا ذمہ دار وہ نظام

زندگی ہے جو ایک مدت سے اخلاقی ہدایات سے محروم، اخروی جزا و سزا کے تصور سے عاری، اور وہ نظام تعلیم ہے جو اپنی یکسر مادہ پرستانہ ساخت کی وجہ سے اخلاقی حس اور ضمیر پیدا کرنے کی اتنا ہی ناکام ہے، جتنا بخاری یا حدادی کا پیشہ یا مصوری اور موسیقی کا فن ہو سکتا ہے، اس کا ذمہ دار وہ نظام حکومت ہے جو آمدنی اور پیداوار کے وسائل پر قابو رکھنا تو اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن تجارت و صنعت اور اخلاق کے باہمی تعاون و توافق کو ضروری نہیں سمجھتا۔

سائنٹفک ترقی اور عہد جدید کے اکتشافات

عہد حاضر اپنے طبیعی تحقیقات اور علمی و صنعتی اکتشافات و اختراعات کے لحاظ سے انسانی تاریخ کا ممتاز ترین عہد ہے اور اپنے اس امتیاز کی وجہ سے بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو اکتشاف و ایجاد اور برق و فولاد کے عہد کا لقب دیا جائے، یورپ کی امامت اس باب میں مسلم ہے اور اس کے محققین و موجدین کی ذہانت اور صناعی قطعاً محل بحث نہیں۔

لیکن ہم کو اس موقع پر ایک مخصوص تنقیدی نقطۂ نظر سے ان صنعتی کامیابیوں اور اکتشافات و ایجادات کا جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان ایجادات کا مقصد کیا ہے انھوں نے کس حد تک اپنے مقصد کو پورا کیا اور دنیا کے لئے یہ ایجادات خیر و برکت اور باعث راحت ثابت ہوئیں یا انھوں نے دنیا کی مشکلات و مصائب میں کچھ اضافہ ہی کیا۔

صنعتی اکتشافات کا مقصد اور اسلامی تعلیمات

ہمارے نزدیک ان علمی تحقیقات اور

صنعتی اکتشافات کا صحیح مقصد یہ ہے کہ انسان کو زندگی کے فطری سفر میں اپنی لاعلمی اور کمزوری کی بنا پر جو رکاوٹیں اور موانع پیش آتے ہیں ان پر قابو حاصل کیا جائے اور صحیح مقاصد کے ماتحت (جن میں زمین میں سربلندی اور فتنہ و فساد شامل نہیں) قدرت کی ان قوتوں اور دولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو اس عالم میں بکھری ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر انسان زمانۂ قدیم میں پیدل چلتا تھا، پھر یہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ وہ جانوروں سے فائدہ اٹھائے، اس نے بیل گاڑیوں سے کام لیا، پھر اس نے اور سرعت پیدا کرنی چاہی، تو اس نے صبا رفتار گھوڑوں کے ذریعہ دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کی، انسان کی فطرت میں قناعت اور سکون نہیں، اور جذبۂ سابقت بھی اس کو کسی ایک منزل پر ٹھہرنے نہیں دیتا اس کی ضروریات بھی بڑھتی گئیں اور راحت و سرعت کا معیار بھی بلند ہوتا گیا اور بتدریج وہ سواریاں وجود میں آتی رہیں جن میں سے ہر ایک پہلے کے مقابلہ میں زیادہ تیز ہے بحری سفر میں اس نے بادبانی کشتیوں سے دخانی جہازوں تک ترقی کی، حمل و نقل کے بری و فضائی آلات و وسائل بھی اس نقطۂ تک پہونچ گئے جو زمانۂ سابق کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے، اگر صحیح مقاصد کے ماتحت ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے غیر ضروری مشقت اور وقت اور قوت کے غیر ضروری استعمال سے بچ کر انکو اور کسی بہتر مصرف میں صرف کیا جائے تو یہ خدا کی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سفر کی اس راحت و سہولت اور سرعت کو بطور انعام

کے ذکر کیا ہے اور انسانوں پر اپنا ایک یہ احسان بتلایا ہے کہ وہ خدا کی دوسری مخلوقات کے ذریعہ سفر اور باربرداری کی بڑی بڑی مشقتوں سے بچ جاتے ہیں اور اس کو اپنی راحت و رحمت کی ایک نشانی اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے فرمایا:۔

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا	اس نے چار پائے پیدا کئے، ان
لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ	میں تمھارے لئے گرم کرنے والی
وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا	پوشش ہے، نیز طرح طرح کے فائدے
تَأْكُلُونَ ۝ وَلَكُمْ	اور بھی ہیں، ایسے جانور بھی ہیں جن کا
فِيهَا جَمَالٌ حِينَ	تم گوشت کھاتے ہو اور ان میں
تُرِيحُونَ وَحِينَ	تمھاری نگاہوں کے لئے خوشنمائی
تَسْرَحُونَ ۝ وَتَحْمِلُ	ہے، جب تم شام کے وقت انھیں
أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ	واپس لاتے ہو اور جب صبح کو چھوڑ
لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ	دیتے ہو، اور یہی جانور ہیں جو
إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ	تمھارا بوجھ اٹھا کر ایسے شہروں تک
إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ	لیجاتے ہیں کہ تم وہاں تک نہیں
رَّحِيمٌ ۝ وَالْخَيْلَ	پہونچ سکتے تھے مگر بڑی ہی جانکاہی
وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ	کے ساتھ بلا شبہ تمھارا پروردگار
لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً	بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور بڑا
وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝	ہی رحمت رکھنے والا ہے، اور

(النحل، ع ۱)

گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کر دیئے ہیں کہ تم ان سے سواری کا کام لو اور وہ لیے ان میں خوشنمائی اور رونق بھی ہے وہ اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کی تمھیں خبر نہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔

(بنی اسرائیل، ع ۷)

اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اسکے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں اور اچھی چیزیں اسکی روزی کے لئے مہیا کر دیں نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں ان میں سے اکثر پر اُسے برتری دی پوری برتری۔

وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ

اور جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے اور تمھارے واسطے کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔

لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ	تاکہ چڑھ کر بیٹھو ان کی پیٹھ پر پھر اپنے رب کا احسان یاد کرو جب اس پر بیٹھ چکو اور کہو پاک ذات ہے وہ جس نے اس کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم اسکو قابو میں نہ لاسکتے تھے اور ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے۔

(الزخرف ع ۱)

حضرت سلیمانؑ پر اپنے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ	اور سلیمان کے لئے ہوا کو مسخر کیا، صبح کی منزل اسکی ایک مہینہ کی راہ اور شام کی منزل ایک مہینہ کی۔
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۙ	پھر ہم نے ہوا اُن کے تابع کی اُن کے حکم سے چلتی نرم نرم جہاں پہونچنا چاہتے۔

لیکن ان نعمتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں ایک خدا شناس اور ناخدا شناس کی نفسیات میں بڑا فرق ہے، مومن کو اسکی ہدایت ہے اور

اس سے اسکی توقع کی گئی ہے کہ وہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے وقت اس بات کو ملحوظ و مستحضر رکھے کہ یہ محض اللہ کا انعام اور اسکی بخشش ہے، اس نے اس آزاد اور بے مہار جانور (یا بے حس و حرکت لوہے اور لکڑی کو) اس طرح اس کا تابع فرمان اور آلۂ کار بنا دیا کہ وہ اسکے حکم و ارادہ سے "تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ رُخَاءً حَیْثُ اَصَابَ" رواں دواں ہے اگر اسکی بخشی ہوئی عقل و تدبیر اور قوت و لیاقت نہ ہوتی تو یہ اسکے بس کی بات نہ تھی "لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ" اور عین اس حالت استفادہ میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ وہ قوت و قدرت کے باوجود اشیاء کے اصل خالق اور عالم کے فرمانروا کے حضور میں حاضر ہونے پر مجبور ہے اور اس کو ایک دن اس کا حساب دینا ہے کہ اس نے ان نعمتوں سے کیا فائدہ اٹھایا ان کو کہاں استعمال کیا اور ان کا کیا حق ادا کیا، چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا "وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ" مومن ان نعمتوں کو محض اللہ کا فضل و انعام اور شکر و ناشکری کا امتحان سمجھتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے الفاظ ہیں" ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ" (یہ میرے رب کا احسان ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں جو کوئی شکر کرے گا

تو اپنے واسطے اور اگر کسی نے ناشکری کی تو میرا رب تو بے نیاز و کریم ہے)
مومن اور غیر مومن کا ایک فرق یہ ہے کہ مومن ان آلات اور قوتوں
کو ان کے محل پر استعمال کرتا ہے اور ان سے اللہ کے دین اور نظام حق
کی اعانت و نصرت کا کام لیتا ہے جو ان اشیاء کی پیدائش کا اصل مقصد
ہے، فرمایا "وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ
لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ
اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ" (اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی قوت اور
لوگوں کے لئے فوائد ہیں (اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے) کہ اللہ ان
لوگوں کو جان لے جو (اسکے ذریعہ) اللہ کی اور اسکے پیغمبروں کی بن دیکھے
مدد کرتے ہیں اور بے شک اللہ (خود) قوی اور غالب ہے) خدا شناس
و خدا ترس انسان خدا کی بخشی ہوئی طاقت اور انعام کو مجرموں کی مدد کا
ذریعہ نہیں بناتا، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا "رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ
فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ" (اے رب جیسا تو نے مجھ پر
فضل کیا پھر میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا) پس صحیح دین ہی ہے
جو خدا کی شناخت، اور خدا کا خوف پیدا کرتا ہے جو تمام مخلوقات کے اصل
خالق اور عالم کے اصل فرمانروا کی معرفت پیدا کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ
انسان محض ان قوتوں اور دولتوں کا امین ہے اس کو اسکے حضور میں
پیش ہونا ہے اور ان قوتوں اور دولتوں کے مصرف و استعمال کا جواب
دینا ہے، دین ہی ہے جو انسان کو طاقت کے نشہ میں متوالا اپنے اختیارات

اور تصرف کی قوت دیکھ کر بے خود اور مدہوش ہونے نہیں دیتا، دین ہی ہے جو ان چیزوں کا جائز و صحیح محل استعمال اور مفید مصرف بتلاتا ہے وہی ان چیزوں کو کارآمد، بنی نوع کے لئے مفید اور دنیا کے حق میں باعث خیر و برکت بناتا ہے دین ہی ہے جو انسان کی عقل اسکی قوت اور اسکے اخلاق کے درمیان توازن و تناسب قائم رکھتا ہے، دین ہی ہے جو انسان کے ذاتی فوائد و مصالح کو اجتماعی فوائد و مصالح کے ساتھ مربوط و متناسب رکھتا ہے، دین ہی ہے جو انسان میں اپنی قوت و اختیارات کے مشاہدہ و احساس کے وقت ضبط و اعتدال اور فخر و استکبار کے بجائے عجز و نیاز اور بندگی کی شان پیدا کرتا ہے، قرآن مجید نے دونوں طرح کے نمونے پیش کئے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے عین جاہ و جلال میں فرمایا:-

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ	پروردگار! تو نے مجھے حکومت
الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي	عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور
مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ	نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا، اے آسمان و
فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ	زمین کے بنانے والے تو ہی میرا
أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا	کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت
وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي	میں بھی، ایسا کیجیو کہ دنیا سے
مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي	جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت
بِالصَّالِحِينَ ۝	میں جاؤں اور ان لوگوں میں
(سورہ یوسف ع ۱۱)	داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ نے جب اپنی قوت وحشمت اور رعب و دبدبہ ملاحظہ فرمایا تو بے ساختہ ان کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آئے:۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ	اے میرے رب مجھے توفیق دے
نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ	کہ میں تیرے احسان کا شکر
عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَ	کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے
اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا	ماں باپ پر کیا اور یہ کہ ایسے
تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ	نیک کام کروں جو تجھے پسند
بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ	ہوں اور مجھ کو اپنی مہربانی سے
الصّٰلِحِیْنَ ۔	اپنے نیک بندوں میں ملالے۔

(سورہ النمل ع ۲)

اس کے برخلاف جو لوگ دین کی دولت سے محروم اور خدا کو بھولے ہوئے تھے ان کو اپنی طاقت اور دولت پر ناز تھا اور وہ اپنے سے بلند و بالا کسی ہستی کو نہیں سمجھتے تھے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَکْبَرُوْا	اور قوم عاد کا قصہ یہ ہے کہ
فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ	انھوں نے ملک میں ناحق تکبر
وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ	کیا اور کہنے لگے کون ہے ہم
مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ یَرَوْا	سے زیادہ طاقت میں کیا دیکھتے
اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ	نہیں کہ اللہ جس نے ان کو بنایا
هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً	وہ ان سے زیادہ ہے طاقت میں

وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ۔ اور وہ ہماری نشانیوں کے منکر تھے۔

(حم سجدہ ع ۱)

زمانہ ماضی کے ایک بڑے دولتمند کا واقعہ سنایا ہے کہ اس سے کچھ معقول لوگوں نے کہا کہ اپنی دولت پر زیادہ ناز نہ کرو، اپنے مال و دولت سے آخرت کا سامان کرو اور اللہ کے احسان کا بدلہ احسان سے دو اور زمین میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔

إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۔ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ٥

(القصص ع ۸)

جب اس سے اسکی قوم نے کہا اترا مت، اللہ کو اترانے والے نہیں بھاتے اور جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلا گھر کما لے اور اپنا حصہ دنیا سے نہ بھول (یعنی حصہ موافق کھا، پہن اور برت) اور بھلائی کر جیسے اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور ملک میں خرابی ڈالنا نہ چاہ، اللہ کو فساد کرنے والے پسند نہیں۔

قارون نے اس کا جواب دیا کہ اس مال و دولت کے سلسلہ میں

میں کسی کا شرمندۂ احسان و ممنونِ منت نہیں یہ محض میری عقل و دانائی اور علم و ہنر مندی کا ثمرہ ہے " قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ " (کہا یہ تو مجھے اپنے ایک خاص علم کی بنا پر ملا ہے۔)

اپنی طاقت کے زعم و احساس اور اپنے ا وپر کسی اور زبردست ہستی اور بالاتر طاقت کے انکار کا نتیجہ وہ نشۂ قوت ہے جو انسان کو مجنون بنا دیتا ہے اور جس کو کوئی اخلاقی ہدایت و تعلیم، کوئی جذبۂ انسانیت اور کوئی مصلحت قابو میں نہیں رکھ سکتی، افراد اسکے آہنی پنجہ میں مجبور و بلا اختیار رہتے ہیں، اور کمزور قومیں اسکے پاؤں کے نیچے سبزہ کی طرح پامال ہوتی رہتی ہیں، قوم عاد سے اسکے پیغمبر نے کہا " وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ " (اور جب تم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو اسکو بڑی سختی سے پکڑتے ہو) سرکشی اور تکبر فتنہ و فساد، مردم آزاری اور آدم کشی اس کا لازمی نتیجہ ہے، " اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ " (بے شک فرعون نے ملک میں سر اٹھایا اور اسکے رہنے والوں کو کئی گروہوں میں بانٹ دیا، ایک گروہ کو بالکل کمزور کر رکھا تھا ان کے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا، بے شک وہ مفسدوں میں تھا۔

صحیح دین کے گہرے اثرات اور اخلاقی تربیت کے بغیر جب

قوت، علم اور صنعت ترقی کرتی ہے تو اس کے طبعی نتائج وہی ہوتے ہیں جو اوپر بیان کئے گئے۔

یورپ میں قوت و اخلاق اور علم و دین کا عدم توازن

بد قسمتی سے یورپ میں قوت و اخلاق اور علم و دین کا توازن صدیوں سے بگڑا ہوا ہے، نشأت جدیدہ کے بعد سے مادّی قوت اور ظاہری علم بڑی سرعت سے ترقی کرتے رہے اور دین و اخلاق میں تنزل و انحطاط واقع ہوتا گیا، کچھ مدت کے بعد ان دونوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا اور ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جس کے ترازو کا ایک پلڑا آسمان سے باتیں کرتا ہے اور دوسرا تحت الثریٰ میں ہے یہ نسل ایک طرف اپنے صنعتی کمالات و عجائبات اور اپنے خوارق عادات کے لحاظ سے نیز مادہ اور طبعی قوتوں کی تسخیر میں مافوق البشر معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنے اخلاق و اعمال، اپنے حرص و طمع، تنگ دلی، اور بے دردی میں اسکی سطح چوپایوں اور درندوں کی سطح سے بلند نہیں، اسکے پاس زندگی کے تمام وسائل ہیں لیکن اسکو جینا نہیں آتا، اسکو زندگی کے انتہائی و تکمیلی العلوم و مسائل معلوم ہیں لیکن وہ انسانی زندگی اور تمدن و اخلاق کے بالکل ابتدائی اصول و مبادی سے نا واقف ہے اسکی علمی و صنعتی بلند پروازیوں اور اخلاقی پستیوں میں قطعاً کوئی تناسب نہیں ہو طبعی علوم نے جو زبردست طاقت اسکو بخشی ہے اسکے استعمال کا وہ

سلیقہ نہیں رکھتی، پروفیسر جوڈ نے خوب کہا ہے کہ علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی، لیکن ہم اس کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کر رہے ہیں، ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:-

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے، اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے، ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کر سکتے ہیں، سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (BBC) کی آواز سنا کرتے ہیں، ٹیلی فون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، برقی تصویریں آنے لگیں، بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے ہیں، بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت کھینچے جا سکتے ہیں۔ کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں، ربر کی سڑکیں بنتی ہیں، ایکسرے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندرونی حصہ کو جا کر دیکھ سکتے ہیں، تصویریں بولتی اور گاتی ہیں، لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے، برقی موجوں سے بالوں میں پیچ و خم پیدا کیا جاتا ہے، آبدوز کشتیاں قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک اڑ کر

جاتے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام و حفاظت کے ساتھ کھیلیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور نوّے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا، اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے Pendin Sands میں تین یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کرکے ریکارڈ قائم کیا تھا یا کسی ہوا باز نے اسکو سے نیویارک کی مسافت مجھے یاد نہیں بیس گھنٹہ میں یا پچاس گھنٹہ میں طے کی تھی، جب میں سب کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اُڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔[1]

علم و صنعت اور اخلاق و انسانیت کے درمیان جو عظیم فاصلہ موجودہ مغربی تہذیب نے پیدا کر دیا ہے اور موجودہ تہذیب اپنا مقصد پورا کرنے اور انسانیت کی صحیح خدمت انجام دینے میں جس طرح ناکام رہی ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے

---

[1] Guide To modern Wickedness

دوسرا مغربی فاضل ڈاکٹر الکسِس کیرل Alexis Carrel اپنی کتاب Man the unknown میں لکھتا ہے :-

"موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعے سے حاصل کرے لیکن یہ ذرائع انسان کو دولت کے مقصد تک نہیں پہونچاتے، یہ انسان میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں، ان کے اثر سے انسان صبر و ضبط سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرنے لگتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب جدید ایسا انسان پیدا ہی نہیں کر سکتی جن میں فنی تخلیق، ذکاوت اور جرأت ہو، ہر ملک کے صاحب اقتدار طبقہ میں جس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے ذہنی اور اخلاقی قابلیت میں نمایاں انحطاط نظر آتا ہے، ہم محسوس کر رہے ہیں کہ تہذیب جدید نے ان بڑی بڑی امیدوں کو پورا نہیں کیا جو انسانیت نے اس سے وابستہ کی تھیں اور وہ ان لوگوں کو پیدا کرنے میں ناکام رہی جو ذہانت اور جرأت کے مالک ہوں اور تہذیب کو اس دشوار گزار راستہ پر سلامتی کے ساتھ لے جا سکیں جس پر آج وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ افراد انسانی نے اس تیزی کے ساتھ ترقی نہیں کی جس تیزی کے ساتھ ان اداروں (institutions) نے ترقی کی ہے جو انسانی دماغ

کا نتیجہ ہیں، یہ اصل سیاسی رہنماؤں کے ذہنی اور اخلاقی نقائص کا نتیجہ ہے اور ان کی اس جہالت کا جس نے موجودہ اقوام کو خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے، طبعی علوم اور صنعتی فنون نے انسان کے لئے جو ماحول تیار کیا ہے وہ انسان کے مناسب حال نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ برجستہ ہے کسی سابق نقشہ یا خورد بینی کے بغیر بنی ہیں اور اس میں انسان کی شخصیت کے ساتھ مطابقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا، یہ ماحول جو محض ہماری ذہانت اور ایجادات کی تخلیق ہے ہمارے قد و قامت اور ہماری صورت کے مطابق نہیں، ہم مسرور نہیں ہیں، ہم ایک روز افزوں اخلاقی اور عقلی انحطاط میں مبتلا ہیں، جن قوموں میں صنعتی تمدن پھلا پھولا اور اپنے عروج کو پہونچا ہے وہ پہلے سے بہت کمزور ہیں اور وہ بڑی تیز رفتار کے ساتھ وحشت و بربریت کی طرف بڑھ رہی ہیں لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ان کو اس وقت اس باغی و دشمن انسانیت ماحول سے کوئی قوت بچا نہیں سکتی جو طبعی علوم نے ان کے گرد حصار کی طرح کھینچ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری تہذیب نے پچھلی تہذیبوں کی طرح زندگی کے لئے ایسی شرطیں عائد کر دی ہیں جو بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر، زندگی کو ناممکن العمل بنا دیں گی، ہم مادیت کا جتنا علم رکھتے ہیں اس کے مقابلہ میں زندگی کا علم اور یہ کہ انسان کو کس طرح زندگی گزارنی چاہئیے بہت کم رکھتے ہیں اور ہمارا علم اس بارہ میں

ابھی تک بہت پیچھے ہے اور اس کم علمی کا نقصان ہم بھگت رہے ہیں۔
ایجادات و انکشافات میں جس تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے، طبیعی علوم فلکیات اور علم الکیمیا کے انکشافات کو زیادہ اہمیت دینے سے کچھ فائدہ نہیں، راحت، تعیش، جمال، جسامت اور تکلفات زندگی میں اضافہ و ترقی سے کیا فائدہ، جب ہمارا معاشرہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ہم اس کو صحیح راستہ پر نہ لگا سکیں، ایسے نظام زندگی کو محکم سے محکم تر بنانے سے کیا فائدہ جس سے اخلاقی پہلو بالکل خارج کر دیا جائے اور عظیم قوموں کی بہترین صفات نکال دی جائیں، ہمارے لئے مناسب بات یہ تھی کہ تیز رفتار جہازوں، زیادہ آرام دہ موٹروں، زیادہ ارزاں ریڈیو اور زیادہ عمدہ رسد گاہوں کے بجائے اپنے آپ کی طرف زیادہ توجہ کریں، میکانکی، طبیعی اور کیمیاوی علوم کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ ہم کو ذہانت بخش دیں، اچھا اخلاقی نظام، اعصابی توازن اور امن و سکون عطا کریں۔

آلات و وسائل کا غلط استعمال حقیقت یہ ہے کہ یہ مصنوعات، ایجادات اپنی جگہ پر بالکل معصوم اور غیر جانبدار ہیں وہ انسان کے ارادہ اور اس کے عقل و اخلاق کے تابع ہیں وہ اپنی ذات سے نہ خیر ہیں نہ شر، انسان ہی ان کو خیر اور شر بنا سکتا ہے، بلکہ بعض بذات خود خیر ہوتی ہیں لیکن انسان غلط استعمال اور اپنی طبیعت و تربیت کی خرابی سے ان کو شر بنا لیتا ہے اسئے

سب سے زیادہ اس کے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان آلات اور مصنوعات کے استعمال کرنے والے کس قسم کے اخلاق و سیرت اور کس قسم کے مقاصد رکھتے ہیں۔

مغربی قومیں مدت دراز سے یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ لذت و راحت، مادی انتفاع، سربلندی اور غلبہ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور قابل حصول مقصد نہیں ہے، طبعی طور پر انھوں نے اپنی ساری قوت علم اور ذہانت کو ان مقاصد کے حصول میں صرف کیا اور ایسے آلات و وسائل ایجاد کئے جن سے یہ مقاصد زیادہ آسانی اور سرعت کے ساتھ حاصل ہو سکیں، رفتہ رفتہ وسائل خود مقاصد بن گئے، اور اختراع و ایجاد اپنی جگہ پر خود ایک بڑا مقصد قرار پا گیا، اور جس طرح بچوں کو کھلونوں سے دلچسپی ہوتی ہے، اس طرح ان کو ایجادات و اختراعات سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ یورپ میں معیار بدلتے رہے ہیں، کچھ مدت پہلے یہ خیال غالب تھا کہ تمدن نام ہے راحت کا اور راحت زندگی کا سب سے بڑا آئیڈیل تھا، پھر مختلف محرکات و اسباب کی بنا پر اور کچھ حصول راحت کے لئے سرعت و تیز رفتاری کی کوشش کی گئی اور زندگی کے ہر شعبہ میں سرعت پیدا کرنے کا مقابلہ شروع ہوا، لوگ اس میں ایسے محو ہوئے کہ رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگے کہ تمدن نام ہی ہے سرعت کا، اب سرعت زندگی کا آئیڈیل بن گیا، پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:۔

ڈزریلی Disraeli کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کا اعتقاد تھا کہ "تمدن نام ہے راحت کا" لیکن جہاں تک ہمارے زمانہ کی سوسائٹی کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ تمدن نام ہے سرعت کا، سرعت زمانہ موجودہ کے

نوجوان کا دیوتا ہے، اس کے آستانہ پر وہ سکون راحت، امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے ؎

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیا مقاصد ہیں جن کے لئے یہ آلات و وسائل استعمال ہو رہے ہیں ان سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور اس کو اپنے نوع انسانی کے لئے کس حد تک مفید و کارآمد بنایا جا رہا ہے، اور انسان کی حالت ان قوتوں اور وسائل کی موجودگی میں چند صدی پہلے کے لوگوں سے کہاں تک بہتر ہے، اس کا جواب ایک مغربی عالم اور مصنف نقاد کی زبان سے مناسب ہوگا، پروفیسر جوڈ لکھتا ہے۔

"بلاشبہ ہم بڑی سرعت و تیز رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کر سکتے ہیں، لیکن یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جن مقامات کا ہم سفر کرتے ہیں وہ بہت کم اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سفر کیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحوں کے لئے زمین سمٹ گئی ہے اور اس کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، قومیں ایک دوسرے کے قریب ہو گئی ہیں اور ان کے پاؤں ایک دوسرے کی دہلیز پر ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے آپس کے تعلقات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار و ناشگفتہ ہیں وہ وسائل

جن سے ہم اپنے ہمسایہ قوموں سے براہ راست واقف ہو جاتے ہیں انھوں نے اٹلاو یناکو جنگ کی آگ میں جھونک دیا ہم نے آواز پھیر جانے کا آلہ ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی ہمسایہ قوموں سے باتیں کیں، لیکن اس کا انجام یہ ہے کہ آج ہر قوم ہوائی پوری طاقت کے ساتھ اپنی ہمسایہ قوم کو چھیڑنے اور دق کرنے کا کام لے رہی ہو وہ اس کوشش میں رہتی ہے کہ وہ دوسری قوم کو اپنے سیاسی نظام کی برتری کا قائل و معتقد بنا دے ۔

ہوائی جہاز کو دیکھو جو فضائے آسمانی میں منڈلا رہا ہے تمھیں خیال ہوگا کہ اس کے موجد اپنے علم و مہارت و صنعت کے لحاظ سے ما فوق البشر ہستیاں تھیں اور جنھوں نے اس پر پہلے پہلے پرواز کی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بلند ہمتی، عزم اور جرأت بڑی قابل داد اور لائق تحسین ہے لیکن اب ذرا ان مقاصد کا جائزہ لو جن کے ماتحت یہ ہوائی جہاز استعمال ہوئے اور مستقبل میں بھی استعمال ہوں گے وہ مقاصد کیا ہیں؟ فضائے آسمانی سے بمباری، انسانوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا، زندوں کا گلا گھونٹنا، انسانی جسموں کو جلا دینا، زہریلی گیس کا پھینکنا اور ان کمزوروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا جن کے پاس کوئی حیثیت

سے حفاظت کا کوئی سامان نہیں، یہ مقاصد یا تو احمقوں کے ہوسکتے ہیں یا شیاطین کے۔

دیکھنا ہے کہ مورخ اس کے متعلق کیا رائے قائم کرتا ہے کہ ہم دھاتوں اور سونے کو کس طرح استعمال کرتے تھے، وہ دیکھے گا کہ ہم نے ایسی ترقی کرلی تھی کہ لاسلکی کے ذریعہ سونے کی اطلاعات دے سکیں، وہ ایسی تصویریں پیش کرے گا جو دکھائی دیں گی کہ بینک کے لوگ کس صفائی اور مشاقی کے ساتھ سونے کا وزن اور شمار کرتے تھے، وہ اس خارق عادت طریقہ کا ذکر کرے گا جس سے ہم روزانہ سونے کو ایک دارالسلطنت سے دوسرے دارالسلطنت کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے اور کشش اجسام کے قانون کو توڑتے تھے، وہ قلم بند کرے گا کہ یہ نیم وحشی صنعتوں میں بڑے ماہر اور بڑے کاریگر تھے، لیکن اس بین الاقوامی تعاون میں ناکام تھے جو سونے پر کنٹرول رکھنے اور اس کو صحیح طور پر تقسیم کرنے، ان کو صرف اتنی فکر تھی کہ وہ قیمتی دھاتوں کو امکانی سرعت کے ساتھ دفن کردیں وہ سونے اور دھاتوں کو افریقہ میں زمین کے شکم سے بڑی مہارت کے ساتھ نکالتے تھے اور لندن، نیویارک اور پیرس کے محافظ خانوں میں دفن کرتے تھے۔

ایجادات واکتشافات کی ہلاکت آفرینی

مختلف اسباب وحالات کی بنا پر جن کی کسی قدر توضیح گزشتہ صفحات میں ہو چکی ہے مغربی قوموں میں خیر کی طرف میلان اور بھلائی کا

رجحان بہت کم ہو گیا ہے اور اخلاق و تمدن کے صحیح اصول و مبادی کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے مدت ہوئی چھوٹ گیا، غیر ذمہ دارا دب نے دلوں میں کجی اور ملحدانہ فلسفہ نے طبیعتوں میں انحراف پیدا کر دیا اور ذوق فاسد ہو گئے اس بنا پر جس طرح سے سمی اور وبائی امراض میں صالح سے صالح غذا مریض کے معدہ میں پہونچ کر مسموم اور فاسد ہو جاتی ہے، اسی طرح علوم اور صنعتیں ایجادات و اکتشافات اور علمی ترقیاں یورپ میں خود اہل یورپ کے لئے اور عالم انسانیت و تہذیب کے لئے وبال جان بن گئی ہیں، مسٹر ایڈن نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:-

"جب تک کچھ کیا جائے اور خبر لی جائے اس دنیا کے باشندے اس صدی کے پچھلے حصے میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرز زندگی اختیار کر لیں گے اور اسی وحشت و بربریت کا دور شروع ہو جائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا، کیسی عجیب بات ہے کہ تمام ممالک ایک ایسے ہتھیار سے بچنے کے لئے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں جس سے ہم تو سب کے سب خائف مگر اس کو قابو میں رکھنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں۔ میں بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر کسی دوسرے سیارہ سے کوئی سیاح اور زائر اس زمین پر آئے تو وہ ہماری اس دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے وسائل تیار کر رہے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریقہ کی اطلاع بھی دے رہے ہیں۔"

جس وقت مسٹر ایڈن نے یہ الفاظ کہے تھے اس وقت ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اس جنگ کے دوران ہی میں خدا ناشناس انسانی حکمت وصنعت کی ہلاکت خیزی اور آدم کشی اس درجہ کو پہنچ جائے گی کہ خود سائنسداں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

کئی سال کی منظم جد وجہد اور کروروں روپیہ کے صرف سے بالآخر امریکہ ذراتی بم (Atomic Bomb) کے ایجاد میں کامیاب ہو گیا جس پر اس جنگ کی شکست وفتح کا انحصار تھا اور ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو ۵ بجے اس قوت ودسعت کا پہلا امتحان کیا گیا۔

بےجان آہنی برج اور بے حس فضائے آسمانی کے بعد اس کا دوسرا تجربہ ذی روح دشمن پر کیا گیا جس کو ہیبت زدہ کرکے شکست دینے کے لئے مغرب کی حکمت وصنعت نے اپنی بہترین قابلیت صرف کی تھی۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کا بدقسمت شہر ہیروشیما اس کا پہلا نشانہ بنا۔ اس کے گرتے ہی یہ عظیم الشان شہر تو وہ خاک بن گیا نہ کوئی جاندار باقی رہا نہ بےجان، آن کی آن میں انسان، حیوان، عمارتیں سب معدوم تھیں، دھماکے کی شدت ہوا کا دباؤ اور دھواں قیامت خیز تھا، گرد وغبار کا جھلتا ابلتا اور کھولتا ہوا میلوں اونچا ایک پہاڑ تھا اور اس پہاڑ کے نیچے جہنم کی سی آگ تھی جس نے ہر چیز کو خاکستر کردیا، اس طیارہ کو جس نے بم گرایا تھا اسے گراتے ہی جلد سے جلد اپنی سلامتی کے لئے وہاں سے بھاگنا پڑا ورنہ تباہ ہو جاتا، دھماکا اتنا مہیب تھا کہ بم گرانے والوں کا پتہ پانی تھا حیرت، ہیبت اور خوف کے عالم میں ہر ایک کی زبان سے "یا خدا" کی آوازیں نکل رہی تھیں،

لیکن جب یہ وہاں سے واپس آئے تو اتحادی حلقوں میں نعرہ ہائے مسرت بلند ہو رہے تھے اور ہر شخص شاداں و مسرور تھا[1]

اسٹورٹ گلڈر (Stuart Gilder) اپنے ایک مضمون میں ایٹم بم کی خطرناک اور ہلاکت آفرینی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اگرچہ پوری جزوی تفصیلات کا علم نہ تھا لیکن بہرحال ایٹم بم بنانے والے سائنسداں اتنا ضرور جانتے تھے کہ وہ جس آلۂ حرب کو استعمال کرنے جا رہے ہیں اس کے ثانوی نتائج یہ ہوں گے کہ انسانیت فنا ہونے سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکے گی، اس کے ثانوی نتائج کی اگر تفصیل معلوم کرنی ہے تو شہر ہیروشیما کی وہ رپورٹیں جو اخبارات کے نامہ نگاروں کو ملی ہیں ملاحظہ ہوں، وہ نامہ نگار اس ذراتی بم کے پلیگ (Atomic Plague) کے بارہ میں لکھتے ہیں:-

بہت سے لوگ جو بظاہر نہ تو بم کے پھٹنے سے متاثر ہوئے تھے اور نہ اس کی آگ و حدت سے مر گئے اور برابر مر رہے ہیں اور ان کی اس موت کا سبب یہ ہے کہ ان کا خون تحلیل ہو جاتا ہے اوّل اوّل خون کے سفید ذرّات تباہ ہوتے ہیں پھر سرخ ذرّات کی باری آتی ہے ان کے بال گر جاتے ہیں اور وہ جتنے دن بھی زندہ

[1] ہیروشیما کی میونسپلٹی کے صدر نے ۱۰ اگست ۱۹۴۹ء کو اعلان کیا کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۲ لاکھ دس ہزار اور ۲ لاکھ ۴۰ ہزار کے درمیان تھی (پی ٹی)

رہتے ہیں ان کے اعضا سوکھتے ہی رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مرجاتے ہیں اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ فضا میں کچھ ریڈیائی مواد ایٹم بم کے پھٹنے کے ذریعہ رہ جاتے ہیں اور انسانی کھال میں جذب ہوکر یا بذریعہ تنفس پھیپھڑوں تک پہونچ جاتے ہیں۔"

اس کتاب کو نقل کرنے کے بعد یہی مضمون نگار اسٹورٹ گلڈر (Stuart Gilder) لکھتا ہے:-

"یہ خبر ساری دنیا کو لرزا دینے اور ڈرا دینے والی ہے، دنیا اب تک نہ تو اس خوفناک بم سے واقف تھی اور نہ ریڈیائی تاثیر رکھنے والی دھاتوں سے لیکن سائنسداں تو تیس سال قبل سے جانتے تھے کہ یہ ایک ایسا ہتھیار ہوگا جس کا توڑ اور تریاق کچھ نہیں اور یہ ساری نوع انسان کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ جاپانیوں نے ان اثرات سے بچنے کے لئے خانہ ساز نقابیں استعمال کیں غالباً یہ وہ نقابیں تھیں جن کو اہل جاپان شدید سردی سے بچنے کے لئے استعمال کرتے تھے لیکن یہ اتنی ہی بے اثر نکلیں جتنے حبش کے فوجیوں کے وہ کپڑے جو انھوں نے اس وقت اپنی ناک کے گرد لپیٹ لیے تھے جب کہ سولینی کے بمبار جہازوں نے ان پر زہریلی گیس برسائی تھیں۔

ذراتی بم پھینکنے میں جو ہوا باز شریک تھے ان کا بیان ہو کہ اس بم کے گرنے کے بعد غبار اور دھواں نو میل تک ہوا میں پھیل

گیا، پروفیسر (Plesch) کی رائے ہو کر جس جگہ بم
پھٹے اس کے قرب و جوار میں سو میل کے علاقے کے رہنے والوں کی
سائنٹفک طریقہ پر جانچ پڑتال کرنی چاہیئے اور ان کی جسمانی حالت
کو بغور دیکھنا چاہیئے کہ کہیں ان پر اس کا اثر تو نہیں ہو گیا۔

یہ امر ذرا بھی مستبعد نہیں کر دنیا ایک دن صبح اٹھ کر اخبارات
میں یہ خبر پڑھے گی کہ وہ لوگ جو جاپان سے ہزاروں میل فاصلہ پر
رہتے تھے ان میں وہی علامات پھیل گئی ہیں جو ذراتی بم کے ملک
میں ہوتی ہیں، اگر ایک چھوٹا سا ذراتی بم ۹ میل تک کی ہوا کو گرد و
غبار سے مسموم کر سکتا ہے تو یہ سمجھنا بالکل مطابق عقل ہے کہ اس
سے بڑا ایٹم الاسے کہیں زیادہ وسیع رقبہ کو متاثر کر دے گا۔"

Stat man D. 16 sptember 1945

باب ششم

مغربی عہدِ اقتدار میں دنیا کے معنوی خسارے

یہاں مشرقی۔ ایشیائی اقوام کے مادی خساروں سے بحث نہیں، مغرب کے دور فتوحات میں مشرقی اقوام کو اپنے کن طویل وعریض ممالک سے دستبردار ہونا اور مغربی طاقت یا دانائی کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے اور اس کی تفصیل ان مختصر اوراق میں سمیٹی نہیں جا سکتی ہمیں اس وقت نہایت اختصار کے ساتھ بلکہ اشارات میں یہ دکھانا ہے کہ مغرب کے اقتدار کے اس سیلاب میں جو تمام روئے زمین پر پھیل گیا ہے اور اس کے اثرات سے پہاڑوں کی چوٹیاں اور وادیوں کی گہرائیاں آزاد قوموں کے ضمیر بلکہ ہوا اور پانی تک بھی محفوظ نہیں، دنیا کو کیا معنوی روحانی اور اخلاقی خسارے برداشت کرنے پڑے؟ اور اس عالمگیر انقلاب میں سب سے بڑا خسارہ مسلمان ہی کو برداشت کرنا پڑا ہے کیونکہ جاہلیت کا تضاد و اختلاف اسی کے نظام زندگی سے ہے، اس لئے قدرتی طور پر جاہلیت

کے غلبہ و اقتدار، بس اسی کو سب سے زیادہ نقصان برداشت کرنا چاہیے۔

حاسۂ مذہبی کا فقدان اس دنیا کا انجام کیا ہے، کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے، اس کی کیا نوعیت ہے، بعد اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں، اور وہ کہاں سے معلوم ہو سکتی ہیں؟ اس کے بعد کی زندگی کو پر راحت بنانے کے لئے کیا اصول صحیح ہیں اور ان کا ماخذ کیا ہے، روح انسانی کو ابدی راحت اور قلب کو دائمی سکون پہونچانے کا راستہ کیا ہے اور وہ کہاں سے دریافت ہو سکتا ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جنھوں نے مشرقی انسان کو سیکڑوں ہزاروں برس بے چین اور بصورتِ سوال بنائے رکھا اور جو اس کے انتہائی مادی استغراق اور خود فراموشی میں بھی اس کے قلب کی گہرائیوں سے بار بار اٹھتے رہے اور جواب مانگتے رہے، مشرقی نے اپنے کسی دور میں بھی ان فطری سوالات کو ٹالا نہیں اور اپنے دل کی یہ آواز کبھی ان سنی نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کی تمام مشغولیتوں اور دماغ کی ساری کاوشوں میں ان کو پہلی جگہ دی، وہ اپنی تہذیب اور علوم کی ہزاروں سال کی تاریخ میں برابر ان سوالات کے حل کرنے اور ان کا تشفی بخش جواب تلاش کرنے کی ادھیڑ بن میں رہا، مابعد الطبیعی فلسفہ، علم کلام، تصوف، اشراق و روحانیت، مجاہدہ و ریاضت، علم و حکمت اور دوسرے مشرقی علوم و تجربات اس کے حل ہی کی مختلف کوششیں تھیں، اس نے اس کے لئے غلط راستے بھی اختیار کئے اور غلط وسائل بھی استعمال کئے اور اس کو اس میں کامیابی سے زیادہ ناکامی ہوئی لیکن اس سے اس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ اہل مشرق کی زندگی میں یہ سوالات ہمیشہ موجود رہے

اور ان کو اولیں اہمیت حاصل رہی۔

اس موقع پر اگر ہم فلسفہ ہی کی زبان استعمال کریں تو ہم یہ کہیں گے کہ اہل مشرق میں جو اس ظاہری کے علاوہ ایک اور حاسہ بھی رہا ہے جس کو ہم حاسہ مذہبی کہہ سکتے ہیں، جس طرح دوسرے حواس اپنا عمل کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ان کے محسوسات حاصل ہوتے ہیں، اس طرح اس حاسہ کے بھی کچھ محسوسات ہیں جو مشرقی زندگی کا لازمہ رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی عہد میں یہ سوالات بدستور موجود تھے اور اہل علم و اہل فکران پر عرصہ تک طبع آزمائی کرتے رہے لیکن مغربی تمدن اور فلسفۂ زندگی کے باطنی خواص زمانہ کے ساتھ ساتھ جس قدر ابھرتے رہے اور زندگی میں مغرب کا جس قدر توغل اور انہماک بڑھا اسی قدر ان سوالات کی اہمیت کم ہوتی گئی اور وہ عملی زندگی میں پیچھے پڑتے رہے فلسفۂ مابعد الطبیعات کے علمی و تعلیمی حلقوں میں اب بھی ان پر اظہار خیال ہوتا ہوگا لیکن زندگی سے یہ سوالات یکسر خارج ہو چکے ہیں اور ان کے سامنے سے علامت استفہام مٹ چکی ہے ان کے بارہ میں وہ خلش، کھٹک اور وہ ذوق جستجو جس میں ہزاروں سال اہل مشرق کو مشغول دیکھا جاتا رہا، اور یہ کسی ایمان، ترجیح اور اطمینان قلب کی بنا پر نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ اہل مغرب کی زندگی میں عرصہ دراز سے اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اور دوسرے مشاغل و مسائل کے لیے جگہ چھوڑ چکے ہیں، اس زمانہ کے مشغول انسان نے ان مسائل میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی اختیار کر لی ہے اس کو ان سوالات پر غور کرنے کی بالکل مہلت نہیں، اس کی طرف

سے ان سوالات کے جواب کا کوئی پہلو اختیار کیا جائے، اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ اس کے لئے صرف یہ زندگی اہم ہے اور اسی کے متعلق ہدایات و تفصیلات اس کو مطلوب ہیں۔

قدیم مشرقی اور جدید مغربی میں یہ ایک عظیم الشان نفسیاتی فرق ہے کہ مشرقی مذہبی حاسہ رکھتا تھا اور مغربی اپنی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ حاسۂ مذہبی کھو چکا ہے، اور جب کسی شخص کا کوئی حاسہ باطل ہو جائے تو اس کے سارے محسوسات جو صرف اس حاسہ سے تعلق رکھتے ہیں اس کے لئے معدوم ہو جاتے ہیں، جو شخص قوت سامعہ سے محروم ہے اس کے لئے عالم اصوات معدوم ہے اور یہ پوری بولتی ہوئی دنیا ایک شہر خموشاں ہے، جو شخص قوت باصرہ سے محروم ہے اس کے لئے عالم الوان معدوم اور رنگوں کا فرق بے معنی ہے، اسی طرح جو شخص حاسۂ مذہبی سے محروم ہے اس کے لئے وہ محسوسات و وجدانات اور تاثرات معدوم ہیں جو صرف حاسۂ مذہبی کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس کے لئے آخرت، عذاب، ثواب، جنت و دوزخ، خدا کی رضامندی و نارضامندی، تقویٰ و طہارت، نجات و ہلاکت ابدی وغیرہ وغیرہ سب بے معنی الفاظ ہیں، اس کے لئے کسی ایسی دعوت میں قطعاً کوئی کشش اور دلچسپی نہیں جس کا تعلق اس کے محسوسات اور نقد لذتوں اور منفعتوں کے سوا کسی اور چیز سے ہو۔

دین کی دعوت دینے والوں کو ہر دور میں، اور انبیاء علیہم السلام کو اپنے زمانۂ دعوت میں جن لوگوں میں سب سے زیادہ دقت پیش آئی ہے اور جن لوگوں پر ان کی انقلاب آفریں دعوت، ان کے خارہ شگاف اور آہن گداز مواعظ اور ان کا سوز و درد مندی بالکل بے اثر ثابت ہوئی ہے یہ وہی لوگ ہیں جو حاسۂ مذہبی

سے محروم ہو چکے تھے اور جن کی دل کی انگیٹھیاں اس طرح سرد ہو چکی تھیں کہ ان میں کسی طرح گرمی نہیں پیدا کی جا سکتی تھی، جو مذہب اور اس کے متعلقات کے متعلق طے کر چکے تھے کہ ان کے بارہ میں نہ کچھ سننا ہے نہ غور کرنا ہے، جنھوں نے اپنے زمانہ کے داعیوں کی پتھر کو موم کر دینے والی تقریر سن کر بڑی بے دردی سے کہا کہ "اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ" (ہم تو محض دنیاوی زندگی کے قائل ہیں جینے اور مرنے کے سوا اور ہے کیا، مرنے کے بعد کون زندہ ہوگا؟) یا جن کی نظر مادی سطح سے حقیقت تک نفوذ کرنے کے قابل نہیں ہوتی اور جنھوں نے پیغمبر کی عام فہم تقریر سننے کے بعد جو انھیں کی زبان میں کی گئی تھی بڑی سادگی سے کہا "مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرَاكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا" (تمھاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم کو ہم میں کوئی قوت حاصل نہیں)۔

مغربی تہذیب کے اس عروج کے زمانہ میں ہر قوم میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی دنیاوی مشغولیت و انہماک یا دنیا کی محبت و حرص نے ان کی زندگی میں مذہب کے لئے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا، بڑی تلاش و جستجو کے بعد بھی مذہب کی دعوت دینے والے کو ان کے دل و دماغ میں کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا منفذ نہیں ملتا جس سے دینی اور اخلاقی دعوت ان میں نفوذ کر سکے، جس طرح کسی شخص کو موسیقی کے لیے کان اور شاعری کے لیے ذوق لطیف نہ ملا ہو اس کے لیے موسیقی کے سارے کمالات اور دنیا کی پوری وجد آفریں شاعری بالکل بے اثر و بے سود ہے، اسی طرح جو مذہبی حاسہ سے محروم ہو چکا ہو

اس کے لیے پیغمبروں کی پوری دعوت، ناصحوں کی وعظ و تلقین، علم و حکمت قصص و امثال سب ضائع ہیں یہ دلوں کی زمین کا سب سے بنجر حصہ ہے جس کو کوئی بارش سیراب نہیں کر سکتی ع

یہاں آکے رو دیتا ہے ابر نیساں

جن لوگوں کو اس طبقہ سے خطاب کرنے اور اس کو دین و اخلاق کی دعوت دینے کا کبھی موقع ملا ہے ان کو قرآن مجید کی بہت سی آیات کے معنی سمجھ میں آگئے ہوں گے اور وہ تمام کلامی اشکالات جو عملی زندگی اور میدان دعوت سے علیحدہ بیٹھ کر "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" اور اس کے ہم معنی آیات کے متعلق پیش آتے ہیں خود بخود حل ہو گئے ہوں گے، اور یہ حقیقت قرآنی مجسم نظر آئی ہوگی "وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ"

اس زمانہ کا اصلی مرض در اصل دین کے بارہ میں یہی حسی و بے طلبی اور مذہبی سوالات کے بارہ میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی ہے جس کا علاج سب سے زیادہ مشکل ہے اور جس کی موجودگی میں کوئی مذہبی دعوت و تلقین کارگر نہیں ہو سکتی، مذہب و اخلاق کی دعوت کو فسق و فجور اور معصیت و غفلت کے تاریک دور اور انکار و مخالفت کے پر خور و پر شور عہد میں وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو مذہب سے بے تعلقی و بے نیازی کے اس خاموش و پرسکون دور میں پیش آرہے ہیں جہاں سرے سے پیاس اور پانی کی طلب ہی نہ ہو وہاں پانی کا اہتمام اور خضر کی رہنمائی سب بے ضرورت ہے "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ

إِذَا أَوْلَكُوا مُدْبِرِينَ "۔

ایک مغربی یونیورسٹی کے معلّم فلسفہ وعلم النفس نے اس حقیقت کا خوب ادراک کیا ہے اور اس فرق کی صحیح تحلیل کی ہے جو قدیم وجدید نفسیات میں پایا جاتا ہے، اس نے اس ایک جملہ میں ایک کتاب کا مضمون سمیٹ لیا ہے:۔

"مذہبی سوالات پہلے پیدا ہوتے تھے ممکن ہے ان کا تشفی بخش جواب نہ ملتا ہو، لیکن اس زمانہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سوالات سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔

ذوقِ خدا طلبی کا عالمگیر فقدان

اسلامی تمدن وحکومت کے عالمگیر اثرات کے تذکرہ میں گزر چکا ہے کہ اس کے اثر سے پوری دنیا میں (جو اسلام اور مسلمانوں کے زیر اثر تھی) خدا طلبی کا عام ذوق پایا جاتا تھا، ہزاروں لاکھوں اشخاص دین کی طلب اور عرفان خدا کی تلاش میں دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہونچتے تھے، دنیا داری اور مادیت کے پھیل جانے کے بعد دینی رجحان اور خدا طلبی کا مرکز ان حضرات کی ذات اور انکے مقامات تھے جنھوں نے غفلت اور مادیت کے سمندر میں انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے قائم کر رکھے تھے جہاں وہ لوگوں کو مادیت کے اس بھنور سے نکال کر ان کی دینی تربیت کرتے تھے اور ان میں طوفان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت و قوت پیدا کرتے تھے، بعد کی صدیوں میں ان کو صوفیہ ومشائخ کے نام سے یاد کیا گیا ہے ـــــــ

ان حضرات کی طرف رجوع ان آخری صدیوں میں دینی رجحان اور عام

مسلمانوں کے ذوق خدا طلبی کا ایک حد تک پیمانہ ہے جس سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ لوگوں میں اس زمانہ میں مادیت و دنیاداری سے کس حد تک گریز اور دین کی کہاں تک طلب پائی جاتی تھی۔

عالم اسلامی کے مرکزی شہروں میں تقریباً ہر جگہ ایسے شخص موجود تھے جن کی ذات بحر ظلمات میں روشنی کا مینار تھی، لوگ پروانوں کی طرح اس روشنی پر گرتے تھے، دنیا کے دور دراز گوشوں سے طالبین خدا وہاں جمع رہتے تھے، وہ مسلمانوں کی ایک بڑی بین الاقوامی آبادی ہوتی تھی جہاں ایک وقت میں شرق و غرب شمال و جنوب کے مسلمان پائے جاتے تھے اور اسلام کی وسیع دنیا وہاں سمٹی ہوئی نظر آتی تھی۔

ہمارا ملک ہندوستان جو اسلامی دنیا کا ایک سرا پر واقع ہے، دینی ذوق و شوق اور خدا طلبی کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، یہاں ہر دور میں مسلمان سلاطین کی سلطنت کے پہلو بہ پہلو دینی و روحانی حکومت کے آزاد مرکز قائم رہے، جہاں سیکڑوں ہزاروں اشخاص اپنے زمانہ کی تمام مادی ترغیبات سے آزاد اور حکومت و سیاست کے انقلابات سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے رہتے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۲۵ھ) کی روحانی نوآبادی بستی غیاث پور اس کی ایک اچھی مثال ہے، جس نے عین مرکز حکومت (دہلی) میں آٹھ باجبروت سلاطین (غیاث الدین بلبن (۶۶۴-۶۸۶) سے لے کر غیاث الدین تغلق ۷۲۰-۷۲۵ تک) کے عہد حکومت میں تقریباً پچاس برس تک اپنی خود اختیاری اور بے نیازی قائم رکھی اور جہاں بحر سے لے کر دریا تک کے طالبین خدا پڑے رہتے تھے۔

(حواشی بر صفحہ آئندہ ملاحظہ)

اگر تمام سلاسل طریقت کے بزرگوں کے مرکزوں کی آبادی اور ان کی طرف لوگوں کے رجوع کی تفصیل کی جائے (جس سے اس زمانہ کے دینی طلب و رجحان اور دینی عزت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے) تو اس کے یہ اوراق متحمل نہیں، اسلئے نمونہ کے طور پر صرف ایک سلسلہ (سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ) کے چند بزرگوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق اور ان کی طرف اہل زمانہ کے رجوع کا مجمل ذکر کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کے زمانہ میں جو مادیت اور دنیا داری کے عروج کا زمانہ تھا ذوق خدا طلبی کا کیا حال تھا اور دین کی کشش کہاں کہاں سے لوگوں کو کھینچ کر لاتی تھی۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے منتسبین کی فہرست پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان و افغانستان کے کتنے شہروں اور قصبات کے کتنے کثیر التعداد اشخاص اور عہد جہانگیری کے کتنے بڑے بڑے امیر اور ارکان دولت ان کے حلقۂ ارادت و بیعت میں داخل تھے اور کتنے دور سے انھوں نے سرہند آکر استفادہ کیا تھا۔

(متعلق صفحہ گذشتہ ۳۴۲)

---

[1] حضرت نظام الدینؒ غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ۶۶۹ھ میں دہلی تشریف لائے کچھ عرصہ تک مختلف محلوں میں قیام رہا پھر بستی غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں مستقل قیام اختیار کیا ۷۲۵ھ تک مختلف سلاطین آپ سے ملنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی، تقریباً ۶۰ برس کی مدت تک آپ اور آپکے اہل زاویہ بالکل یکسو رہے۔ [2] شیخ حسن علا سجزی [3] شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی۔

ان کے جلیل القدر خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ) کی خانقاہ میں ایک ایک ہزار آدمی روزانہ ہوتے تھے جو دونوں وقت خانقاہ میں کھانا کھاتے تھے ان کی سواری کے ساتھ ہزاروں ہزار آدمی اور سیکڑوں علما ہوتے تھے، تذکرہ آدمیہ میں ہے کہ ۱۰۵۲ھ میں جب آپ لاہور تشریف لے گئے تو سادات و مشائخ اور دوسرے طبقوں کے دس ہزار آدمی آپ کے ہمرکاب تھے، طالبین کا آنا مجمع ہر وقت رہتا تھا کہ شاہجہاں کو ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس نے کچھ رقم بھیج کر کہلوایا کہ آپ پر حج فرض ہو گیا ہے، آپ حرمین تشریف لے جائیں، چناں چہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔

مجدد صاحب کے نامور خلیفہ اور صاحبزادہ حضرت خواجہ معصومؒ (م ۱۰۷۹ھ) کے ہاتھ پر نو لاکھ انسانوں نے بیعت و توبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے[1]۔

ان کے صاحبزادہ شیخ سیف الدین سرہندیؒ (م ۱۰۹۶ھ) کی خانقاہ (دہلی) میں طالبین کے ہجوم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صاحب ذیل الرشحات کے بیان کے مطابق ایک ہزار چار سو آدمی دونوں وقت ان کے دسترخوان پر اپنی فرمائش اور خواہش کے موافق کھانا کھاتے تھے[2]۔

امرا و اہل ثروت کا بزرگان دین سے جو تعلق (دینی محبت و احترام کی بنا پر) تھا، اس کا ایک نمونہ یہ تھا کہ حضرت خواجہ محمد زبیر سرہندیؒ (م ۱۱۵۱ھ)

---

[1] [2] نزہۃ الخواطر جلد پنجم

جب مکان سے مسجد تشریف لے جاتے تو امراء راستہ میں دو شالے اور دو مال بچھا دیتے کہ آپ کا پاؤں زمین پر نہ پڑے، کسی مریض کی عیادت یا کسی اور کام کے لئے کہیں تشریف لے جانا ہوتا تو آپ کی سواری بادشاہوں کی طرح نکلتی، اور آپ کے جلو میں امراء اور اہلِ دولت کی پالکیاں اور سواریاں ہوتیں۔[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد تجارت میں انقلاب حکومت سے کچھ پہلے تک یہ ذوق پورے طور پر موجود تھا، حضرت شاہ غلام علیؒ (م ۱۲۴۰ھ) (خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) کے عہد میں دہلی کی خانقاہ مجددیہ طالبین کا بہت بڑا مرکز تھی، سر سید احمد خاں مرحوم آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے .... حضرت کی خانقاہ میں پانچ پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا۔"[2]

شاہ رؤف احمد مجددیؒ در المعارف میں صرف ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست لکھتے ہیں جو ۲۸ جمادی الاولی ۱۲۳۱ھ کو دہلی کی اس خانقاہ میں

---

[1] در المعارف، ارشاد رحمانی، نزہۃ الخواطر [2] آثار الصنادید باب چہارم

استفادہ کے لیے حاضر تھے۔

سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امروہہ، سنبھل، رام پور، بریلی، لکھنؤ، بہرائچ، گورکھ پور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدرآباد، پونہ وغیرہ۔[1]

اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ ریلیں تھیں نہ آمد و رفت کی وہ سہولتیں جو آج حاصل ہیں ـــــ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اسی دور میں انگریزی عملداری سے کچھ پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) اور ان کے جلیل القدر رفیقوں، مولانا عبدالحی بڈھانویؒ (م ۱۲۴۳ھ) اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور ان کے مخلص مبلغوں نے مسلمانوں کو خدا اور رسول کی طرف رجوع کی دعوت دی اور "فَفِرُّوا إِلَى اللّٰهِ" (خدا کی طرف بھاگو) کی صدا بلند کی اور غفلت و معصیت اور خلاف شرع زندگی کے خلاف جد و جہد شروع کی، مسلمانوں نے جس ذوق و شوق کے ساتھ اس دعوت پر لبیک کہی اور جس طرح پروانہ وار اس جماعت کے امیر کے گرد جمع ہوئے جس عالی حوصلگی اور فراخ دلی کے ساتھ اس کے وفود کا خیر مقدم کیا اور اپنی دینی محبت و تواضع کا ثبوت دیا پھر جس طرح ہندوستان میں اسلام کے سارے باغوں کے بہترین پھولوں کا عطر کھنچ کر ان کے پاس پہونچ گیا (جو ۱۲۴۶ھ کے واقعہ میں بالاکوٹ کی

[1] مقدمہ ذوالمعارف ص ۱۰۶

مٹی میں مل گیا، اس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تنزل کے دور میں بھی مسلمانوں میں دین کی کتنی طلب اور خدا طلبی کا کیسا ذوق اور نشاط۔ کیسی عالی ہمتی اور کتنی اچھی صلاحیت و استعداد تھی۔

مسلمانوں کے اس دینی ذوق کا اندازہ ان تبلیغی سفروں کی روداد سے ہوگا جو سید صاحبؒ نے بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ دوآبہ کے قصبات اور شہروں میں اور پھر اودھ میں کیے۔[1]

مسلمانوں کے ذوق و اشتیاق کا مزید اندازہ سید صاحبؒ کے سفر حج سے ہوگا جو آپ نے ۱۲۳۶ھ میں کیا، اس پورے سفر میں ہندوستان کا وہ مشرقی خطہ جو اب تین صوبوں (صوبہ متحدہ، بہار اور بنگال) پر مشتمل ہے گویا اس قافلہ کی گزر گاہ تھا مسلسل جنبش اور حرکت میں تھا، ہر جگہ دین کے طالب مسلمان پروانوں کی طرح گرتے تھے، معصیت اور غفلت کی زندگی سے توبہ کرتے تھے اور خدا سے نیا عہد و پیماں باندھتے تھے، دیہاتوں اور گاؤں کے لوگ سیکڑوں کی تعداد میں جوق جوق آتے تھے، اور بیعت و توبہ کرتے تھے اہل شوق اپنے مواضعات اور مقامات پر لے جاتے تھے، متوسط الحال لیکن بلند ہمت مسلمان پورے قافلہ کی (جس میں کلکتہ پہونچتے پہونچتے ساڑھے سات سو آدمی ہو گئے تھے) اور ان صدہا مسلمانوں کی جو قرب و جوار سے جمع ہو جاتے تھے دل کھول کر کئی کئی دن ضیافت کرتے تھے، مسلمان رؤسا، رشاہزادے اولوالعزمی سے دین کے کام میں اپنی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید" طبع ثالث

دولت صرف کرتے تھے، شیخ غلام علی صاحب رئیس الہ آباد نے بارہ پندرہ دن میں مجموعی طور پر بیس ہزار روپے صرف کیے، انکے دسترخوان پر دونوں وقت سیکڑوں آدمی کھانا کھاتے تھے، بعض لوگوں کا تخمینہ تھا کہ ایک ہزار روپیہ روزانہ کھانے پر صرف ہوتا تھا۔[1]

لوگوں کے رجوع اور اہل طلب کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ پورے شہر میں تھوڑے آدمی ایسے ہوں گے جو توبہ و بیعت سے اور اس قافلہ کے دینی برکات سے محروم رہ گئے ہوں گے، الہ آباد، مرزا پور، بنارس، غازی پور، عظیم آباد، پٹنہ، اور کلکتہ میں مجموعی طور پر کئی لاکھ مسلمانوں نے بیعت و توبہ کی، دین کی عمومی اہمیت اور طلب کا اندازہ اس سے ہوگا کہ بنارس میں اسپتال کے مریضوں نے بھی پیغام بھیجا کہ ہم معذور رہیں، وہاں تک ہمارا آنا دشوار ہے اگر آپ تشریف لا کر یہاں تشریف ارزانی فرمائیں تو ہم بیعت کریں، آپ ایک روز چند آدمیوں کے ہمراہ تشریف لے گئے اور ان مریضوں نے بھی توبہ و بیعت کی۔[2]

کلکتہ میں دو مہینے قیام رہا، روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے روز بروز ہجوم بڑھتا جاتا تھا، کثرت بیعت کا یہ حال تھا کہ صبح سے دو ڈھائی پہر رات گئے تک مردوں اور عورتوں کا ہجوم رہتا، سید صاحب کو سوائے نماز پڑھنے کھانا کھانے اور ضروریات بشری کے کچھ فرصت

---

[1] مخزن احمدی (فارسی) از مولوی محمد علی صاحب ص ۱۲۲۔ ۱۲۳

[2] مخزن احمدی (فارسی) از مولوی محمد علی صاحب ص ۱۲۶

ذلمی، علحدہ علحدہ ایک ایک شخص سے بیعت لینا محال تھا، ایک وسیع مکان میں
سب جمع ہوجاتے، آپ تشریف لاتے، سات آٹھ دستاریں کھول کر آپ کے گونیکے
ہاتھ میں دے دیتے لوگ ان کو جا بجا سے تھام لیتے اور آپ بیعت کے الفاظ
کو اذان کی طرح بلند آواز سے تلقین فرماتے دن میں سترہ اٹھارہ بار یہی عمل ہوتا
اور ہزاروں آدمی روزانہ اس طرح بیعت سے مشرف ہوتے[1]

نمازِ فجر کے بعد سید صاحب نے ۱۵ - ۲۰ روز تک وعظ فرمایا، دو دو
ہزار امرا اور علما اور درویش ہر روز آتے تھے اور غربا کا تو کچھ شمار نہ تھا،
مولانا عبدالحئی صاحب جمعہ و سہ شنبہ کو نماز ظہر کے بعد سے شام تک وعظ فرماتے
تھے اور لوگ پروانہ وار جمع ہوجاتے تھے، روزانہ ۱۰ - ۱۵ ہندو مسلمان ہوتے[2]

اصلاح و دین داری، توبہ و انابت کی اس عمومی فضا کا اثر یہ ہوا کہ
کلکتہ میں یک لخت شراب کی بِکری موقوف ہوگئی، دوکانداروں نے جا کر سرکار
انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلاعذر ادا کرتے ہیں،
اور دکانیں ہماری بند ہیں، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں
آئے ہیں شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے اور ہر روز ہوتے
جاتے ہیں، انھوں نے کل مسکرات و نشہ آور چیزوں سے توبہ کی ہے، اب
کوئی ہماری دوکانوں کی طرف ہو کر بھی نہیں نکلتا[3]

دین اور اہل دین کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب حجاج کا یہ قافلہ جو سات سو

---

[1] [2] [3] وقائع احمدی (قلمی)

آدمیوں پر مشتمل تھا کہ معظمہ سے واپسی میں جب امر تسر آباد کے قریب دیوان علام مرتضیٰ کے دولت خانہ پر مقیم ہوا، تو دیوان صاحب نے پھر کر بازار میں اعلان کر دیا کہ سید صاحب کے قافلہ کا جو آدمی اس بازار سے کچھ خریدے یا کسی دستکار سے کام لے تو اس کی قیمت و اجرت میرے ذمہ ہے، سید صاحب نے ان کو سمجھایا کہ آپ اس قدر زیر بار کیوں ہوتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ کسی مسلمان کے گھر کوئی حاجی آجاتا ہے تو اس کی بڑی سرفرازی ہوتی ہے، میں اپنی قسمت پر جو کچھ ناز کروں کم ہے کہ اتنے حجاج نے مجھے سرفراز فرمایا۔[1]

پھر جب سید صاحبؒ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی تو مسلمانوں نے گرم جوشی کے ساتھ قبول کی، کاشت کار ہل چھوڑ کر، تاجر دکانیں بند کر کے، ملازم اپنے آقا کو سلام کر کے، امرا اپنے محلوں سے نکل کر، علما اور مشائخ مسند درس و ارشاد چھوڑ کر ساتھ ہو گئے اور کسی نے پلٹ کر اپنے گھر کو نہ دیکھا، یہاں تک کہ ان سرفروشوں کی آخری جماعت نے بالاکوٹ کی تنگ اور سنگلاخ گھاٹی میں ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان (جن میں مسافر کا چلنا بھی آسان نہیں) اپنے سے دس گنا حریف کے مقابلہ میں جان دی اور مرتے مرتے بھی گھر کو یاد نہ کیا۔

یہ ساری تفصیل اس لئے کی گئی ہے کہ اس کا اندازہ کیا جائے کہ مسلمانوں کے برائے نام اقتدار کے بالکل آخری دور میں اور ان کے تنزل و

[1] منظورۃ السعداء از مولوی سید جعفر علی نقوی (م ۱۲۸۸ھ)

اختلاط کے شباب کے زمانہ میں بھی لیکن مغربی استیلاء و تغلب کے عہد سے پہلے مسلمانوں میں کتنی دینی طلب اور قدر اور کس قدر دین کا ذوق و احساس اور کس قدر عالی ہمتی اور بلند حوصلگی تھی۔

انگریزی عملداری کے ابتدائی دور میں بھی جب کہ مغربی تہذیب و تعلیم اور اخلاق و سیاست کا اثر ہندوستان کی عام زندگی پر نہیں پڑا تھا پہلے دور کے اثرات موجود تھے اگرچہ ان کا دم واپسیں تھا، اور حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۸ - ۱۳۱۳ھ) جیسے بزرگ جنھوں نے دونوں دور اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اپنے زمانہ کی دینی ویرانی پر حسرت کرتے تھے اور بڑے درد سے فرماتے تھے ع

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

لیکن اگرچہ باد خزاں چلنے لگی تھی مگر خزاں کا دور دورہ نہیں ہوا تھا، خدا طلبی کا ذوق موجود تھا، اہل اللہ سے تعلق اور اصلاح و تربیت زندگی کا ایک ضروری شعبہ سمجھا جاتا تھا اہل علم و اہل دین کو چھوڑ کر عام کاروباری مسلمان اور دنیادار امراء بھی اس خیال سے خالی اور اس شوق سے محروم نہ تھے۔ بڑے بڑے مرکزی شہروں کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قصبات اور گاؤں بھی مردان خدا سے معمور تھے، خدا کی طرف بلانے والے اور اللہ کا نام سکھانے والے مسلمانوں کی آبادیوں اور شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں اس طرح تسلسل کے ساتھ پائے جاتے تھے کہ مشکل سے کوئی کورده ان کے وجود سے خالی ہوگا، آج سے تیس چالیس برس پہلے کے ہندوستان پر نظر ڈالیے یا معمر بزرگوں سے سنئے ملک کے

ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک چراغوں کی ایک قطار نظر آئے گی۔

رفتہ رفتہ یہ چراغ سحر ایک ایک کرکے بجھنے شروع ہوئے دیے سے دیا جلنا تو عرصہ سے موقوف ہو گیا تھا، یہ رہے سہے دیے بھی گل ہو گئے، موسم نے رفتہ رفتہ پورا اثر کیا، فصل خزاں میں درختوں کو ہلاتے اور سوکھے پتے گراتے کس نے دیکھا ہے، لیکن موسم اور ہوا کی تاثیر ہے کہ پتے اور پھول سوکھ سوکھ کر خود جھڑ جاتے ہیں، انگریزی عملداری کی طرف سے کبھی یہ اعلان نہیں ہوا کہ خانقاہیں بند کر دی جائیں اور اصلاح و ارشاد کی بساط تہ کر دی جائے اس کے برعکس اس زمانہ میں سفر کی بڑی سہولتیں پیدا ہو گئیں اور دور دراز کے مقامات پر پہونچنا پہلے سے بہت آسان ہو گیا، مگر دلوں سے وہ طلب اور شوق ہی نکل گیا جو سمرقند و بخارا سے طالبین کو پیادہ پا دلی لایا کرتا تھا، اس نے اس درخت پر تیشہ کبھی نہیں چلایا اور اس کو کبھی آگ نہیں دی، مگر جڑ کو پانی نہ پہونچنے اور موافق ہوا اور فضا نہ پانے کی وجہ سے اس کی شاخیں خود سوکھتی چلی جا رہی ہیں اور پھلنا پھولنا اس نے عرصہ سے چھوڑ دیا ہے۔

زندگی میں خدا طلبی کا کوئی خانہ اور چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی نہیں رہا، قلب و روح کی جگہ بھی معدہ اور شکم نے پُر کر دی، زندگی کی تمام بلند اور لطیف حقیقتیں اوجھل ہو گئیں، اب مدت سے ہاتف غیب کی زبان پر ہے

ڈھونڈھ اہل دل کو اب کہ جوشِ قلزم فنا
متاع درد جن میں تھی وہ کشتیاں ڈبو چکا

دُنیا طلبی کا بحران | خدا طلبی کے بجائے اب یہ دنیا طلبی کا دور ہے اور اس

سے کہیں زیادہ زور شور کے ساتھ آیا ہے اس مغربی تہذیب و اقتدار کے دور میں دنیا طلبی اور شکم پُری کا جو طوفان آیا ہے اس کے لئے بحران و ہذیان سے کم الفاظ کفایت نہیں کرتے، مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور ایک نہ بجھنے والی پیاس ہے جس کو جوع البقر کہئے یا استسقا کا مرض، ہر طرف "ھَل مِن مَزِید" کی صدا بلند ہے، زندگی کی ہوس اتنی بڑھ گئی ہے اور معیار بلند ہو گیا ہے کہ مسافر طمع کو کسی منزل پر قرار اور طائر حرص کا کسی بام بلند پر کوئی آشیانہ نہیں، دولت اور عزت وجاہ کی کوئی بڑی سی بڑی مقدار اونچی سی اونچی سطح تشفی کے لئے کافی نہیں۔

مغربی تہذیب و اقتدار کے اس دور میں درحقیقت نہ علم کا حقیقی ذوق ہے نہ دین کا، نہ کوئی اور ذوق لطیف کام کر رہا ہے بالشت بھر پیٹ نے زندگی کی ساری وسعت گھیر لی ہے۔ عالم خیال میں کتابیں تصنیف کرنے والے خوش فکر مصنفین جو چاہیں لکھیں، عملی زندگی میں اس وقت صرف ایک قوت محرکہ اور ایک زندہ حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ پیٹ ہے یا جیب ہے۔

مسٹر جوڈ کا قول صرف یورپ ہی کے متعلق صحیح نہیں ہے بلکہ ساری مغرب زدہ دنیا کے متعلق صحیح ہے۔

"جو نظریہ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا ہے"

کسی زمانہ کے ذوق اور رجحان عام اور حقیقی مسئلہ زندگی کا صحیح اندازہ ان

کتابوں سے نہیں ہوتا جو اس زمانہ میں تصنیف کی جاتی ہیں (اگرچہ عام ذوق و رجحان کے اثرات سے کتابیں بھی محفوظ نہیں ہوتیں اور وہ کچھ نہ کچھ پردوں سے بھی جھلکتا ہے)، لیکن بعض اوقات یہ مصنفین اپنے انفرادی ذوق یا قوم کی کسی مختصر جماعت کے رجحان کے نمائندے ہوتے ہیں، اور بعض اوقات واقعات کے بجائے اپنی خواہشات کو واقعات کے طور پر پیش کرتے ہیں، زمانہ کے ذوق اور رجحان کا حقیقی اندازہ روزمرہ کی زندگی بے تکلف گفتگو، مجالس کے موضوع سخن اور لوگوں سے ملنے کے بعد ہوتا ہے بقول اکبر مرحوم ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

اس اصول پر ریل کے طویل سفروں میں صبح و شام کی سیر میں، چائے اور کھانے کی میز پر، پارک اور سیرگاہوں کے سبزہ اور کشتوں پر، احباب و رفقاء کی بے تکلف گفتگو کے موقع پر کان لگا کر سنئے، کیا موضوع ہے؟

"تنخواہوں کی کمی بیشی، افسروں کی رضامندی و ناراضمندی، حکام کا تبادلہ اور ان کے مزاج و معاملہ پر تنقید، تجارتوں کا منافع، ٹیکسوں کے احکامات، بینکوں کے حسابات شرح سود کمپنیوں کے حصص، انشورنس کمپنی پالیسی، پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ، سبکدوشی کے بعد ملازمت کے امکانات فتوحات کے واقعات، خوش قسمتوں پر رشک، بدقسمتوں پر تاسف، اور اسی قبیل کی باتوں کے سوا آپ کوشش کے باوجود بھی کوئی موضوع گفتگو نہیں پائیں گے۔

یا پھر سیاسی حالات اور ان پر تبصرہ لیکن کسی اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں کسی نظام

فاسد پر اخلاقی تنقید اور کسی نظام صالح کی تمنا کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

مغرب اس بارہ میں امام ہے اور ہندوستان کے ہندو اس "معاشی ہمہ اوست" میں اس کے قدم بہ قدم، اور افسوس ہے کہ مسلمان بھی اب اس کے نقش قدم پر ہے۔

اخلاقی تغیر و زوال

مشرق میں جب اول مغربی تاجر پھر فاتح آئے ہیں تو یہاں عرصے سے اخلاقی انحطاط شروع ہو چکا تھا، مشرقی اور اسلامی تہذیب کی خصوصیات یا تو روبہ تنزل تھیں یا ان میں افراط و تفریط اور تحریف شروع ہو چکی تھیں، لیکن پھر بھی بعض ایسے اخلاقی خصائص پائے جاتے تھے اور اس میں ایسی ترقی ہو چکی تھی جس کا تصور بھی اس زمانہ میں مشکل ہے مشرقیوں نے بعض اخلاق و خصائل کو ترقی دیتے دیتے ایک مستقل فن بنا دیا تھا اور اس میں ایسی نزاکت و نفاست پیدا کی تھی جو مغرب میں صرف ادب و شاعری اور فنون لطیفہ کا حصہ ہے۔

اسلامی مشرق میں افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات اتنے مستحکم دیرپا اور عمیق تھے جو اس زمانہ کے تصور سے بالاتر ہیں، اولاد کی محبت والدین کے ساتھ، والدین کی شفقت اولاد کے ساتھ، خورد کی تعظیم بزرگ کے لئے، بزرگ کی تواضع و شفقت، عورت کی عفت آبی ازدواجی وفاداری، ملازم کی نمک حلالی اور امانت داری، نوجوانوں کی اخلاقی استقامت، شرفا کا معاملہ و سلوک، تعلقات و ملاقات، اوقات و معمولات، لباس و معاشرت میں کامل یکسانی، اور وضعداری، دوستوں کے لئے ایثار و قربانی اور ہمدردی اس میں سے ہر ایک ایسا وسیع عنوان ہو

جس کے ماتحت ایسے واقعات ہیں جن کو زیادہ زمانہ گزر جانے کے بعد آسانی سے باور نہیں کیا جائے گا لیکن ابھی ان کے باور کرنے کے اسباب و قرائن موجود ہیں۔

اولاد کی اطاعت و سعادت مندی اسلامی مشرق میں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک (اور شاید کہیں کہیں اب بھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بلوری تعمیل تھی جو آپ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ "انت ومالک لابیک" (تم اور تمہاری ملکیت و دولت سب تمہارے باپ کی ہے)

والدین کی محبت اور ادائے حقوق کا جذبہ ان کی ذات اور ان کی زندگی تک محدود نہ تھا ان کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ان کے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ سلوک و اعانت تحائف و ہدایہ کے ذریعہ اظہار محبت و تعلق، سعادت مند اولاد کے گویا اخلاقی فرائض اور سعادت مندی کے لوازم میں سے تھا، اور یہ بھی دراصل نبوت کی اس اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا نتیجہ اور پرتو تھا کہ "من ابر البر صلة الرجل اهل ود ابيه بعد ان يولي"[1] (سب سے بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی انسان کا اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ اس کے انتقال کے بعد حسن سلوک ہے)۔

والدین کا تعلق اولاد کے ساتھ صحیح خیر خواہی اور مشرقی ایثار و قربانی کا نمونہ ہوتا تھا وہ اس کے لئے اپنے لذائذ، خواہشات اور راحت قربان کرتے تھے اور اس کی صحیح تعلیم و تربیت اپنا اصلی فرض سمجھتے تھے اور اس کی تعلیم اخلاقی

---

[1] صحیح مسلم

تنبیہ اور استادوں کی سرزنش و تادیب کے موقع پر اپنا دل پتھر کا بنا لیتے تھے، ایسے موقع پر بچہ کی جانب داری اور استاد کے فعل سے آزردگی معیار شرافت سے بہت گری ہوئی بات سمجھی جاتی تھی جس کے لئے کوئی شریف باپ تیار نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ غیر تعلیم یافتہ والدین بھی بعض اوقات استاد کی زیادتی پر استادوں ہی کی تائید اور بچہ ہی کو زجر و تنبیہ کرتے تھے، یہ فقرہ عام طور پر والدین کی زبان زد تھا کہ "استاد کا حق باپ سے زیادہ ہے"۔

اسلامی معاشرے میں، بڑے اور چھوٹے کا تعلق من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا (جو اپنے خورد پر شفقت نہ کرے اور جماعت کے بزرگ کی توقیر نہ کرے وہ ہماری جماعت میں سے نہیں ہے) کی تصویر تھی۔

مشرقی اخلاق و تہذیب کا جوہر وضعداری و استقامت اور زندگی کی یکسانی ہے، اس پچھلے دور میں اس بر سر تنزل سوسائٹی میں بھی اس بارہ میں عجیب عجیب مثالیں ملتی ہیں، جو شخص جو کام شروع کر دیتا تھا، برسوں کرتا رہتا تھا، جو معمول مقرر کر لیتا تھا، اس میں موسم کے تغیرات، صحت کے اتار چڑھاؤ اور معمولی موانع اور کسلمندی سے فرق نہیں آنے دیتا تھا جس سے جس طرح معاملہ شروع کر دیتا تھا آخر دم تک نباہتا تھا، خواہ اس پر کچھ بن جائے اور حالات میں کچھ بھی تغیر ہو جائے۔

اس دور میں خاندانی اور قبائلی زندگی میں فرد کی عزت و توقیر کا معیار اور تعلقات کی وابستگی کی شرط تنہا دولت و تمول نہ تھی، ایک خاندان میں مختلف افراد خاندان مختلف معاشی سطح کے ہوتے، کوئی دولت مند ہوتا، کوئی تنگدست و

پریشاں حال، لیکن خاندانی اجتماعات و مجالس میں یہ مجال نہ تھی کہ مالی حیثیتوں کے فرق کی بنا پر ایک خاندان کے لوگوں کے درمیان تفریق یا مختلف معاملہ کیا جاتا اگر کبھی ایسی غلطی ہو جاتی تو اس پر سارا خاندان احتجاج اور بعض اوقات مقاطعہ کرتا، ایک تنگ دست شریف زادہ دوسرے مرفہ الحال بھائی سے آنکھیں چار کر کے باتیں کرتا اور وہ اس کے علوئے خاندانی جوہر شرافت یا لیاقت یا قرابت کی بنا پر مساویانہ سلوک کرتا، اس میں بھی بڑا اہتمام تھا کہ عزت و عسرت کا اظہار قریب ترین متعلقین کے سوا کسی پر نہ ہونے پائے۔

اسلامی ماحول کے دور آخر تک شریف و بااصول انسان کا ضمیر اس کی عزت و آبرو اور مذہبی عقیدہ کی طرح ایک ایسی ناقابل فروخت چیز سمجھی جاتی تھی جس کا دنیا میں سودا نہیں ہو سکتا تھا اور جو بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت نہیں کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے آگے پیچھے مسلمان شرفا کی متعدد نظیریں ملیں گی کہ انھوں نے اپنا خون گوارا کیا لیکن ضمیر کا خون کرنا پسند نہیں کیا اور اس لئے گولی کھائی یا پھانسی پر چڑھے کہ جھوٹ بولنا منظور نہ تھا، اور جان بخشی کے لئے ضروری تھا کہ وہ جھوٹ بول کر اپنی صفائی پیش کریں، اور ہنگامہ میں شرکت سے انکار کریں، جو ان کے نزدیک خلاف واقعہ اور خلاف ضمیر بات تھی۔

قومی و ملی باتوں میں بھی وہ اسی طرح سچے ثابت ہوتے تھے جس طرح شخصی و خاندانی معاملات میں قومی عصبیت و جانبداری کی وہ ہوا جو مغربی قوم پرستی کے دور میں چلی ہو اس وقت تک نہیں چلی تھی وہ قوم کے معاملات میں بھی جھوٹ بولنا، جھوٹی شہادت دینا، اسی طرح گناہ سمجھتے تھے جس طرح اپنے ذاتی معاملات میں، احکام

شریعت کو وہ شخصی اور قومی تمام امور و مسائل کے لئے عام سمجھتے تھے اور قرآن مجید کی حسب ذیل روایات ان کے پیش نظر تھیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ
(النساء - ١٣٥)

اے ایمان والو انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو خواہ تمھیں گواہی خود اپنے خلاف اور اپنے والدین اور اعزا کے خلاف دینی پڑے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ۔
(المائدہ - ٨)

کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے معاملہ میں انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو، انصاف سے کام لو یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کا لحاظ کرو۔

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ
وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ۔
(النساء - ٥٨، الانعام - ١٥٢)

جب لوگوں کے درمیان حکم اور ثالث ہو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔
جب بات کہو انصاف سے کہو چاہے کسی قرابت دار کے خلاف پڑے

انگریزی عملداری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبہ کاندھلہ میں ایک

جگہ پر ہندو مسلمانوں کا تنازعہ ہوا کہ یہ ہندوؤں کا معبد ہے یا مسلمانوں کی مسجد، انگریز مجسٹریٹ نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مسلمانوں سے تخلیہ میں پوچھا کہ کیا ہندوؤں میں کوئی ایسا شخص ہے جس کی صداقت پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں اور جس کی شہادت پر فیصلہ کر دیا جائے، انھوں نے کہا کہ ہمارے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں، ہندوؤں سے پوچھا تو انھوں نے کہا یہ بڑی آزمائش کا موقع ہے، معاملہ قومی ہے لیکن پھر بھی ایک مسلمان بزرگ ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے، شاید وہ اس موقع پر بھی سچی ہی بات کہیں، یہ بزرگ مفتی الٰہی بخش صاحبؒ (تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) کے خاندان کے ایک بزرگ تھے، مجسٹریٹ نے ان کے پاس چپراسی بھیج کر عدالت میں طلب کیا، انھوں نے فرمایا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا کبھی منہ نہیں دیکھوں گا، مجسٹریٹ نے کہلوایا کہ آپ میرا منہ نہ دیکھیں لیکن تشریف لے آئیں، معاملہ اہم ہے اور آپ کے یہاں تشریف لائے بغیر فیصل نہیں ہو سکتا وہ بزرگ تشریف لائے اور پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ معاملہ ان کی خدمت میں عرض کیا گیا اور دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس بارہ میں کیا علم ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی نگاہیں ان کے چہرے پر تھیں اور کان ان کے جواب پر لگے ہوئے تھے، جن پر اس اہم قومی معاملہ کا فیصلہ ہونا تھا، ان بزرگ نے فرمایا کہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جگہ ہندوؤں کی ہے مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں، عدالت کا فیصلہ ہو گیا، جگہ ہندوؤں کو مل گئی، مسلمان مقدمہ ہار گئے لیکن اسلام کی اخلاقی فتح ہوئی۔ صداقت اور اسلامی اخلاق کے ایک مظاہرہ نے چند گز زمین کھو کر بہت سے غیر مسلم انسانوں کے ضمیر اور دل و دماغ جیت لئے بہت سے ہندو اسی روز ان کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے

ضمیر کے علاوہ علم و دانش اور دماغی قوت و ذہانت بھی ایک ایسی مقدس اور قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی جس کو ہر کس و ناکس کے ہاتھ اونے پونے فروخت نہیں کیا جاتا تھا جو لوگ اس بارہ میں بلند مقام پر تھے وہ تو کسی قیمت پر بھی ان کو فروخت کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس کو اللہ کا بیش قیمت عطیہ اور امانت سمجھتے تھے خصوصاً کفر و فسق کی بلاواسطہ یا بالواسطہ اعانت و تقویت میں اس کو صرف کرنا یا کسی غلط نظام کا آلۂ کار بننا تو بہت بڑی خیانت اور دین فروشی سمجھتے تھے۔

اسی ذہنیت اور سیرت کے ایک بزرگ مولانا عبد الرحیم صاحب رام پوری (م ۱۲۴۴ھ) تھے، روہیلکھنڈ کے انگریز حاکم مسٹر ہاکنس نے ان کو بریلی کالج کی تدریس کے لئے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ کی (جو ۱۸۵۷ء سے پہلے حیثیت و وقعت رکھتا تھا جو اس وقت ہزار بارہ سو کی بھی نہیں ہے) پیشکش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس مشاہرہ میں اضافہ اور ترقی ہو جائے گی، انھوں نے عذر کیا کہ ریاست سے ان کو دس روپے ماہوار ملتے ہیں وہ بند ہو جائیں گے، ہاکنس نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے پچیس گنا زیادہ پیش کرتا ہوں اس کے مقابلہ میں اس حقیر رقم کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے، انھوں نے اس کے بعد یہ عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے اس کی بیری میٹھی اور مجھے مرغوب ہے، بریلی میں وہ بیری کھانے کو نہیں ملے گی" ظاہر ہیں انگریز اب بھی ان کے دل کی بات نہیں پاسکا۔ اس نے کہا کہ رام پور سے آنے کا انتظام ہو سکتا ہے آپ بریلی میں بیٹھے ہوئے بھی اپنے گھر کی بیری کھا سکتے ہیں، مولانا نے فرمایا ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رام پور میں درس لیتے ہیں ان کا درس بند ہو جائے گا اور میں ان

کی خدمت سے محروم رہ جاؤں گا" انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی' اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں وہ بریلی میں آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں آخر اس مسلمان عالم نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے تعلیم پر اجرت لینے کے متعلق میں قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا' ہندوستان کے فاتح نے اب اپنی شکست تسلیم کرلی اور مولانا عبدالرحیم صاحب نے نواب احمد علی خاں والیٔ رام پور کے دس روپیہ ماہوار پر اپنی زندگی گزار دی رحمۃ اللہ علیہ[۱]

اس اخلاقی بلندی اور کردار کا مقابلہ اس زمانہ کی دانش فروشی سے کیجئے اس زمانہ کے اہل دانش نے اپنے علم' لیاقت اور ذہانت کو نیلام پر چڑھا رکھا ہے کہ جو زیادہ بولی بولے گا اس کے ہاتھ فروخت کر دیں گے' اگر کوئی اسلامی ادارہ سَو دے رہا ہے اور کسی نصرانی ادارے نے ایک سو پانچ لگائے تو اس کی طرف منتقل ہو گئے اور اگر کوئی یہودی اسٹیٹ قائم ہو جائے اور وہ طرح بڑھا کر بولی دے تو اسکے ہاتھ بک جائیں گے' مناسبت موضوع اور ذوق کی بھی کوئی شرط اگر حالات اجازت دیں تو محکمۂ تعلیم کا آدمی برائے نام ترقی پر پولیس کے محکمہ یا جہاز رانی کے محکمہ کی طرف بخوشی منتقل ہو سکتا ہو' ایک فاضل جس نے کسی علمی مقالہ پر ڈاکٹریٹ حاصل کیا اور جو تحقیقی مقالے لکھا کرتا تھا آپ اسکے متعلق سن سکتے ہیں کہ نہایت معمولی اضافہ کی بنا پر وہ کسی ایسے فوجی یا سیاسی محکمہ کی طرف منتقل ہو گیا ہو جس سے اس کو کوئی

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۲

ذہنی اور علمی مناسبت نہیں۔

آج کسی انشاپرداز کو اس میں ذرا تکلف نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی قلم سے ایک مجاہد اعظم کی سیرت لکھے پھر اسی قلم سے کسی قوم فروش کی منقبت لکھے۔

بعض شائقین کتب جب کوئی نادر بیش قیمت کتاب خرید تے تھے تو وجد و سرور میں اکثر یہ شعر پڑھتے تھے، برائے نام ترمیم کے ساتھ یہ شعر اب بھی پڑھا جا سکتا ہے ؎

جاوے چند دادم جاں خریدم
بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

اور "جاں" کے بجائے اگر "ایمان" پڑھا جائے تو بھی واقعہ کے لحاظ سے کیا غلط ہے!

روابط و تعلقات اور حقوق باہمی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کی بنیاد عام حالات میں اکثر غیر مادی اور خالص عقلی و روحانی یا قلبی ہوتی تھی اور ان میں خود غرضی اور نفسانیت کا شائبہ کم سے کم ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ بعض ایسے تعلقات اور روابط پائے جاتے تھے اور ان کی جڑیں قلب و دماغ میں اتنی گہری ہوتی تھیں جن کی کوئی مادی اور تاجرانہ توجیہ ممکن نہیں، استاذ و شاگرد کا ایسا تعلق تھا جس کے سامنے اس زمانہ میں باپ بیٹے اور محب و محبوب کا تعلق گرد ہے۔ عصر جدید کا ذہن شاید اس پر ہمیشہ حیرت کرے کہ ہندوستان کے مشہور عالم اور جلیل استاد ملا نظام الدین لکھنوی (سلالہ) صاحب درس نظامی کی خبر وفات سن کر ان کے ایک شاگرد سید کمال الدین عظیم آبادی کا صدمہ سے انتقال ہو گیا اور دوسرے

شاگرد وسید ظریف عظیم آبادی کے روتے روتے آنکھیں خراب ہوگئیں، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی لہ

یورپ میں لذتیت اور افادیت کے دو اخلاقی فلسفے اور مکتب خیال پھلتے پھولتے رہے ہیں مشرقی اور اسلامی اخلاقیت پر دونوں اثر انداز ہیں، مشرق کا اسلامی فلسفۂ اخلاق دونوں سے بہت بلند ہے، غرض اور نفسانیت، حظ نفس اور انتفاع کے خیال سے بھی پاک ہے۔

سترھویں صدی عیسوی سے افادیت کا غلبہ ہوتا گیا، مغرب کے علمائے اخلاق نے ڈنکے کی چوٹ پر کہنا شروع کیا کہ اخلاق میں سے جس چیز کا فائدہ ظاہر نہ ہو وہ قابل اعتنا نہیں ہے، لیکن اس فائدہ کی تشخیص وتعیین کے لیے جو ذہن میزان کا کام دیتا افسوس ہے کہ وہ برابر مادہ پرستانہ بنتا جارہا تھا اس کی ساخت اور افتاد روز بروز ایسی ہوتی جارہی تھی کہ کسی غیر مادی نفع کے تصور سے وہ قاصر تھا اور اس بارہ میں اس کی حس اور ذکاوت محدود اور معین تھی، نتیجہ یہ تھا کہ اخلاق کی تحدید وتعریف افادہ وانتفاع سے کی گئی یہ نازک کام جس حکم و ثالث کے سپرد ہوا وہ اپنی طبعی افتاد ومزاج کی وجہ سے کسی غیر مادی نفع کے تسلیم کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔ اسی طرح انتفاع کی تحدید قدرتی اور غیر شعوری طور پر مادی ہوگئی، اور عملاً فلسفۂ اخلاق کا کسی ایسی چیز سے سروکار نہ رہا جس کا کوئی مادی دمخصوص نفع نہ ہو رفتہ رفتہ یہ مادی ذہنیت اور افادیت ساری زندگی پر چھا گئی۔

لہ نزہتہ الخواطر ج ۶ بہ حوالہ رسالہ قطبیہ

یورپ کے ادبیات میں پچھلی صدیوں میں جن الفاظ کا استعمال سب سے زیادہ ہوا ہے اور جو الفاظ یورپ کے لئے آج بھی سب سے زیادہ کشش رکھتے ہیں ان میں ایک لفظ "فطرت" بھی ہے لیکن جن چیزوں کے مقابلہ میں اور جن مواقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ان سے صاف تعین ہوتی ہے کہ "فطرت" سے مراد فطرت حیوانی ہے جو ہر قسم کے لطیف احساسات، اخلاقی ضمیر اور قلب سلیم اور عقل سلیم دونوں سے آزاد ہوتی ہے ہر قسم کی پابندیوں اور حدود سے گھبراتی ہے جس کا تقاضا صرف یہ ہے کہ کھائیے پیجئے اور آزاد رہیے۔ اس کے لئے حقوق و مطالبات ہیں اور انسانی ذمہ داریاں نہیں ہیں، انیسویں صدی میں انسان کی اصل قدیم کے متعلق جو تحقیق کی گئی اور جس کو عام طور پر تسلیم کیا گیا وہ ہر شعبۂ زندگی میں اثر انداز ہوئی اخلاق پر بھی اس کا محسوس و غیر محسوس اثر پڑا۔[1]

اس کے بعد اب اس دور میں یورپ میں میکانکی عہد شروع ہوا، انسان کا تصور خالص جماداتی ہو گیا اور وہ تھوڑی سی لچک اور زندگی بھی جاتی رہی جو حیوانی تصور میں پائی جاتی ہے۔

مسلمان یوروپین محمد اسد صاحب نے یورپ کے اس اخلاقی تغیر پر گہرا اور سنجیدہ تبصرہ کیا ہے، اگر مغرب کا ذہنی و سیاسی اقتدار مشرق پر اسی طرح قائم رہا اور خود یورپ میں کوئی بڑا انقلاب نہ آیا تو آج مغرب کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے کل مشرق کے متعلق بھی وہی صحیح ہوگا اور اس کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں، ہر شعبہ

---

[1] ملاحظہ ہو عنوان "ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا اثر"

زندگی کی طرح مشرقی اخلاق جدید مغربی سانچہ میں ڈھلتے جا رہے ہیں، جو حلقے مغربی تعلیم و تہذیب سے پورے طور پر متاثر ہیں، ان کے اخلاق مغربی فلسفۂ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہیں، محمد اسد صاحب لکھتے ہیں:۔

(”یورپ میں) انسانوں کی ایک ایسی قطع پیدا ہو گئی ہے جس کی اخلاقیت عملی افادیت کے سوال کے اندر محصور ہو اور جس کے نزدیک خیر و شر کا بلند ترین معیار مادی کامیابی ہے، مغرب کے معاشری زندگی موجودہ زمانہ میں جس گہری تبدیلی سے گزر رہی ہو اس میں نئی اخلاقی افادیت روز بروز زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی جارہی ہے، وہ تمام محاسن جو سوسائٹی کے مادی مفاد پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً صنعتی قابلیت، وطن پرستی، قوم پرستانہ احساس جماعت ان کی عظمت بڑھتی جارہی ہے اور ان کی قیمت میں بعض اوقات غیر معقول طریقہ پر مبالغہ کیا جاتا ہے، اسکے مقابل میں وہ محاسن جن کی ابھی تک محض اخلاقی حیثیت سے قیمت تھی، مثلاً محبت پدری یا ازدواجی وفاداری وہ بڑی سرعت کے ساتھ اپنی اہمیت کھو رہے ہیں اس لئے کہ وہ سوسائٹی کو کوئی نمایاں مادی فائدہ نہیں پہنچاتے اس زمانہ کی جگہ جس میں خاندانی روابط کا استحکام کسی خاندان اور قبیلہ کی خیر و فلاح کے لئے ضروری تصور کیا جاتا تھا مغرب جدید میں اس زمانہ نے لے لی ہے جو وسیع تر عنوانات کے تحت اجتماعی تنظیم کرتا ہے ایک ایسی سوسائٹی میں جو بنیادی طور پر صنعتی ہے اور جس کی تنظیم

بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جارہی ہے ایک فرد کا برتاؤ اپنے والد کے ساتھ کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا جب تک کہ یہ افراد اس عام معیار شرافت کے حدود کے اندر وایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہیں جو سوسائٹی نے افراد کے باہمی برتاؤ کے لیے مقرر کر دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپین باپ کا اقتدار اپنے بیٹے پر برابر کم ہوتا جارہا ہے اور بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ رو بہ زوال ہے، ان دونوں کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جاتے ہیں اور عملاً ایک ایسی مشینی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے جس میں افراد کے باہمی حقوق کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی رشتہ داری کے پیدا کیے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جاتے ہیں۔ [1]

پست ہمتی و تن آسانی

اسلامی مشرق میں انسان کی ترقی اور کمال کا معیار بہت بلند تھا، اس کے نزدیک دین و دنیا اور علم و عمل کی جامعیت بہت سے متفرق انسانی صفات کے اتصاف اور انسانی کمالات

---

[1] Islam at the Croas Road
The Tragedy of Europe

بہت سے ایسے منتشر شعبوں کا اجتماع ضروری تھا، جن میں اس زمانہ کی پست ہمتی اور کوتاہ نظری تضاد سمجھتی ہے اور کسی فرد انسان میں ان کے بیک وقت جمع کے تصور سے اکثر قاصر ہے، پوری دنیائے اسلام میں سے صرف ہندوستان کے مسلمان سلاطین اور ان کے امراء و وزراء کی سیرت پر ایک نظر ڈال لیجئے آپ کو عالی ہمتی، بلند حوصلگی، کمالات و خصوصیات کے تنوع، قبائے شاہی کے اندر درویشی مہمات سیاسی کے انہماک و تن دہی کے ساتھ عبادت کی مشغولیت و سرگرمی، علمی ذوق و مطالعہ کے ایسے نادر نمونے ملیں گے جن کی نظیر عام انسانی تاریخ میں ملنی آسان نہیں اور جن کی تصدیق میں اس زمانہ کا تنگ ظرف ذہن اور انسانی ترقی و کمال کا محدود تصور بار بار دقتیں محسوس کرے گا۔

سلطان شمس الدین التمش کی سلطنت کی وسعت اور اس کی ملکی سیاسی مصروفیت کا حال تاریخ ہندوستان کا ہر طالب علم جانتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کی انتظامی مشغولیت، شاہانہ ضروریات و مطالبات جنگوں اور سفروں کی کثرت اس کی مذہبی پابندی اور معمولات میں مطلق حارج نہ تھی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی کبھی عصر کی سنتیں اور تکبیرۂ اولیٰ فوت نہ ہوئی ہو، جب اس وصیت کا اعلان کیا گیا تو سلطان آگے بڑھا اور اس نے نماز پڑھائی۔

سلطان غیاث الدین بلبن، ناصر الدین محمود، فیروز تغلق کی مذہبی زندگی اور مذہبی پابندی کا حال کوئی چھپا ہوا واقعہ نہیں۔

سلاطین گجرات بالخصوص دین و دنیا کی جامعیت اور "جنیدی و اردشیری" کے

کا بہترین نمونہ تھے۔ محمود شاہ اوّل (م ۹۱۰ھ) اور اس کے بیٹے مظفر شاہ حلیم (م ۹۳۲ھ) کے حالات اس کی بہترین شہادت ہیں۔

مؤرخ ہندوستان مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ مظفر شاہ حلیم کے حالات تذکرۂ یاد ایام میں لکھتے ہیں۔

"محمود شاہ کے بعد اس کا فرزند رشید نعم الخلف لنعم السلف کا صحیح مصداق مظفر شاہ حلیم تاج دسریر کا مالک ہوا، علوم وفنون میں علامہ محمد ابن محمد الایجی کا شاگرد تھا اور حدیث علامہ جمال الدین محمد بن عمر بحرق سے پڑھی تھی، قرآن مجید حفظ کر لینے کا شرف ایسی عمر میں اس کو نصیب ہوا تھا، جس کی نسبت شیخ سعدی فرماتے ہیں۔"

"در ایام جوانی چناں کہ افتد دانی" اس فضل وکمال کے ساتھ تقویٰ اور عزیمت کی دولت بھی اس نے خداداد پائی تھی، تمام عمر نصوص احادیث پر عمل رہا، ہمیشہ باوضو رہتا، نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا، روزے عمر بھر نہیں چھوٹے، شراب ناب کو کبھی منھ سے نہیں لگایا، کبھی کسی پر بے جا سختی نہیں کی، بدزبانی سے اپنے منھ کو گندہ نہیں کیا، عجیب تر بات یہ ہے کہ اس پیکر تقدس میں سپہ گری اور ملک داری کی صفتیں بھی علیٰ وجہ الکمال مجتمع تھیں، مالوہ کی فتوحات عظیمہ تاریخوں میں پڑھئے اور ان سے اس کے اخلاق فاضلہ کا اندازہ کیجئے.............. جس وقت

محمود شاہ دوم مالوہ کی غفلت و سوء تدبیری سے اس کے وزیر مندلی رائے نے زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے کر محمود شاہ کو بے دخل کر دیا اور شعائر اسلام کو مٹا کر رسوم کفر کی ترویج شروع کر دی مظفر شاہ حلیم علیہ الرحمہ کی رگ حمیت کو جنبش ہوئی اس نے افواج قاہرہ کے ساتھ مالوہ کی جانب نہضت فرمائی اور کوچ در کوچ کرتا ہوا مانڈو پہونچا اور اس کا محاصرہ کر لیا، مندلی رائے نے یہ سمجھ کر کہ وہ خود تاب مقاومت نہیں لا سکتا رانا سانگا کو جیش بہا تحائف کا لالچ دے کر اپنی مدد کے واسطے بلایا وہ ہنوز سارنگپور تک نہیں پہونچا تھا کہ مظفر شاہ حلیم نے اس کی مدارات کے لیے اپنی فوج ظفر موج کا ایک معقول حصہ آگے کو روانہ کر دیا جس سے رانا کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکی اور قبل اس کے کہ مندلی رائے کو اطراف و جوانب سے کمک پہونچے قلعہ کو مسخر کر لیا۔

جان سخن یہ ہے کہ تسخیر قلعہ کے بعد جس وقت مظفر شاہ حلیم اندر داخل ہوا اور امرا ہم رکاب نے شاہان مالوہ کے سامان تجمل اور خزائن و دفائن کو ملاحظہ کیا اور اس ملک کی سرسبزی و شادابی کی اطلاع پائی تو انھوں نے جسارت کر کے مظفر شاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار سوار جرار درجہ شہادت کو پہونچ چکے ہیں یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک کو اسی بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے جس

کی سو تدبیر سے مندلی راۓ نے اس پر قابو پا لیا تھا بادشاہ نے
یہ سنتے ہی سیر موقوف کی اور قلعہ سے باہر نکل کر محمود شاہ کو ہدایت
فرمائی کہ اس کے ہم رکاب لوگوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر نہ
جانے دے، محمود نے باصرار تمام اس بات کی التجا کی کہ بادشاہ
چند روز قلعہ کے اندر آرام فرمائیں۔ مگر مظفر شاہ نے اس التجا
کو قبول نہ فرمایا اور بعد کو خود ظاہر کیا کہ میں نے یہ جہاد محض
خداوند برحق کی رضامندی حاصل کرنے کو کیا تھا مجھ کو امرا کی
تقریر سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا کوئی خطرہ فاسد میرے دل میں
پیدا ہو اور میرا خلوص نیت برباد ہو جائے میں نے محمود پر کوئی
احسان نہیں کیا بلکہ محمود کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس کی وجہ
سے مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔

انتقال کے قریب علماء و ارکان دولت کی ایک مجلس میں بادشاہ نے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر بیان کیا کہ میں خدا کے فضل و کرم سے قرآن کے حفظ کے ساتھ ہر آیت سے متعلق ضروری مسائل و احکام، اسباب نزول اور اصول تجوید کا علم رکھتا ہوں، اپنے استاد علامہ جمال الدین محمد بن عمر بحرقی سے جن احادیث کی سند لی ہے وہ مع متن و سند راویوں کے حال کے مجھے حفظ ہیں، فقہ میں مجھے بفضلہ تعالیٰ وہ درک حاصل ہے کہ حدیث "من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین" (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کا فقیہ بنا دیتا ہے) کا مصداق بننے کی امید رکھتا ہوں، اور اب چند مہینوں سے حضرات صوفیہ و مشائخ کے

طریق پر تزکیۂ نفس میں مشغول ہوں اور "من تشبہ بقوم فھو منھم" کی بنا پر ان کے برکات کی امید رکھتا ہوں تفسیر معالم التنزیل[1] ایک بار ختم کر چکا ہوں دوبارہ پھر شروع کی ہے، نصف تک پہونچ گیا ہوں، باقی امید ہے کہ ان شاء اللہ جنت میں ختم کروں گا

جمعہ کی نماز کے قریب استحضار کی کیفیت شروع ہوئی، لوگوں کو حکم دیا کہ نماز پڑھنے جائیں، خود ظہر کی نماز پڑھی اور کہا کہ ظہر کی نماز میں نے تمہارے یہاں پڑھی ہے، عصر کی نماز ان شاء اللہ جنت میں پڑھوں گا، انتقال کے وقت حضرت یوسفؑ کی یہ دعا زبان پر تھی جو اس درویش بادشاہ کے بالکل حسب حال تھی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

(یوسف - ۱۰۱)

پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا، اے آسمان و زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

---

[1] علامہ بغوی کی ضخیم تفسیر جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

شیر شاہ سوری (م ۹۵۲ ھ) کے اوقات و معمولات کی فہرست جو مورخین نے تاریخ میں محفوظ کردی ہے ملاحظہ ہو، اس زمانے میں متوسط درجہ کے مشغول انسان کے لیے بھی ان کا التزام مشکل ہے چہ جائے کہ اس معروف ترین بادشاہ کے لیے جس کو پانچ برس کی مدت میں ایک صدی کا کام کرنا تھا اور جس کو بظاہر اپنی انتظامی و سیاسی مشغولیت سے ایک لمحہ کی فرصت نہیں ہونی چاہیئے تھی۔

"شیر شاہ تہائی رات رہتی کہ بیدار ہو جاتا، غسل کرتا اور نوافل پڑھتا، نماز فجر سے پہلے اوراد ختم کر لیتا، پھر مختلف محکموں کے حسابات دیکھتا اور دن کے اہم کاموں کے متعلق حکام و اہل کاران سلطنت کو ہدایت دیتا اور روزانہ کا نظام عمل بتلاتا تاکہ دن کو سوالات سے اس کو پریشان نہ کریں، اس سب سے فارغ ہو کر نماز فجر کے لیے وضو کرتا اور جماعت کے ساتھ نماز فجر پڑھتا، پھر اذکار و اوراد میں مشغول ہو جاتا، اتنے میں حکام سلام کے لیے حاضر ہوتے بادشاہ نماز اشراق سے فارغ ہو کر، لوگوں کی ضروریات معلوم کرتا اور گھوڑے، علاقے، جاگیریں اور مال جس کو جیسی ضرورت ہوتی دیتا، پھر اہل مقدمہ اور داد خواہوں کی طرف متوجہ ہوتا اور اُن کی دادرسی اور حاجت برآری کرتا، پھر افواج شاہی اور اسلحہ کا معائنہ کرتا اور فوج کے لیے امیدواروں کی قابلیت کا اندازہ کر کے ان کے تقرر کا حکم دیتا، پھر ملک کی روزانہ آمدنی اور مالیہ کا معائنہ کرتا، پھر ارکانِ سلطنت اُمراء اور سلطنتوں کے

سفراء اور وکلا حاضر ہوتے ان سے گفتگو کرتا، پھر حکام اور اہل کاروں کی عرضیاں گزرتیں، ان کی سماعت کرتا اور حکم لکھواتا، پھر دوپہر کا کھانا تناول کرتا، علمائے ومشائخ بھی دسترخوان پر ہوتے، پھر ظہر کی نماز تک دو گھنٹے اپنے ذاتی کام انجام دیتا اور قیلولہ کرتا، پھر ظہر کی نماز جماعت سے پڑھتا، اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا، اس سے فارغ ہو کر پھر امور سلطنت میں مشغول ہو جاتا، سفر وحضر میں اس نظام الاوقات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، کہا کرتا تھا کہ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنا پورا وقت ضروری کاموں میں صرف کرے۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے تفصیلی حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا کا بادشاہ جو کابل وقندھار سے کر دکن تک حکومت کرتا تھا اور اس پوری وسیع سلطنت کی بذات خود نگرانی کرتا تھا، اپنی عالی ہمتی اور عزم کی قوت سے اتنا وقت نکال لیتا تھا کہ تمام مہمات ملکی کے ساتھ اول وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا تھا، سنن ونوافل کی پابندی کرتا تھا، سخت گرمی میں رمضان کے پورے روزے رکھتا تھا اور رات کو تراویح پڑھتا تھا، رمضان کے عشرۂ اخیر میں مسجد میں اعتکاف کرتا تھا، دوشنبہ پنجشنبہ اور جمعہ کو ہر ہفتہ روزہ رکھتا تھا، ہمیشہ باوضو رہتا تھا، اذکار وادعیۂ ماثورہ کا پابند تھا، روز صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا اور تمام ملکی وسیاسی مشاغل اور انتشار طبیعت کے ساتھ پوری دلجمعی سے حضرت خواجہ سیف الدین وغیرہ

حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ایسا استفادہ باطنی کرتا تھا کہ وہ اپنے والد ماجد حضرت خواجہ محمد معصومؒ کو اس میں آثار ذکر کے ظاہر ہونے کی اطلاع دیتے ہیں، روزانہ کی مصروفیتوں کے ساتھ اور اتنا وقت نکال لیتا تھا کہ فتاویٰ عالمگیری کو جو اس کے حکم سے علماء ترتیب دے رہے تھے روزکا روز سنتا تھا اور مشورہ دیتا تھا۔

عالمگیر کی تخت نشینی کا زمانہ کتنا پر آشوب اور تلاطم خیز تھا، اسی زمانہ میں اس کو سلطنت کی از سرِ نو تنظیم کرنی پڑی، اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبانا پڑا لیکن یہ عالمگیر ہی کی عزیمت تھی کہ اس زمانہ میں جب اس کو سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی اس نے قرآن مجید حفظ کرنے کے لئے وقت نکال لیا اور اپنی کتاب "اربعین" کی (جس میں اس نے چالیس حدیثیں جمع کی تھیں) شرح لکھی، عالمگیر کا شعر ہے:۔

غمِ عالم فراواں است و من یک غنچۂ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را

لیکن اس نے اس "شیشۂ ساعت" میں جس طرح اس "ریگِ بیاباں" کو بند کیا وہ اس کی مندرجہ بالا خصوصیات سے ظاہر ہے۔

امراء اور وزراء میں دیکھئے تو آپ کو عبدالرحیم بیرم خان خاناں۔ جملۃ الملک سعد اللہ خاں علامی، مجد الدین محمد حسین مولائی، اختیار خاں، افضل خاں اور مسند عالی عبدالعزیز آصف خاں جیسے جامع کمالات، بزرگ نظر آتے ہیں، ان میں سے صرف دو (عبدالرحیم خان خاناں اور آصف خاں) کا مختصر تذکرہ کیا

جاتا ہے

عبدالرحیم خاں نے درسی کتابیں مولانا محمد امین اتب جانی اور قاضی نظام الدین بدخشانی سے پڑھیں اور حکیم علی گیلانی اور علامہ فتح اللہ شیرازی سے علمی استفادہ کیا، پھر جب گجرات میں قیام کا موقعہ ملا تو علامہ وجیہ الدین بن نصر اللہ گجراتی سے مزید تحصیل علم کی، ان اساتذۂ وقت کے علاوہ اس کا دربار اہل کمال اور ماہرین فن کا مرکز تھا، ان سے برابر علمی مذاکرہ و استفادہ جاری رہتا تھا، یہاں تک کہ تمام علوم و فنون میں تبحر پیدا کرلیا، اکثر اصناف علم و ادب میں ذوق سلیم، ناقدانہ نظر اور فیصلہ کن رائے رکھتا تھا، زباں دانی میں دیکھئے تو اس کو ہفت زبان کہنا صحیح ہوگا، عبدالرزاق خوانی مآثر الامراء میں لکھتا ہے کہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں میں مہارتِ کامل رکھتا تھا، ان سب زبانوں میں فصاحت و طلاقت سے گفتگو کرتا اور بے تکلف آبدار شعر کہتا۔

ان علمی کمالات کے ساتھ فنونِ جنگ اور سپہ گری میں یکتائے روزگار اور شجاعت و بہادری میں نامدار تھا، گجرات و سندھ اور دکن کی فتوحات اس کی شجاعت و خوش تدبیری کی یادگاریں ہیں۔

اخلاق و کرم کے لحاظ سے دیکھئے تو تمام مؤرخ اس کے حسنِ خلق، نرم خوئی، بردباری، خاکساری اور تواضع کے ثناخواں ہیں۔

داد و دہش اور سخاوت کی حیثیت سے دیکھئے تو سید غلام علی بلگرامی شہادت دیتے ہیں کہ اگر عبدالرحیم خان خاناں کے انعامات اور صلے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور تمام شاہانِ صفویہ کے انعامات اور زرپاشی

ایک پلڑے پر ہو تو عبدالرحیم کا پلڑا بھاری رہے گا۔[1]

علمی ذوق و مطالعہ کے انہماک کا عالم یہ تھا کہ عین میدانِ جنگ میں گھوڑے کی پیٹھ پر کتاب کے اجزا ہاتھ میں کھلے ہوئے ہوتے، نہانے کا وقت بھی کتاب سے خالی نہ ہوتا، خدام کتاب کھولے ہوئے سامنے کھڑے ہوتے، نہانے کے ساتھ ساتھ کتاب کا مطالعہ جاری رہتا۔

دینی رجحان اور طبیعت کی صلاحیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نگاہِ التفات اور نظرِ انتخاب سے منظور تھا اور ان خوش قسمت افراد میں شامل تھا جن کو حضرت مجدد صاحب کے مکتوب الیہ اور معتمد علیہ ہونے کا شرف حاصل تھا، مجدد صاحب کے مکتوبات سے اُن کے قلبی تعلق اور گہری ارادت کا پتہ چلتا ہے۔

آصف خاں وزیر گجرات کا حال پڑھیے تو جامعیت و باکمالی کی ایک دوسری تصویر نظر آئے گی۔

عبدالعزیز نام تھا، حمید الملک کے بڑے بیٹے تھے، کچھ کتابیں والد سے پڑھیں، حدیث و فقہ قاضی برہان الدین نہروالے سے حاصل کی، علوم حکمیہ میں ابوالفضل گازرونی اور ابوالفضل استرآبادی کے شاگرد تھے، علوم و فنون کی تحصیل سے فراغت ہوئی تو دربارِ شاہی میں پہونچے، بہادر شاہ کے زمانہ میں وزارت ملی، محمود شاہ کے زمانہ میں وکالت مطلقہ کے عہدہ پر

---

[1] خزانۂ عامرہ

سرفراز ہوئے باوجود ان مناصب جلیلہ کے درس وتدریس اور مذاکرۂ علمی کا شغل آخر وقت تک قائم رہا۔

بعض سیاسی انقلابات کی وجہ سے ایک عرصہ تک آصف خاں نے مکۂ معظمہ میں قیام کیا، وہاں علماء حرمین اور بلاد وامصار کے باکمال ان کے علمی وعملی کمالات، دینی استقامت وعزیمت اور عبادت کی مشغولیت دیکھ کر انگشت بدندان رہ گئے، علامۂ عصر ابن حجر مکی نے تو ان کے فضائل ومناقب میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے (اور غالباً کسی ہندی کے مناقب میں ایک مسلّم الثبوت عرب عالم کی یہ پہلی تصنیف ہے) جس میں ان کے فضل وکمال تقویٰ وتقدس کی بڑی مدح سرائی کی ہے۔

علماء حرمین کی شہادت ہے کہ جواری وخدام اور جاہ وحشم کے باوجود ان کی زندگی مکۂ معظمہ میں بالکل زاہدانہ تھی، قرآن کے دس پارے تہجد میں پڑھتے، ابن حجر مکی کی شہادت ہے کہ مکۂ معظمہ کے دس سالہ قیام میں مسجد حرام میں ان کی کوئی جماعت فوت نہیں ہوئی، ان کی قیام گاہ مطاف کے محاذی تھی، کبھی نوافل، ذکر وتسبیح، مراقبہ مطالعہ کے علاوہ ان کو کسی حال میں نہیں دیکھا گیا، اونچی اونچی کتابوں کا درس اور علماء سے علمی مذاکرہ بحث وتحقیق کا سلسلہ برابر جاری رہتا، علماء حرم بڑے شوق سے ان کی علمی مجالس میں شریک ہوتے، اعلیٰ درسی اور دینی فنون کی منتہیانہ کتابوں کے اشکالات پر فاضلانہ ومحققانہ گفتگو وتحقیق ہوتی۔

علمی سرپرستی اور قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں کہ جس زمانہ

میں آصف خاں مکہ معظمہ میں آکر رہے تھے تو عجیب طرح کی رونق مکہ معظمہ میں پیدا ہو گئی تھی، علماء و فقہا ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے، علم کا چرچا بڑھ گیا تھا اور مکہ والوں نے تحصیل علم میں بڑی کوشش کی تھی، طلبہ ہر طرف سے سمٹ آئے تھے اور انھوں نے حصول علم پر مستقل توجہ کی اور دقائق علمی کی اس غرض سے جستجو و تلاش کی کہ آصف خاں کے سامنے ان کو پیش کریں اور رسوخ پیدا کریں، اور مشکلات فن کو محفوظ کیا تاکہ ان کے ذریعہ سے ان کا تقرب حاصل کریں، یہ سب اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اہل علم پر احسان و کرم کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ جس کی نظیر ان کے معاصرین میں بلکہ ایک مدت سے موقوف تھی، یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں ہر گلی کوچہ میں ان کو اس طرح دعائیں دی جاتی تھیں جس طرح لبیک کی صدائیں ایام حج میں بلند ہوتی ہیں۔

آصف خاں کے فضائل و کمالات کی دور دور ایسی شہرت ہوئی کہ سلطان ترکی نے ان کی ملاقات کی آرزو ظاہر کی اور شریف مکہ کے توسط سے شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ قسطنطنیہ بلایا اور بڑی توجہ و اعزاز کے ساتھ اس جامع کمالات ہستی سے گفتگو کی۔

ایک رفیق سفر نے جس نے مکہ معظمہ سے قسطنطنیہ تک آصف خاں کے ساتھ سفر کیا تھا بیان کیا کہ اس پورے سفر میں آصف خاں نے کبھی کسی رخصت پر عمل نہیں کیا، ہمیشہ اسی طرح عزیمت پر عمل کرتے رہے جیسے اقامت میں کرتے تھے، غسر دیا اشما کم صورتے آصف خاں کے لئے ایک خلعت بھیجی اور سفیر نے باصرار عرض کیا کہ بادشاہ کی خوشی کے لئے آپ اس کو ایک مرتبہ بدن پر ڈال

ئیں تاکہ کھنے کو ہو جائے، آصف خاں نے معذرت کی کہ یہ قبا ریشمی ہے، میں اسکو کسی طرح بدن پر نہیں رکھ سکتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر بادشاہ مظفر شاہ حلیم د اورنگ زیب، اور ہر امیر و وزیر عبدالرحیم خان خاناں اور آصف خاں نہیں تھا، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسان کی عظمت و کمال کا معیار اس زمانہ میں عام طور پر بہت بلند تھا، اس کی بڑائی اور کامیابی کے لیے بہت سی ایسی صفات اور کمالات ضروری سمجھے جاتے تھے، جو بعد کے زمانہ میں خصوصاً مغرب کے مادی اقتدار کے دور میں عظمت کی شرائط سے خارج ہو گئے ہیں وہ معیار لوگوں کی نظر کے سامنے ہر وقت رہا کرتا تھا، عوام بھی اس کی توقع کرتے تھے اور اہل ہمت بھی اپنے تئیں ان کا ایسا پابند سمجھتے تھے کہ ہمیشہ ان کی جدوجہد میں رہا کرتے تھے اور کبھی اس بارہ میں اپنے کو معاف نہیں کرتے تھے، دنیاوی عظمت و ترقی کا بلند سے بلند زینہ ان میں دین کی طرف سے دوں ہمتی نہیں پیدا کرتا تھا، دنیاوی مشاغل کا ہجوم اور شدتِ انہماک، حکومت ریاست و وزارت کی ذمہ داریاں، مذہبی فرائض بلکہ سنن و نوافل کی طرف سے بھی ادنیٰ غفلت پیدا نہیں ہونے دیتی تھیں، عیش و عشرت کے وسائل اور دولت، تن آسانی اور راحت طلبی پیدا نہیں ہونے دیتی تھی، دوسری چیزوں اور شعبوں کے انحطاط کے ساتھ اس عالی ہمتی اور جامعیت میں بھی تنزل ظاہر ہوا، اور وہ نمونے جو ہر زمانہ میں بہ کثرت نظر آتے تھے خال خال نظر آنے لگے، لیکن پھر بھی وہ معیار باقی تھا اور دماغوں اور دلوں پر اس کی حکومت تھی، اپنے اپنے دور کے عالی ہمت اور صاحب عزم افراد اس معیار پر پورا

اترنے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور اس کے لیے اپنی راحت ولذت ، اور خواہشات قربان کرتے تھے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے کچھ پہلے اور اس کے بعد ہندوستان کے اہل وجاہت واہل علم پر نظر ڈالیے ، آپ مفتی صدر الدین خاں ، نواب قطب الدین خاں ، نواب وزیر الدولہ مرحوم والئی ٹونک ، نواب کلب علی خاں والئی رام پور ، مدار المہام منشی جمال الدین خاں وزیر ریاست بھوپال نواب سید صدیق حسن خاں ایسے جامع اوصاف بزرگ ملیں گے جن میں ریاست و امارت اور علم وفضل کے ساتھ زاہدوں کا زہد ، عابدوں کی سرگرمی ، طالب علموں کا انہماک وشوق مطالعہ ، اور سپاہیوں کی چستی جمع تھی۔ اور یہ اس کا نتیجہ تھا کہ زندگی کا نمونہ اور معیار (آئیڈیل) بلند تھا اور ہر زمانہ میں دل ودماغ پر آئیڈیل ہی کی حکومت ہوتی ہے۔

مغرب کے مادی ومعاشی دور اقتدار و تہذیب میں انسانی زندگی کا قابل تقلید نمونہ اور مثالی تصور پست ہو گیا ، صرف اچھا کھانا ، اچھا پہننا ، سوسائٹی میں معزز وممتاز بننا ، اور ہم چشموں میں جاہ واعزاز حاصل کرنا آئیڈیل بن گیا ، پیغمبروں کی سیرت نظروں سے اوجھل ہو گئی ، دین ودنیا کی جامع اور ذہنی ، علمی روحانی وانتظامی کمالات اور کسب حلال کی صنعت سے متصف ہستیوں کا ذہنی اثر وتسلط ہٹ گیا اور وہ شخصیتیں ذہن پر چھا گئیں ، اور نمونہ ومثال اور زندگی کی کامیابیوں کا منتہیٰ بن کر آنکھوں اور تصور کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئیں جو اخلاقی و ذہنی حیثیت سے سخت ناقص ، اعمال وکردار کے لحاظ سے بے حد پست ، علمی کمالات اور حقیقی صفات سے محروم ، اخلاقی سطح کے لحاظ سے مبتذل

اور عامی، گھٹیا درجہ کے انسان یا معاشی جانور اور روپیہ پیدا کرنے کی بے شعور و بے درد مشینیں ہیں، تن آسانی اور راحت پسندی اتنی غالب آگئی اور تفریحی مشاغل نے زندگی کی اتنی بڑی جگہ گھیر لی کہ عبادت، دینی فرائض کی ادائیگی اور روحانی ضروریات کی طرف توجہ کرنے کے لیے گنجائش نہیں رہی، اس وقت ترقی یافتہ اور مہذب طبقہ کے نظام اوقات پر نظر ڈالیے گا تو قدیم اسلامی تہذیب کے ان نمائندوں کے نظام اوقات میں اور بیسویں صدی عیسوی کے اس نظام اوقات میں اتنا بڑا فرق نظر آئے گا کہ ایک قوم اور ملک کے افراد نہیں معلوم ہوں گے اور درمیان میں برسوں نہیں بلکہ صدیوں کی مسافت اور سمندروں اور ملکوں کا فاصلہ معلوم ہوگا۔

باب ہفتم

عالمِ اسلام زندگی کے میدان میں

گذشتہ اسلامی قیادت کے اثرات گذشتہ صفحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ چھٹی صدی مسیحی میں جب دنیا تیزی کے ساتھ ہلاکت کے غار کی طرف جارہی تھی اور روئے زمین پر کوئی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے دنیا کو ایک ایسی جماعت کی قیادت عطا فرمائی جو آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت و قانون رکھتی تھی جس کا ہر قدم خدا کی بخشی ہوئی روشنی میں اٹھتا تھا اور اجالے میں پڑتا تھا جو دنیا میں حق و انصاف کی علمبردار تھی جو حکومت و قیادت کے منصب سے نبوت کی مستحکم اخلاقی تربیت اور دین کی مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئی تھی جو کسی قوم کی خدمت گزار اور کسی نسل و وطن کی نمائندہ نہ تھی جس

کو انسانیت کا معتدل ترین مزاج اور متوازن ترین طبیعت عطا ہوئی تھی۔

اس جماعت کے وجود نے نوعِ انسانی کی مجموعی ہلاکت کے راستہ میں فوری روک کا کام دیا اور بتدریج انسانیت کو صدیوں تک کے لیے ان تمام فتنوں اور خطرات سے محفوظ کر دیا جو عالم پر محیط تھے، اس نے صحیح منزل کی طرف انسانوں کو ساتھ لے کر بڑھنا شروع کیا، اس کے اقتدار میں انسانیت کو متوازن ترقی ہوئی اور انسان کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں نے ہم آہنگی اور تناسب کے ساتھ نشو ونما اور ترقی حاصل کی اور ایک ایسا ماحول قائم ہوا جس میں انسان کے لیے بسہولت اپنے کمالِ انسانی تک پہونچنا ممکن ہوا۔

اس جماعت کے اثر و نفوذ سے زندگی کا دھارا اور دنیا کی سمت بدل گئی، ایک وسیع پیمانہ کی خودکشی، اور عالمگیر خدا فراموشی و خود فراموشی سے ہمہ گیر خدا پرستی اور اور خودشناسی کی طرف رُخ ہو گیا، انسانوں کا مزاج، ذہن اور قلب بدل گیا غلط اخلاقی قدریں اور جھوٹے پیمانے تبدیل ہو گئے، اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دینے لگے، زندگی اور نظامِ حکومت کے لیے خالص دینی و اخلاقی تعلیمات نے میزان کا درجہ حاصل کر لیا، اس کے دورِ تمدن میں تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق و فضیلت کو بھی عروج ہوا اور فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت نے بھی یکساں فروغ پایا، دینی رشتہ، مقاصد کے اتحاد اور صلح و محبت نے دُنیا کو جنّت کا نمونہ بنا دیا جس میں نہ باہم نفسانفسی تھی نہ رسہ کشی، خدا پرستی و پاکیزگی کی راہ جو جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں کانٹوں سے بھری اور مصیبت سے سنسان پڑی تھی، بے خطر شاہراہ بن گئی جس پر بے روک ٹوک

قافلے جاتے تھے۔ خدا کی اطاعت جو پہلے مشکل تھی اب آسان، اور نافرمانی جو پہلے آسان تھی اب مشکل ہوگئی، دین کی دعوت میں مقناطیس کی کشش اور اخلاقی تربیت و اصلاح میں جرثقیل کی طاقت پیدا ہوگئی جس نے لاکھوں نفوس کو بہیمیت کی زندگی اور اخلاق کی پستی سے اٹھا کر روحانی اور اخلاقی ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہونچا دیا، انسانی جوہر و کمالات علم و ذہانت اور طبیعت کی جولانی نے جو عرصہ سے ضائع یا بے محل صرف ہو رہی تھی صحیح رُخ اختیار کرکے دنیا کو حقیقی ترقی دی، غرض انسانیت کا قافلہ منزل مقصود سے قریب تر ہوا اور اس کا اگلا حصہ منزل پر پہونچ گیا۔

مغربی قیادت اور اس کے اثرات

لیکن قبل اس کے کہ پچھلے مسافر منزل پر پہونچیں، دفعتہً قافلہ ٹھہرا معلوم ہوا کہ قیادت تبدیل ہوگئی، کارواں سالار کو اس لیے قیادت سے سبک دوش ہونا پڑا کہ اس نے قافلہ کی حفاظت کا پورا سامان نہیں کیا تھا[1]، ایک اجنبی مسافر[2] نے جس کو قافلہ میں کوئی نہیں پہچانتا تھا، تلوار کے زور اور قوت کی دلیل سے زمام قیادت لے لی ہے۔

اس بے بس انسانی قافلہ کو نیا قافلہ سالار ایک ایسے راستہ کی طرف لے چلا جس میں سخت نشیب و فراز اور پیچ و خم ہیں، جس پر دن کی روشنی میں[3] رات

---

[1] مسلمانوں کی مادی کمزوری اور اسباب قوت سے غفلت و کوتاہی کی طرف اشارہ ہے جس کی تکوینی طور پر اس عالم اسباب میں یہ سزا تھی کہ ان کو دنیا کی قیادت سے دست کش ہو جانا پڑا۔
[2] مغربی اقوام [3] بجلی کی روشنی میں

کا اندھیرا ہے، قافلہ کے رہرو بار بار ٹھوکر کھاتے، منھ کے بل گرتے اور فریاد کرتے ہیں لیکن قافلہ سالار قوت کے نشہ اور جلد پہونچنے کی عجلت میں قافلہ کو سرپٹ لیے جارہا ہے۔

یہ تمثیل نہیں واقعہ ہے، دنیا کی زمام قیادت مسلمانوں کے بعد مغرب کی ان قوموں نے اپنے ہاتھ میں لی، جن کے پاس ابتدا سے حکمت الٰہی کا کوئی سرمایہ اور علم صحیح کا کوئی صاف سرچشمہ نہ تھا، نبوت کی روشنی وہاں دراصل پہونچنے ہی نہیں پائی، حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کی ایک شعاع جو وہاں پہونچی بھی وہ تحریف وتاویل کے اندھیروں میں گم ہوگئی، انھوں نے اس آسمانی روشنی کی خانہ پری یونان وروما کے دفتروں کی سیاہی سے کی، جاہلی یونان وروما کا پورا جاہلی ترکہ ان کے میراث میں آیا، اور نسلی طور پر ان کے تمام فطری، ذہنی، اخلاقی اور مزاجی خصائص ان میں منتقل ہوئے، محسوسات پرستی، روحانیت سے بُعد، تمتع ولطف اندوزی ولذت کا غلو، غیر محدود شخصی آزادی کا شوق یونان سے، اور ضعف ایمان، جارحانہ قوم پرستی، طاقت کی تقدیس، اور استعمار (شہنشاہیت) کی روح روم سے منتقل ہوئی، مسیحی تعلیمات کے بچے کھچے سرمایہ کو (جو شاید اصل سے ایک اور دس کی بھی نسبت نہیں رکھتا تھا) رومی بت پرستی اور سینٹ پال اور قسطنطین کی منافقت نے ڈبویا اور اگر کچھ باقی رہا تو علماء مذہب کی تحریف وتاویل نے کھویا، رہبانیت کے جنون نے مادہ پرستی کے ردّعمل کو پیدا کیا، ارباب کلیسا کی عیش پرستی اور دنیا داری نے اہل مذہب کی طرف سے بے اعتمادی اور نفرت پیدا کی، حکومت وکلیسا کی کشاکش نے قومی مزاج میں برہمی اور عدم توازن پیدا کیا اور دین وسیاست میں تفریق

کی، مذہب و عقلیت کی خونی کش مکش اور اہلِ دین کے جمود و نافہمی اور ارباب کلیسا کے لرزہ خیز مظالم نے برائے نام مذہب کے خلاف نسلی اور موروثی عداوت کا بیج بویا، خام کار روشن خیالوں کی عجلت پسندی اور تعصب نے مذہب کا آخری تسمہ بھی کاٹ دیا، اور مذہب کے سہے سہے فوائد سے بھی محروم کر دیا، آخر کار ساری مغربی قوموں پر مادہ پرستی کا دور آیا اور سارے مغرب پر خدا فراموشی اور اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر خود فراموشی کا عالم چھا گیا، زر پرستی مذہب بن گیا، مادیت کے استغراق نے خالص اقتصادی وحدۃ الوجود کا فلسفہ پیدا کر دیا جس کا نعرہ ہے لا الٰہ الا الخبز اور لا موجود الا البطن۔

دوسری طرف زندگی کا صحیح مقصد و مشغلہ اور عالم گیر پیام نہ ہونے کی وجہ سے جارحانہ قوم پرستی اور وطن پرستی زندگی کا مقصد اور قومی مشغلہ بن گیا، قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے دوسری قوموں سے نفرت و خوف کے جذبات ظہور پذیر ہوئے، اور ایک طرف سارے مشرق کو مغرب کے مقابلہ میں حریف کیمپ سمجھ لیا گیا، دوسری طرف اندرونی قومیت کی حد بندیوں نے سارے مغرب کو چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں تبدیل کر دیا اور ہمسایہ اور ہمسایہ کے درمیان ایک خط کھینچ دیئے جن کے باہر انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا، استعمار یا امپیریلزم نے ساری دنیا کو بردہ فروشی کی ایک منڈی (جہاں قوموں کا سودا ہوتا ہے) اور سلطنتوں کی رقابتوں نے دنیا کو لوہار کی بھٹی بنا دیا جہاں ہر وقت آگ کا کھیل ہے اور لوہے کو تپا کر اور پیٹ کر اپنے کام کے ہتھیار بنائے جاتے ہیں۔

اخلاقی و دینی تعلیمات سے محرومی اور صدیوں کی بے تربیتی کے ساتھ علم و صنعت

تحقیق و اکتشافات کی ترقی سے قوت و اخلاق میں کوئی توازن باقی نہیں رہا، انسانوں نے پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا اور مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنا سیکھ لیا لیکن آدمیوں کی طرح زمین پر چلنا بھول گئے، بے قید اور بے شعور عقل و علم نے ہر رہزن اور قفل شکن کو قفل شکنی کا آلہ اور ہر بدمست کو تلوار مہیا کی، سائنس نے بیسویں صدی کے شریر اور ناداں بچوں کو کھیلنے کے لیے دھاردار اور خطرناک اوزار تقسیم کیے جن سے وہ اپنے کو بھی زخمی کر رہے ہیں اور اپنے بھائیوں کو بھی، بالآخر اندھے بہرے سائنس نے "ذراتی اور ہیڈروجن بم" کی شکل میں انسان کے ہاتھ میں خودکشی کا ہتھیار دے دیا۔

ان لادینی قوموں کے عہد اقتدار میں انسان اس مذہبی حاسہ سے محروم ہونے لگا جو دوسرے انسانی حواس کے ساتھ شرق کی ہزاروں سال کی زندگی میں لازمۂ زندگی رہا ہے، خدا طلبی کے عمومی ذوق کی جگہ دنیا طلبی کے بحران نے لے لی، اخلاق و معنویات اور حقیقی انسانی صفات و کمالات میں سخت انحطاط اور تنزل ہوا، غرض لوہے اور دھات کو ہر طرح ترقی ہوئی اور "آدمیت" کو ہر طرح زوال ہوا۔

عالمگیر جاہلیت

اس وقت کوئی ایسی طاقت و قوم یا جماعت جو ان مغربی قوموں سے عقائد و نظریات کا اختلاف رکھتی ہو، اور ان کے جاہلی فلسفہ اور مادی نظام زندگی کی مخالف ہو منظر عام پر نہیں ہے، ایسی قوم یا جماعت اس وقت نہ یورپ میں پائی جاتی ہے نہ افریقہ اور ایشیا میں، یورپ کے جرمن ہوں یا ایشیا کے جاپانی یا ہندوستان کے باشندے سب اس جاہلی

فلسفہ اور اس مادہ پرستانہ نظام حیات کے قائل و معتقد ہیں یا ہوتے جاتے ہیں، باقی وہ سیاسی اختلاف اور قوموں کی سیاسی کش مکش جو اس وقت مختلف فلسفوں یا جنگوں کی صورت میں نظر آرہی ہے وہ محض اس بات کی کش مکش ہے کہ اس مادہ پرستی کی منزل مقصود کی طرف لے جانے کا منصب قیادت کس کے ہاتھ میں رہے؟ ایک قوم کی غیرت قومی اس کی روادار نہیں کہ دوسری قوم ایک مدت دراز سے دنیا کی قیادت پر فائز، زندگی کے مسائل و فوائد سے منتفع اور دنیا کے بازاروں، منڈیوں اور نوآبادیوں پر قابض رہے، حالاں کہ وہ قوت، علم، نظام، اور صلاحیت میں اس سے کسی طرح پیچھے اور کمتر نہیں، رہا یہ کہ وہ خود کسی اور منزل کی طرف بڑھنا اور دوسری قوموں کو لے جانا چاہتی ہے زمین میں امن و انصاف قائم کرنا چاہتی ہے اور دنیا کا رخ بے دینی اور مادیت سے دین و روحانیت کی طرف بداخلاقی سے اخلاق کی طرف، اور نفس و شیطان پرستی سے خدا پرستی کی طرف پھیرنا چاہتی ہے تو اس غریب کو نہ اس کا دعویٰ ہے نہ یہ کبھی اس کا ارادہ ہے!

اشتراکی روس اور سرمایہ دار مغربی ممالک کا فرق

رہا اشتراکی روس جس کا نظام بظاہر موجودہ مغربی قوموں سے جدا معلوم ہوتا ہے تو وہ محض جاہلی مغربی تہذیب کا ایسا پھل ہے جو پک گیا ہے، اس میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس نے منافقت اور فریب کا نقاب اپنے چہرے سے ہٹا دیا ہے اور جس فلسفہ اور اخلاق و اجتماعی نظریات کو مغربی قوموں کے

مفکر، مصنف، فلسفی اور ادیب اور سیاسی، صدیوں سے لکھ رہے ہیں اور وہ قومیں ان کو دل سے مان رہی ہیں، اس فلسفہ اور ان اصول و نظریات کو روس نے ایک مرتبہ جرأت کرکے اپنے ملک میں نافذ کر دیا ہے اور عملاً اس کو کرکے دکھایا ہے اشتراکی رہنما اس رفتار پر قانع نہ تھے جس رفتار سے یورپ کی قومیں الحاد، لامذہبیت، اباحت (ہر قسم کی آزادی) اور بہیمانہ مادیت کی طرف بڑھ رہی تھیں انھوں نے تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف قدم اٹھائے اور اس منزل پر پہونچ کر اب وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اقوام عالم کو اس منزل پر لے آئیں جس پر وہ پہونچ چکے ہیں۔

ایشائی اور مشرقی قومیں ایشائی اور مشرقی قومیں اور سلطنتیں مختلف رفتار کے ساتھ تہذیب و سیاست کی اس منزل کی طرف گامزن ہیں جس پر وہ مغربی قوموں کو دور سے دیکھ رہی ہیں، تہذیب و اخلاق و اجتماع کے وہی اصول و نظریات اور زندگی اور کائنات کے متعلق وہی نقطۂ نظر اختیار کرتی جا رہی ہیں جو ان مغربی قوموں کا شعار بن چکا ہے ان کے افراد کی بیشتر مغربی اقوام کے افراد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ان کو مغربی اقوام غالب سے صرف اتنا اختلاف ہے کہ وہ سیاسی بیداری اور قوم پرستی کی بنا پر غیر ملکی حکومتوں کی سیادت اور تابعیت پر اب راضی نہیں اور اس کو گوارا نہیں کرتیں کہ مغربی قوموں کی بڑی بڑی سلطنتیں اور شہنشاہیاں قائم رہیں، ان غالب قوموں کے افراد اپنی سلطنتوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مادی فوائد اور ثمرات سے متمتع ہوں اور شوکت و عظمت اور عیش و عشرت کی زندگی گذاریں، ان مظلوم شرقی قوموں کو خود

اپنی سرزمین میں یہ فوائد حاصل نہ ہوں ان کو درحقیقت ان مغربی قوموں کے فلسفۂ زندگی اور نظام سیاسی سے بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں، پورے پورے قوم پرست لٹریچر میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں ملے گا، ان مشرقی اور ایشیائی قوموں کو صرف اس سے اختلاف ہے کہ یہ نظام سیاسی ان کے ملک میں غیر ملکی چلائیں، وہ بے کم و کاست یا تفصیلات و اجزاء میں کچھ تغیر و ترمیم کے ساتھ یہی نظام اپنے ملک میں خود چلانا چاہتے ہیں، گویا شطرنج کی بساط نہیں الٹنا چاہتے بلکہ صرف کھیلنے والے بدلنا چاہتے ہیں پھر ان میں سے بہت سی قوموں کی خود اپنی قدیم جاہلیت ہے جس کے ساتھ ان میں سے بہت سی قوموں نے جاہلیت فرنگ بھی اختیار کر لی ہے اور اب جب بھی ان کو اقتدار حاصل ہوگا وہ ان دونوں جاہلیتوں کے بہترین عناصر و اجزاء بروئے کار لائیں گے۔

مسلمان جاہلیت کا حلیف

طرفہ تماشا یہ ہے کہ جاہلیت کا قدیم و ازلی حریف (مسلمان) بھی اس زمانہ میں دنیا کے بہت سے گوشوں میں جاہلیت کا حلیف بن گیا ہے اس کو اس نے اپنی دوستی اور وفاداری کا اطمینان دلایا ہے اور دنیا کے بعض حصوں میں اس نے ان مغربی جاہلی قوموں کے لیے رضاکارانہ خدمات انجام دی ہیں، جاہلیت کی اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہوسکتی ہے کہ بعض مسلمان قومیں اور سلطنتیں اور بعض مسلمان جماعتیں ان قوموں اور سلطنتوں کو اپنا حامی و سرپرست اور حق و انصاف کا علمبردار سمجھنے لگی ہیں جو اس زمانہ میں جاہلی تحریک کی علمبردار ہیں اور جنھوں نے جاہلیت کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی ہے، عام مسلمان دنیا کی قیادت کا خیال ہی چھوڑ چکے ہیں

اور اسلامی حمیّت کے قائد ہونے کے بجائے جاہلیت کے گرد کاروان بننے پر قانع ہیں اور اس پر بڑا فرق محسوس کرتے ہیں۔

افراد میں بھا اہل مغربی اخلاق اس طرح سرایت کرتے جا رہے ہیں جس طرح درختوں کے رگ و ریشہ میں پانی اور تاروں میں بجلی دوڑ جاتی ہے، اسلامی ممالک میں مغربی مادیت اپنی پوری شان کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے، خواہشات نفس کی اندھا دھند پیروی زندگی کی نہ بجھنے والی پیاس اور نہ مٹنے والی بھوک اس قوم میں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے جس کے نزدیک آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے، مغربی علوم اور تہذیب کے اثر سے آخرت کا خیال روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے اور حیات دنیا کی اہمیت اور کشش بڑھتی جا رہی ہے، اعزاز و فخر و جاہ کے حصول میں اور سربلندی اور سرفرازی کی کوشش میں بلند حوصلہ اور ترقی پسند مسلمان یورپ کے ترقی یافتہ لوگوں کے نقش قدم پر ہے، اصول و اخلاق پر فوائد اور مصلحتوں کو ترجیح دینے کا مرض پھیل گیا ہے، مادی قوموں کی تقلید میں ظاہری نمائش اور کھوکھلے مظاہر کی گرویدگی بڑھ گئی ہے، انسانوں کی بندگی، قوت اور دولت کے سامنے سرافگندگی اور "شاہ پرستی" میں کہیں کہیں یہ موحد اور مجاہد امت مشرک اور غلام طینت قوموں سے زیادہ ممتاز نظر نہیں آتی۔

امید کی شعاع

یہ سب کچھ ہے مگر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہمیں امید کی شعاع نظر آتی ہے، دوسری قومیں آسمانی ہدایت اور پیغمبروں کی تعلیم و حکمت کے سرمایہ کو یکسر کھو چکی ہیں اور صدیوں پہلے ان کے سفینوں اور ان کے سینوں میں یہ روشنی گل ہو چکی ہے، ماضی و حال کو مربوط رکھنے والے

رشتہ کے ایک تار کو زمانہ کا ہاتھ کاٹ چکا ہے، ان قوموں کی مذہبی اصلاح کی تاریخ بتلاتی ہے کہ ان میں دینی تجدید و احیاء کی دعوت کوئی وسیع انقلاب برپا نہیں کر سکتی اور کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی، گوسالہ کے اس تن مردہ میں کوئی سامری، مذہبی اور اخلاقی زندگی کی نئی روح نہیں پھونک سکا، مادہ پرستی، دولت و قوت پرستی پورے طور پر ان پر حاوی ہو چکی ہے، جاہلیت کے قطع کیے ہوئے لباس یکے بعد دیگرے ان کے جسم پر چست ہو سکتے ہیں، مگر دین کا لباس اب ان کے قامت پر راست نہیں آتا، جاہلیت کے بالکل مخالف اور متوازی نظام دین و اخلاق، و معاشرت و اجتماع و سیاست کو ان کا صدیوں کا بنا ہوا ذہنی سانچہ اب قبول نہیں کرتا۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کا دینی سرمایہ اور آسمانی ہدایت و حکمت کا سرچشمہ محفوظ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہ کرام کی زندگی جس میں پوری امت کی تخلیق کی قوت ہے ان کے پاس موجود ہے، پھر اصحاب تجدید کا ایک غیر منقطع سلسلہ اور اصلاح و انقلاب کی دینی دعوت کا ایسا تسلسل ہے جس نے اس امت کو کسی دور میں بھی جاہلیت میں گم ہو جانے کا موقع نہیں دیا، جاہلیت کا خالص مادی نظام اس امت کا ذہن (جب تک کہ اس کا سانچہ توڑ کر از سر نو نہ بنایا جائے) پورے طور پر ہضم نہیں کر سکتا اور مسلمان جاہلیت کی مشینری میں اس طرح فٹ نہیں ہو سکتا جس طرح ایک ڈھلا ڈھلایا پرزہ فٹ ہو جاتا ہے۔

دین الٰہی کا علمبردار اور دنیا کا محتسب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر میں فرمایا تھا۔

اللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ — اے اللہ اگر تو اس جماعت کو ہلاک
هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدْ — کر دیگا تو پھر تیری عبادت نہ کی جائے گی

مسلمانوں کے سارے نقائص کے باوجود یہ حقیقت اب بھی اسی طرح باقی ہے، جاہلیت دنیا کے لیے جو نقشہ رکھتی ہے اور جس نقشہ پر وہ آج دنیا کو چلا رہی ہے، اس کے خلاف اگر کوئی نقشہ ہے تو صرف مسلمانوں کے پاس ہے اگرچہ مسلمان خود اس کو بھولے ہوئے ہیں، لیکن یہ نقشہ ابھی ضائع نہیں ہوا اور نہ کبھی ضائع ہو سکتا ہے، مسلمان اپنے دین کے رو سے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے وہ مشرق اور مغرب کی قوموں کے لیے روز حساب ہوگا، انھیں کے خاکستر میں وہ چنگاری دبی ہوئی ہے جو کبھی نہ کبھی دن بھڑک کر جاہلیت کے خرمن کو جلا کر خاک کر دے گی۔

علامہ اقبال مرحوم نے اس حقیقت کو نظام جاہلی کے علمبردار و صدر نشین ابلیس کی زبان سے ادا کر دیا ہے "۱۹۳۶ء کی مجلس شوریٰ" میں شیاطین عالم نے جمع ہو کر ان خطرات کو پیش کیا جو ابلیسی نظام کے لیے سخت تشویش اور پریشانی کا باعث ہیں اور جن کی طرف جلد متوجہ ہونے کی ضرورت ہے، ایک مشیر نے جمہوریت کا نام لیا اور اس کو "جہاں نو کا تازہ فتنہ" بتلایا، دوسرے نے اشتراکیت سے سخت خطرہ ظاہر کیا اور ابلیس کو مخاطب کر کے کہا۔

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے — جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

صدر مجلس (ابلیس) نے اپنے مشیروں کو ان فتنوں سے اطمینان دلایا اور اپنی

گہری اور ہمدردانہ واقفیت کی بنا پر ان کی اصل حقیقت بیان کی جو ان کی ظاہر بین نگاہ سے پوشیدہ رہ گئی تھی اور ان فتنوں کا توڑ بتایا جس کا اس نے پہلے سے انتظام کر لیا تھا۔

آخر میں اس نے اپنے نقطہ نظر سے اصل خطرہ کا ذکر کیا جس کے لیے اگرچہ اُس نے انتظامات سوچ لیے ہیں مگر مستقبل کی خطرناکی سے اس کے جسم پر لرزہ طاری اور راتوں کی نیند حرام ہے، وہ کہتا ہے:۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہو اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
"مزدکیت[1]" فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے
جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

[1] اشتراکیت

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن مرد آزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

وہ اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے۔

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

عالم اسلامی کا پیغام

عالم اسلام کے پاس اب بھی دنیا کے لیے نیا پیغام اور زندگی کی نئی دعوت ہے یہ وہی پیغام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس کے حوالہ کیا تھا یہ ایک بڑا طاقتور واضح اور روشن پیغام ہے جس سے زیادہ منصفانہ بلند و برتر اور مبارک پیغام اس پورے عرصہ میں دنیا نے کسی کی زبان سے نہیں سنا۔

یہ بعینہ وہی پیغام ہے جس کو سن کر مسلمان مدینہ طیبہ سے نکلے اور تمام دنیا میں پھیل گئے اور جس کو ایک مسلمان سفیر نے شاہ ایران کے اس سوال پر کہ تم ہمارے ملک کیسے آئے مختصر لفظوں میں اس طرح بیان کیا تھا "اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے تاکہ ہم اس کی مشیت سے لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اس وحدہ لاشریک کی بندگی میں، دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت میں، اور مذاہب کے ظلم و ناانصافی سے اسلام کے عدل و انصاف میں داخل کریں" اس پیغام میں آج بھی ایک حرف کی کمی بیشی کی ضرورت نہیں، آج کی بیسویں صدی کی دنیا کے لیے بھی وہ ایسا ہی نیا اور تازہ اور مناسب حال ہے جیسا چھٹی صدی کی دنیا کے لیے تھا۔

آج بھی لوگ تراشیدہ اور ناتراشیدہ بتوں کے سامنے سربسجود ہیں آج

بھی اللہ واحد کی بندگی اجنبی و نامانوس ہورہی ہے، آج بھی غیر اللہ کی عبادت و طاقت کا بازار گرم ہے، آج بھی خواہشات نفس کا بت برسرِ راہ ہے رہا ہے آج بھی احبار و رہبان، عالم و درویش، ملوک و سلاطین صاحب طاقت اور اہل دولت، زعماء و قائدین سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر ارباب من دون اللہ بنے ہوئے ہیں، جن کے لیے ویسے ہی قربانیاں پیش کی جارہی ہیں اور ان کے آستانوں پر اسی طرح سے ناصیہ فرسائی ہورہی ہے جیسے معبودان باطل کے سامنے ہوتی تھی۔

آج عالمِ انسانیت اپنی وسعت، وسائل سفر کی فراوانی، نقل و حرکت کی آسانی، اور اقوام و ممالک کے قرب و اتصال کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تنگ ہے، اس وقت کا مادہ پرست انسان اس دنیا میں کسی دوسرے کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا، اور اپنے فوائد اور خواہشات نفس اور خود برتری کے سوا اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں، خود غرضی نے اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کسی لمبے چوڑے ملک میں دو آدمی بھی زندہ رہ سکیں، تنگ نظر وطن پرستی ہر ایسے انسان کو جو اس کے وطن کے باہر پیدا ہو جانے کا قصور وار ہے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اس کے ہر کمال کی منکر ہے اور اس کو ہر حق سے محروم کرتی ہے۔

پھر اس زندگی کی رہی سہی وسعت کو ان اہل سیاست و حکومت نے اور تنگ کر دیا ہے جو زندگی، وسائل معیشت اور خوراک کے سرچشموں اور ذخیروں پر قابض ہیں وہ جس کے لیے چاہتے ہیں اس زندگی کو تنگ کر دیتے ہیں اور

جسم کے لیے چاہتے ہیں وسیع کر دیتے ہیں بڑے بڑے وسیع شہر اور شاداب زرخیز ملک لوگوں کے لیے بے فیض ہو گئے ہیں، قوموں کی قومیں اور پوری پوری آبادیاں نابالغ بچوں اور ناسمجھ یتیموں کی طرح دوسروں کی اتالیقی اور تولیت میں زندگی گزار رہی ہیں، انسان کا انسان پر اعتماد نہیں رہا، ہر ایک دوسرے کو بدگمانی اور شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنا حریف سمجھتا ہے، قرآن مجید کے بلیغ اور معجزانہ الفاظ کے مطابق زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی ہے اور طبیعتیں اندر ہی اندر گھٹنے لگی ہیں، تمدن اور حکومت کی نئی نئی بیڑیاں اور غلامی کے طوق لوگوں پر پڑتے جا رہے ہیں، ہر وقت ٹیکسوں اور نئے نئے محاصل کی بھرمار سے مصنوعی قحطوں کا خطرہ ہے، بیرونی اور اندرونی جنگیں سروں پر منڈلا رہی ہیں، فسادات، اسٹرائکیں اور ہڑتال زندگی کا لازمہ بن گئے ہیں۔

بے شک آج بھی مذاہب کی ناانصافی سے اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لانے کی ضرورت ہے، اس روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی ایسے مذاہب پائے جاتے ہیں جن کے عقائد وتعلیمات مضحکہ خیز ہیں جو اپنے پیرودں کو بے عقل اور بے شعور جانوروں کی طرح قابو میں رکھتے ہیں اور ان کو اپنے عقل وتفکر سے کام لینے کی اجازت نہیں دیتے پھر کچھ مذاہب ونظام ایسے ہیں جو مذہب کہلانے کے روادار تو نہیں لیکن اپنے تسلط واقتدار میں، اپنی حیرت وطاقت وحکومت میں، اور اپنے پیرودں کی اندھی تقلید اور جوش عقیدت میں قدیم مذاہب سے کسی طرح کم نہیں ہیں، یہ وہ سیاسی نظام اور

اقتصادی نظریات ہیں جن پر آج لوگ اسی طرح سے ایمان لارہے ہیں جیسے پہلے مذاہب وادیان پر ایمان لاتے تھے، یہ اس عصر کی قوم پرستی، وطن پرستی، جمہوریت اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ ہے، یہ نئے مذاہب اپنی ناروا داری تنگ نظری اور بے رحمی میں قدیم جاہلی ادیان و مذاہب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں، کسی سیاسی عقیدہ یا معاشی نظریہ سے اختلاف کی سزا آج اس سے کہیں زیادہ سخت ہے جتنی زمانہ سابق میں کسی مذہب یا عقیدہ سے اختلاف کی تھی، آج جب کسی پارٹی یا اصول کا اقتدار قائم ہوتا ہے تو مخالف جماعت کو زندگی کا حق بھی نہیں دیا جاتا اور اس کو اپنے اختلاف کی سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے اس زمانہ کی دو بڑی جنگیں کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر یا کسی مذہبی گروہ کی تحریک سے نہیں ہوئیں بلکہ محض سیاسی اغراض کے تصادم اور قومی خود غرضیوں کی بنا پر ہوئیں، اسپین، چین کی خانہ جنگیاں (civil wars) جن کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کی عیسوی دنیا کی مذہبی خانہ جنگی اور قرون وسطیٰ کی کلیسا اور علم و فن کی کش مکش بھی گرد ہے کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر نہ تھیں بلکہ محض ایک سیاسی اصول کے اختلاف اور اقتدار پسند گروہوں کی کش مکش تھی۔

آج بھی عالم اسلامی کا پیغام خدائے واحد کی عبادت اور اطاعت مطلق اللہ کے پیغمبروں کی رسالت، بالخصوص آخری اور سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ (صلعم) کی رسالت اور آخرت کے عقیدہ پر ایمان لانے کی دعوت ہے، اس دعوت کو قبول کرنے کا انعام اور صلہ یہ ہوگا کہ یہ عالم تو بر تو تاریکیوں سے نکل کر جن میں وہ صدیوں سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے روشنی کی طرف آجائے گا، اپنے

جیسے انسانوں کی بندگی سے وہ نجات پاکر خدائے واحد کی بندگی کی نعمت پائے گا، زندگی کے اس جیل خانہ سے نجات پاکر جس میں وہ صدیوں سے محبوس ہے زندگی کے کھلے میدان اور دنیا کی آزاد فضا میں قدم رکھے گا، اعتقادی اور سیاسی مذاہب کی جکڑبندیوں سے رہائی پاکر وہ دینِ فطرت اور شریعتِ الٰہی کے سایۂ عدل میں جگہ پائے گا

اس پیغام کی ضرورت و اہمیت کی اس بلندی و برتری جیسی اس زمانہ میں واضح ہوئی ہے اور جیسا آج اس کا سمجھنا آسان ہوگیا ہے دنیا کبھی نہیں ہوا تھا، آج جاہلیت سر بازار رسوا ہو چکی ہے، اس کے چھپے ڈھکے عیب کھل گئے ہیں، لوگ زندگی سے عاجز ہیں اور اس وقت کے ناخداؤں سے مایوس ہیں، دنیا کی قیادت میں اصولی تبدیلی کا یہ خاص وقت ہے۔ اس وقت تک دنیا کی قیادت میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئیں وہ اس سے زائد نہ تھیں کہ جب کشتی کا ملاح کشتی کھیتے کھیتے تھک جاتا ہے تو وہ کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے میں لے لیتا ہے، جب وہ ہاتھ بھی تھک جاتا ہے تو پھر پتوار بدل لیتا ہے، برطانیہ سے امریکہ یا امریکا سے روس کی طرف عالمگیر رہنمائی یا بین الاقوامی اثر و اقتدار کی تبدیلی کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہیں کہ ملاح نے کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے لیا، یہ ناخدا کی تبدیلی یا اصول جہازرانی کی تبدیلی یا سمتِ سفر کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ صرف دائیں بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

انسانیت کی مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ عالمگیر قیادت اور زندگی کی جہازرانی ان مجرم اور انسانیت کے خون سے رنگین ہاتھوں سے نکل کر

جنھوں نے انسانیت کے قافلہ کو غرق کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے ان امانت دار، فرض شناس، خدا ترس، تجربہ کار ہاتھوں کی طرف منتقل ہو جو انسانیت کی جہاز راںی کے لیے موزوں سے بنائے گئے ہیں، نتیجہ خیز اور کارآمد انقلاب صرف یہ ہے کہ دنیا کی رہنمائی، اور انسانیت کی سربراہی جاہلیت کے کیمپ سے جس میں برطانیہ امریکہ، روس اور ان کی حاشیہ بردار مشرقی اور ایشیائی قومیں ہیں اور جس کی زمام قیادت مستشرقین اور اکابر مجرمین کے ہاتھوں میں رہی ہے منتقل ہو کر اس سنگھ ہاتھ میں آجائے جس کی قیادت انسانیت کے معمار اعظم رحمت عالم سید اولاد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور جو اس دنیا کی تعمیر نو اور انسانیت کی نشأت ثانیہ کے لیے محکم اور واضح اصول و تعلیمات رکھتی ہے اور جس کا ایمان دنیا کو اس وقت کی جاہلیت سے اسی طرح نکال سکتا ہے جس طرح اس نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نکالا تھا۔

نیا ایمان

لیکن اس کارِ عظیم کے لیے عالم اسلام کو خود تیاری اور اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی اس کے لیے پہلی تیاری یہ ہے کہ عالم اسلام اسلام پر نیا اور تازہ ایمان لائے عالم اسلام کو نئے دین، نئے پیغمبر، نئی شریعت اور نئی تعلیم کی قطعی ضرورت نہیں، اسلام آفتاب کی طرح نہ کبھی پرانا تھا نہ اب پرانا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت دائمی اور آخری نبوت ہے، آپ کا دین محفوظ اور آپ کی تعلیمات زندہ ہیں لیکن عالم اسلام کو بلاشبہ نئے ایمان کی ضرورت ہے نئے فتنوں، نئی طاقتوں نئی ترغیبوں، نئی دعوتوں کا مقابلہ کمزور ایمان، اور مجرد رسوم و عادات سے نہیں کیا جا سکتا، کوئی بوسیدہ عمارت کسی نئے طوفان اور کسی نئے سیلاب کو برداشت نہیں کر سکتی، پھر داعی کے لیے ضروری ہو کہ اسکو اپنی دعوت پر غیر متزلزل یقین ہو اس میں ایک ایسے انسان کا جوش ہو جو کسی نئے

عقیدہ پر نیا ایمان لایا ہے، ایک ایسے انسان کا سرور اور سرخوشی ہو جس نے کوئی نیا خزانہ پا لیا ہو یا نیا ملک دریافت کیا ہو، عالم اسلام اگر دنیا کے انسانیت میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے اور دنیا کی موجودہ مادہ پرستی اور شک و اضطراب پر فتح حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے اندر نئی ایمانی روح، تازہ یقین اور نیا جوش و خروش پیدا کرنا ہوگا۔

معنوی تیاری

عالم اسلامی کو اس مقدس فریضہ کو ادا کرنے کے لیے معنوی تیاری اور اندرونی تبدیلی کی بھی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے کہ عالم اسلام خدا ناشناس یورپ کا مقابلہ تمدن و تہذیب کے کھوکھلے مظاہر، مغربی زبانوں کی مہارت اور زندگی کے اس رنگ ڈھنگ کے اختیار کر لینے سے نہیں کر سکتا جس کو قوموں کی ترقی میں کوئی دخل نہیں، وہ اپنا پیغام اس روح اور معنوی طاقت کی مدد ہی سے پہونچا سکتا ہے جس میں یورپ روز بروز دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے، عالم اسلام اپنے مدمقابل پر صرف اسی صورت میں غلبہ حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنے حریف سے ایمان میں فائق ہو، زندگی کی محبت اس کے دل سے نکل چکی ہو، خواہشات نفسانی کے بندے سے آزاد ہو چکا ہو، اس کے افراد شہادت کے حریص ہوں جنت کا شوق ان کے دل میں چٹکیاں لیتا ہو، دنیا کا فانی مال و متاع ان کی نگاہ میں وقعت نہ رکھتا ہو اللہ کے راستہ کی تکلیفیں اور مصیبتیں وہ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوں، درحقیقت ایک خدا ناشناس منکر آخرت کے مقابلہ میں مومن کا یہی امتیاز ہے اور اسی بنا پر اس سے یہ توقع کی گئی ہے کہ اس میں برداشت کی طاقت زیادہ ہوگی، قرآن مجید میں ہے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُونَ۔
(النساء ع ۱۵)

اور مخالف قوم کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو، اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہو تو ان کو بھی دکھ پہنچتا ہو جیسے تم کو پہنچتا ہے اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو جن کی وہ امید نہیں رکھتے۔

واقعہ یہ ہے کہ مومن کی طاقت اور اس کے فتح و غلبہ کا راز یہ ہے کہ اس کو آخرت کا یقین اور اللہ کے اجر و ثواب کی امید ہوتی ہے، اگر عالم اسلامی کے سامنے بھی تمام تر وہی دنیاوی مقاصد اور مادی منافع ہیں اور وہ بھی محض محسوسات و مادیات کے طلسم میں گرفتار ہے تو یورپ کو اپنی مادی طاقت صدیوں کی تیاری اور وسیع ساز و سامان کی بنا پر غلبہ اور اقتدار کا زیادہ حق ہے۔

عالم اسلام پر ایک طویل دور ایسا گزرا ہے کہ اس کو اس معنوی طاقت کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ اس کو اس کی حفاظت کی فکر تھی، نہ وہ اس کو غذا پہونچانے کی طرف متوجہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سوتے خشک ہوتے چلے گئے اور تیزی سے اس میں انحطاط واقع ہوا اسی عرصہ میں عالم اسلامی کو مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں ایسے معرکے پیش آئے جن میں اس کو ایمان و یقین، صبر و تحمل اور ثبات و استقامت کی ضرورت بشدت محسوس ہوئی اور جو ان صفات کے بغیر جیتے نہیں جا سکتے تھے، جب اسلامی طاقتوں کو دھکا لگا اور انھوں نے اس

سنوسی طاقت کا سہارا لینا چاہا، جس کی جگہ مسلمانوں کے دل تھے تو ان کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ یہ طاقت عرصہ ہوا گم ہو چکی ہے اور دل کی انگیٹھیاں سرد ہو چکی ہیں، اس وقت عالم اسلامی کو یہ محسوس ہوا کہ اس نے اس روحانی طاقت کی ناقدری کر کے اور اس سے غفلت برت کر اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے اس وقت اس نے اپنے ذخیرہ کا جائزہ لیا تو اس کو کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو اس خلا کو پُر کر سکے اور اس نقصان کی تلافی کر سکے۔

اسی عرصہ میں عالم اسلامی کو ایسے معرکے بھی پیش آئے جن میں اسلام کی عزت وحرمت کا سوال تھا اس کو خیال تھا کہ تمام عالم کے مسلمانوں میں قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ اسلام کی طرف سے مدافعت، مقامات مقدسہ کی حفاظت اور دینی جوش وحمیت میں از خود رفتہ ہو جائیں گے اور تمام اسلامی ممالک میں آگ سی لگ جائے گی، لیکن عالم اسلام پر ان واقعات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، زندگی کے کام بدستور ہوتے رہے، کہیں کہیں سے کچھ آواز بلند ہوئی اور خاموش ہو گئی اور پھر دنیا اپنے کام میں لگ گئی، اس وقت عالم اسلام کے مفکرین اور اہل نظر کو معلوم ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی احساس کمزور پڑ چکا ہے، اور ایمان کا شعلہ اگر پورے طور پر بجھا نہیں تو بہت دب گیا ہے، اس وقت دوسروں کو بھی عالم اسلام کی یہ کمزوری معلوم ہوئی اور اندرونی انحطاط اور اضمحلال کا احساس ہوا، اور اس کا وہ رعب جاتا رہا جو اس کی مجاہدانہ تاریخ پڑھ پڑھ کے دل و دماغ پر پڑتا ہے۔

آج عالم اسلامی کے قائدین ومفکرین اور اس کی جماعتوں اور حکومتوں کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا تخم دوبارہ بونے کی کوشش

کریں، جذبۂ دینی کو پھر متحرک کریں، اور پہلی اسلامی دعوت کے اصول و طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں اور اللہ و رسول اور آخرت کے عقیدہ کی پوری طاقت کے ساتھ دوبارہ تبلیغ و تلقین کریں، اس کے لئے وہ سب طریقے استعمال کریں جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کئے تھے، نیز وہ تمام وسائل اور طریقے کام میں لائیں جو عصر جدید نے پیدا کر دی ہیں۔

قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اب بھی زندگی اور طاقت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے عالم اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے، ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہلی دنیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے اور ان کی تاثیر سے ایک اونگھتی سوتی قوم ایک پرجوش، بے چین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے، ان کے اثر سے (اگر ان کو اثر کرنے کا موقع دیا جائے) پھر ایک بار ایمان اور نفاق، یقین اور شک، وقتی فوائد اور مستحکم عقائد، موقع پرست ذہنیت اور حق پرست ضمیر، عقل مصلحت بیں اور عشق مصلحت سوز کے درمیان پھر معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے، پھر جسمانی راحت اور قلبی سکون، تن آسانی کی زندگی اور شہادت کی موت کے درمیان کش مکش پیدا ہوتی ہے، وہ مبارک کش مکش جو ہر پیغمبر نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی، اور جس کے بغیر حق و باطل کا فیصلہ اور اس دنیا کی اصلاح و انقلاب کا کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس وقت عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ اور مسلمانوں کے ایک ایک گھر اور ایک ایک خاندان میں ایسے اصحاب ایمان نوجوان پیدا ہوں گے جن کی تعریف قرآن مجید میں اس طرح کی گئی ہے۔

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا — وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے

بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ○

(الکہف۔ ۱۴)

سب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے جب کہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی ہی بیجا بات کہی۔

اس وقت پھر دنیا میں ایک بار بلالؓ و عمارؓ، خبابؓ و خبیبؓ، صہیبؓ و مصعب بن عمیرؓ، عثمانؓ بن مظعون اور انسؓ بن النضر کے جوشِ ایمانی اور ایثار و قربانی کے نمونے نگاہوں کے سامنے آئیں گے، جنت کی ہوائیں اور قرنِ اول کے ایمانی جھونکے دوبارہ چلیں گے اور ایک نیا عالم اسلام ظہور میں آئے گا جس سے موجودہ عالم اسلام کو کوئی نسبت نہیں۔

موجودہ عالم اسلام کی بیماری، پریشانی اور بے اطمینانی نہیں ہے بلکہ حد سے بڑھا ہوا اطمینان و سکون، دنیا کی زندگی پر قناعت اور حالات سے مصالحت ہے، آج دنیا کا عالمگیر فساد اور انسانیت کا زوال اور ماحول کی خرابی اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتی، اس کو زندگی کے اس نقشہ میں کوئی چیز غلط

اور بے محل نظر نہیں آتی۔ اس کی نظر اپنے ذاتی مسائل اور مادی فوائد سے آگے نہیں بڑھتی، اس کی موجودہ افسردگی اور مردہ دلی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کا پہلو خلش سے اور اس کا دل تپش سے خالی ہے۔

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

اس لیے ضرورت ہے کہ یہ مبارک کش مکش پھر پیدا کی جائے، اور اس اُمت کا سکون برہم کیا جائے، اس کو اپنی ذات اور اپنے مسائل کی فکر کے بجائے (جو جاہلی قوموں کا شعار ہے) انسانیت کا درد وغم، ہدایت و رحمت کی فکر اور آخرت اور محاسبۂ الٰہی کا خطرہ پیدا ہو اس اُمت کی خیر خواہی اس میں نہیں ہے کہ اس کے لیے سکون و اطمینان کی دُعا کی جائے بلکہ اس میں ہے کہ اس کے لیے درد و اضطراب کی دُعا کی جائے اور برملا کہا جائے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

شعور کی تربیت کسی قوم کے لیے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو، ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیتیں رکھتی ہو اور دینی و دُنیاوی دولتوں سے مالامال ہو لیکن اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو وہ اپنے دوست و دشمن کو نہ پہچانتی ہو، پچھلے تجربوں سے فائدہ اُٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو، اپنے رہنماؤں اور قائدین کا احتساب کرنے کی اور قومی مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو وہ خود غرض رہنماؤں کی

چرب زبانی و شیریں کلامی سے مسحور ہوجاتی ہو اور ہر مرتبہ نیا دھوکا کھانے کے لیے تیار رہتی ہو، وہ قوم اپنی تمام دینی ترقیات اور دنیاوی سرفرازیوں کے ساتھ قابلِ اعتماد نہیں، وہ پیشہ ور اور خودغرض رہنماؤں اور منافق قائدین کا کھلونا بن جاتی ہے، ان کو قوم کی سادہ لوحی اور بے شعوری کی بنا پر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع ملتا ہے اور ان کو اس کا اطمینان ہوتا ہے کہ کبھی ان کا محاسبہ اور ان سے بازپرس نہیں کی جائے گی۔

مسلم ممالک کے متعلق اگر ہم یہ کہنے سے احتیاط کریں کہ وہ بیداری اور شعور سے بالکل محروم ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کا شعور بہت کمزور ہے اور وہ بیداری کی ابتدائی منزل میں ہیں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خیرخواہ اور بدخواہ کے ساتھ ان کا معاملہ تقریباً یکساں ہے، بلکہ بعض اوقات بدخواہ اور غیر مخلص اشخاص مسلمانوں میں زیادہ ہر دلعزیز اور معتمد بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "مومن سانپ کے ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا" لیکن مسلمان ممالک کے باشندے ہزار ہزار بار ڈسے جانے کے لیے تیار رہتے ہیں، ان کا حافظہ نہایت کمزور ہے وہ اپنے قائدین اور رہنماؤں کے ماضی کو اور ماضی قریب کے واقعات کو فوراً بھول جاتے ہیں، ان کا دینی اور شہری شعور کمزور اور سیاسی شعور تقریباً ناپید ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ غالب قوموں اور خودغرض رہنماؤں کا بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں اور آسانی کے ساتھ ان کا رُخ ہر طرف موڑا جاسکتا ہے۔ حکومتیں ان کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتی رہتی ہیں اور جس طرف چاہتی ہیں ایک لاٹھی سے ہانکے جاتی ہیں۔

مغربی قومیں اپنے روحانی اور اخلاقی افلاس اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جن کی تشریح ہم نے اس کتاب میں کی ہے شہری اور سیاسی شعور کی مالک ہیں، وہ سیاسی بلوغ کو پہونچ چکی ہیں وہ اپنے نفع و نقصان کو پہچانتی ہیں وہ مخلص و منافق، اہل و نااہل، کے فرق کو جانتی ہیں، وہ اپنی قیادت ایسوں کے سپرد نہیں کرتیں جو نااہل ضعیف اور خائن ہیں، وہ جب اپنے معاملات کسی کے سپرد کرتی ہیں تو ڈرتے ہوئے اور احتیاط کے ساتھ، اور جس مرحلہ پر بھی ان کی نااہلی یا خیانت کا اظہار ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھتی ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر چکے اور ان کا کام ختم ہو گیا تو ان کو وہ اپنے منصب سے سبکدوش کر دیتی ہیں اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتی ہیں جو ان سے زیادہ اہلیت کے مالک اور موقع کے مناسب ہوتے ہیں، اس موقع پر کسی رہنما یا معتمد کی سابقہ خدمات، شاندار ماضی اور کسی معرکہ میں نمایاں کامیابی اس قومی فیصلہ میں حائل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں سیاسی پیشہ وروں اور نااہل اور خائن رہنماؤں سے محفوظ ہیں، ان کے سیاسی رہنما اور ان کے نمائندے بھی محتاط اور امانت دار بننے پر مجبور ہیں، وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، قوم کی سرزنش عوام کے عتاب و احتساب اور رائے عامہ کی قہرناکی سے وہ لرزہ براندام رہتے ہیں۔

عالم اسلام کی ایک بہت بڑی ضرورت اور اس کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقات اور عوام میں صحیح شعور پیدا کیا جائے اور جمہور کی عقلی عملی اور سیاسی تربیت کی جائے، یاد رہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوم میں شعور بھی موجود ہے اگرچہ اس میں

شبہ نہیں کہ تعلیم کے عموم اور علوم کی اشاعت سے شعور کے بیدار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن شعور پیدا کرنے کے لیے بہرحال مستقل جد و جہد کی ضرورت ہے، مسلمان رہنماؤں اور مسلمانوں میں اصلاحی کام کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جس قوم میں شعور کی کمی ہے وہ قوم اعتماد کے لائق نہیں، خواہ اس کو اپنے قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو اور وہ ان کی پیروی اور اطاعت میں کیسی ہی چستی اور سرگرمی دکھائے اور ان کی دعوت پر کتنی ہی عظیم قربانیاں پیش کرے اس لئے کہ جب تک اس کا شعور تیار نہیں اور وہ بالغ نظر اور پختہ خیال نہیں ہوئی ہر آن اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسری دعوت اور تحریک کا آلۂ کار بن جائے گی اور آن کی آن میں سالہا سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا جس قوم کا شعور بیدار نہیں ہوا اور جس میں خود سوچنے اور اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پر میدان میں پڑا ہوا اور مختلف سمت کی ہوائیں اس کو ادھر سے ادھر اڑاتی پھرتی ہوں ___

اسلام اگرچہ ایک آسمانی مذہب ہے، اور اس کی بنیاد وحی و نبوت پر ہے لیکن اس نے بھی اپنے پیرؤں میں ایک خاص شعور پیدا کیا جو شعور کی تمام اقسام میں زیادہ مکمل زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ گہرا ہے اس نے اپنے ماننے والوں میں ایک خاص قسم کا طریق فکر پیدا کیا جو جاہلی طریق فکر سے بالکل مختلف ہے اس نے اپنے ماننے والوں کو ایک بیدار اور خود دار شعور عطا کیا جو اپنی وسعت اور قدرتی لچک کے باوجود ان افکار و نظریات کو انگیز نہیں کر سکتا جو اس کے مسلمات سے جوڑ نہ کھاتے ہوں اور ان عناصر و اجزا کو ہضم کرنے کے لیے تیار ہے جو اس کی روح اور اس کے

اُصول سے تضاد رکھتے ہوں

اس اسلامی شعور کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وصحبت سے صحابہ کرام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ ظلم ایک قبیح شئے اور دینی و اخلاقی جرم ہے جو کسی کے لیے جائز نہیں وہ اس پر ایمان لا چکے تھے کہ مسلمان کو ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے، خواہ وہ قریب ہو یا بعید، دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا بیگانہ، انھوں نے جاہلانہ حمیت اور قومی قبائلی اور خاندانی تعصبات سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی تھی اور سمجھ لیا تھا کہ اسلام میں اس اندھے تعصب کی کوئی جگہ نہیں، مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے خواہ حق کسی طرف ہو، یہ ان کا عقیدہ بن گیا تھا اور ان کے خمیر میں داخل ہو گیا تھا۔

ایک دن اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وہ سنتے ہیں کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم" اگر ان کی تربیت میں ذرا بھی خامی اور ان کے ذہن میں کچھ بھی انتشار ہوتا تو وہ خاموشی کے ساتھ اس بات کو سن لیتے اور اس قول کو اس کے جاہلی مفہوم میں قبول کر لیتے جس کے مطابق ان کا نشو ونما ہوا تھا اور ساری عمر اسی پر عمل کرنے میں گزری تھی، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دین کی) کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ سراسر وحی ہوتی ہے۔ ان سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب کرنے والا اور آپ کی تمام باتوں کو بے چون وچرا تسلیم کرنے والا نہیں تھا، لیکن بایں ہمہ وہ خاموش نہ رہ سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے عقیدہ اور اس فکر وفہم سے ٹکرایا جو آپ ہی کی تعلیمات وتربیت کا نتیجہ تھا، اس لیے ان کے

اسلامی شعور پر ایک ضرب لگی اور ان کے دماغ کی چولیں ہل گئیں وہ اپنی اس تکلیف کو چھپا نہ سکے اور انھوں نے استعجاب کے ساتھ پوچھا کہ ہم مظلوم کی تو مدد کریں لیکن ظالم کی کیسے مدد کریں؟ اس پر آنحضرت (صلعم) نے اپنے قول کی شرح فرمائی کہ ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور اس کو ظلم سے باز رکھا جائے، یہ سنتے ہی گرہ کھل گئی اور ان کے اسلامی ذہن نے اس ارشاد کو اس طرح قبول کیا جیسے ایک جانی بوجھی حقیقت ہوتی ہے، یہ اسلامی شعور کی نزاکت اور اسلامی ذکاوت حس کی واضح مثال ہے۔

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھیجی اور ایک صحابی کو اس کا امیر بنایا اور ان کو امیر کی اطاعت کی تاکید فرمائی وہاں یہ واقعہ پیش آیا کہ امیر اس سفر میں کسی بات پر ناراض ہو گئے، جس کی وجہ سے انھوں نے آگ جلوائی اور اپنے ساتھیوں کو اس میں داخل ہونے کا حکم فرمایا! انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع آگ سے نجات حاصل کرنے ہی کے لیے کیا تھا کیا اب اس میں داخل ہو جائیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کی تصویب کی اور فرمایا کہ اگر وہ آگ میں کود پڑتے تو کبھی نہ نکلتے، صحابہ کرام کا یہ انکار اسی بنا پر تھا کہ وہ اس اصول پر ایمان لا چکے تھے کہ خالق کی نافرمانی کے ساتھ کسی مخلوق کی فرمانبرداری صحیح نہیں[۱]، اور یہ کہ اطاعت اسی وقت فرض ہے جب نیک بات کا حکم دیا جائے

---

[۱] لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (حدیث شریف)

اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کی وجہ سے صحابۂ کرام کسی غلط کام اور کسی ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے خواہ اس کا صدور خلیفۂ وقت سے کیوں نہ ہو وہ اگر خلیفہ کی کوئی زیادتی دیکھتے تو برسر منبر اس کو ٹوک دینے میں ان کو تامل نہ ہوتا، حضرت عمرؓ خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں ان کے جسم پر پورا جوڑا ہے، جوڑا دو کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور فرماتے ہیں لوگو! سنتے نہیں، سلمانؓ کہتے ہیں ہم نہیں سنتے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کیوں؟ وہ کہتے ہیں کہ تم نے ہم کو تو ایک ایک کپڑا تقسیم کیا اور تم پورے جوڑے میں ملبوس ہو، وہ فرماتے ہیں عجلت مت کرو پھر اپنے صاحبزادہ عبداللہ کو آواز دیتے ہیں پہلی آواز پر کوئی جواب نہیں ملتا، پھر فرماتے ہیں کہ اے عمر کے بیٹے عبداللہ! عبداللہ ابن عمرؓ جواب دیتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ میں نے جس کپڑے کی تہمد باندھ رکھی ہے یہ تمہارا ہی کپڑا ہے؟ وہ اثبات میں جواب دیتے ہیں، اس پر سلمانؓ کہتے ہیں — ہاں امیر المومنین اب فرمائیے ہم سب سنیں گے۔

اس اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ بنی امیہ کو اپنا شاہی اقتدار قائم رکھنے میں بڑی زحمتیں پیش آئیں اسلامی روح نے بارہا اس اقتدار کے خلاف سخت احتجاج کیا اور بارہا اس عجمی شاہی کے خلاف علم جہاد بلند ہوا، اموی فرمانرواؤں کو اس وقت تک سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوا جب تک وہ نسل ختم نہیں ہو گئی، جس نے اسلامی اصولوں پر تربیت پائی تھی اور جو خلافتِ اسلامی اور اسلام کے نظام حکومت اور طریق حکمرانی سے عشق رکھتی تھی اور اس سے انحراف کو بدعت اور تحریف کا مرادف سمجھتی تھی۔

یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی طرح کی اصلاح اور کوئی معاشرتی یا سیاسی انقلاب شعور کی بیداری اور ذہنوں کی تیاری کے بغیر وقوع میں نہیں آتا، اگرچہ انقلاب فرانس کا تذکرہ اسلامی دعوت و انقلاب کے تذکرہ کے سلسلہ میں سوءِ ادب سے خالی نہیں، اور یہ ایک ناقص اور محدود قسم کا انقلاب تھا جو جذباتی جوش اور بے اعتدالیوں سے پاک نہیں تھا، تاہم اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جب کسی معاشرہ یا ملک کا شعور بیدار ہو جاتا ہے اور ذہنوں کا رخ کسی خاص طرف ہو جاتا ہے تو اس سیلاب کا تھامنا بڑی سے بڑی چٹان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے انقلاب فرانس کے رہنماؤں نے جن میں سے بہت سے لوگ بڑی اچھی ذہنی، علمی اور ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے اور جن کے جلو میں ادیبوں، افسانہ نگاروں اور اہل قلم کا ایک لشکر تھا، انھوں نے ایک خاص مقصد کے لیے فرانسیسی عوام کے شعور کی تربیت کی، عوام کے دل میں ملک کے فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا، پرانی اخلاقی قدروں اور تصورات و روایات کے خلاف ایک عالم بے اطمینانی اور بیزاری پیدا کر دی، اور ماحول اور خارجی دنیا سے پہلے دلوں کے اندر انھوں نے غم و غصہ اور نفرت و حقارت کی ایک آگ روشن کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام لوگوں کے لیے ناقابل برداشت بن گیا، حریت، اخوت، و مساوات کے کلمات محبوب اور مقدس بن گئے اور ہر فرانسیسی کا وظیفہ اور تکیہ کلام بن گیا، اس وقت یہ بغاوت ابھری کہ جوش و غضب کا کوہ آتش فشاں پھٹا، اور پرانے معاشرہ کا قصر منہدم ہو کر رہا، اگرچہ اس انقلاب کے رہنما اس کو انسانیت کے لیے زیادہ مفید نہ بنا سکے اور شاید ان کے پیش نظر یہ تھا بھی نہیں،

لیکن انھوں نے ملک میں انقلاب کر دیا اور اس انقلاب کو کوئی طاقت روک نہ سکی، اس لیے کہ اس انقلاب کا چشمہ لوگوں کے دل و دماغ کے اندر سے اُبلا تھا، اور اس کی پشت پر قوم کی رائے عامہ اور جمہور کی خواہش تھی اور شعور اس کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

آج جس چیز کو یورپ نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور ان کمزوریوں کے ساتھ جن کے ساتھ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی وہ صرف زندہ ہی نہیں بلکہ برسر اقتدار ہے وہ شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس اور سیاسی شعور ہے، ابھی تک انگریزوں اور امریکیوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں شاذ و نادر ہیں جو قومی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوں یا اپنے ملک کو سستے داموں فروخت کر ڈالتے ہوں، یا جو حکومت کے اسرار فاش کر دیتے ہوں، یا خراب و ناکارہ اسلحہ اور ذخیرۂ جنگ کی خریداری کے مجرم ہوں، ایسی مثالیں مشرق میں اور یورپ میں بہت کمیاب اور تقریباً نایاب ہیں، یورپ کا اخلاقی بگاڑ انفرادی دائروں میں محدود ہے ان کے ذمہ دار بیشک بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں قوموں کو دھوکا دے سکتے ہیں اور بڑی بڑی قوموں کو پامال کر سکتے ہیں، مگر یہ اپنے ذاتی فوائد اور اغراض کے لیے نہیں، بلکہ قومی و ملکی مصالح کے لیے، یقیناً اسلام میں ان مجرمانہ افعال کی گنجائش نہیں، اور بداخلاقی خواہ فرد کے ساتھ ہو یا جماعت کے ساتھ خواہ انفرادی محرکات کی بنا پر یا اجتماعی محرکات و قومی محرکات کی بنا پر بداخلاقی ہی ہے، لیکن مغرب جو کچھ کرتا ہے ایک شعور اور اپنے مخصوص فلسفۂ اخلاق کے تحت، مشرق جو کرتا ہے بے شعوری اور شخصی اغراض و محرکات کے ماتحت۔

مسلمان ممالک کے قائدین اور اہلِ اقتدار سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کبھی اپنے کسی حقیر فائدہ یا لذت و خواہش کے ماتحت اپنے ملک کو رہن رکھ دیں یا اس کا بیعنامہ کر دیں، یا اپنی قوم کو بھیڑ بکری کی طرح فروخت کر دیں یا اپنی قوم کو کسی ایسی جنگ میں جھونک دیں جو اس کی مرضی و مصلحت کے خلاف ہو، اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قوم اس کے باوجود بھی ان کی قیادت کا جھنڈا لے کر چلتی رہے، وہ ان کی زندگی کے نعرے لگائے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے، یہ صورتِ حال اس کے سوا اور کس بات کی دلیل ہے کہ قوم کا ضمیر مردہ، اس کے قوائے فکر یہ معطل، اور وہ شعور کی دولت سے محروم ہے۔

بہت سے مسلمان ملک ایسے ہیں جہاں عوام کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے جہاں عوام صرف محنت و مشقت کے لیے اور خواص صرف عیش و عشرت کے لیے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نافرمانیاں ہوتی ہیں اور ان سنگین افعال و جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، شریعت کے احکام پامال کیے جاتے ہیں، لیکن نہ عوام اور جمہور مسلمین میں اس سے غم و غصہ کی کوئی لہر پیدا ہوتی ہے نہ کسی قلب کو اس سے اذیت پہونچتی ہے، یہ سب درحقیقت انسانی غیرت اور اسلامی خودداری کے فقدان کا نتیجہ ہے اور نہایت خطرناک صورتِ حال ہے۔

کسی انقلاب اور کسی بغاوت کی کوئی قیمت نہیں (خواہ ظاہری طور پر وہ ملک و قوم کے لیے کتنی ہی مفید ہو) جب تک کہ اس کی بنیاد میں کوئی پختہ عقیدہ، فکر صحیح، اور تربیت یافتہ اور عاقلانہ شعور نہ ہو، جب تک کہ رائے عامہ پورے طور پر تیار نہ ہو اس وقت تک کسی بادشاہ کی جلاوطنی، کوئی انقلاب حکومت اور

وفادارت کی کوئی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور بالکل ناقابل اعتبار نہیں ہے، اگر قوم میں ان افعال اور اس رویہ سے نفرت نہیں ہے تو ایک غلط شخص یا غلط جماعت کی جگہ پر دوسرا غلط شخص اور دوسری غلط جماعت آسکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ قوم کو اس کا احساس بھی نہ ہونے پائے، اس لیے اصل قابل اعتبار چیز یہ ہے کہ قوم کا ضمیر اور شعور اتنا بیدار ہو جائے کہ وہ کسی غلط چیز اور مجرمانہ فعل کو کسی حالت میں اور کسی شخص کے لیے بھی برداشت نہ کر سکے۔

اس لیے عالم اسلام کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور پیدا کیا جائے ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و ناانصافی کو برداشت کر سکے۔ نہ دینی اخلاق سے انحراف کو، جو صحیح اور غلط، خلوص اور نفاق، دوست اور دشمن، مصلح اور مفسد کے درمیان آسانی سے تمیز کر سکے، مجرم اس کی ناراضگی اور عتاب سے بچ نہ سکیں اور مخلص اس کے اعتراف اور قدر شناسی سے محروم نہ رہیں، وہ اپنے تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل و معاملات میں ایک عاقل و بالغ انسان کی طرح غور کر سکنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جب تک یہ شعور نہ پیدا ہو، کسی اسلامی ملک و قوم کا جوش عمل، صلاحیت کار دینی جذبات اور مذہبی زندگی کے مظاہر و مناظر کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

خود غرضی اور نفس پرستی کی گنجائش نہیں

الف لیلیٰ کی کتاب اس دور کی نمائندگی کرتی ہے جس میں زندگی صرف ایک فرد اور ایک شخص کے گرد گھومتی نظر آتی ہے، جس کو خلیفہ یا بادشاہ کہتے تھے یا چند افراد کے ایک مختصر مجموعہ کے ارد گرد جو وزراء اور شہزادے

کہلاتے تھے، ذہین اس خوش نصیب فرد کی ذاتی ملکیت تصور کی جاتی اور قوم غلاموں اور زر خریدوں کی ایک ٹولی ہوتی تھی اور یہ شخص ان کے مال و متاع جائداد و املاک اور عزت و آبرو کا مالک سمجھا جاتا اور پوری قوم در اصل اس ایک فرد کا سایہ تھی، پوری زندگی اپنی تاریخ، علوم، ادبیات، شعر و شاعری کے ساتھ اسی کے گرد چکر کاٹتی اور اسی کا طواف کرتی تھی، اگر کوئی شخص اس عہد پر نظر ڈالتا اور اس دور کے ادب و لٹریچر کا جائزہ لیتا تو وہ دیکھتا کہ وہ شخصیت اس زمانہ کی سوسائٹی پر اس طرح حکمراں اور مسلط ہے جس طرح ایک قوی ہیکل درخت اپنے نیچے اگنے والے چھوٹے چھوٹے پودوں اور گھاس پھوس پر اپنے بازو پھیلائے رہتا ہے اور ہوا اور سورج کی گرمی روکتا رہتا ہے، بالکل اسی طرح پوری قوم اس ایک فرد کی شخصیت میں جذب ہو جاتی، پھر نہ اس کی کوئی مستقل شخصیت تھی نہ ارادہ، نہ آزادی اور نہ احساس خودداری۔

یہ فرد وہ ہوتا جس کے لیے زندگی کا پہیہ گھومتا تھا، اسی لیے کسان ہل چلاتا، اسی کیلئے تاجر محنت کرتا، اسی کیلئے کاریگر اور صناع اپنا جوہر دکھاتے، اسی کی خاطر مصنفین کتابیں لکھتے اور شاعر اپنی قوت گویائی کا مظاہرہ کرتے، اسی کیلئے لڑکے پیدا ہوتے، اور اسی راستہ میں لشکر حملہ کرتے، بلکہ اسی کی خاطر زمین اپنے خزانے اگلتی، اور سمندر اپنی نعمتیں پھینکتا، اور عوام جو در حقیقت اس سب دولت ثروت اور زرخیزی و شادابی کے باعث ہوتے اور ان سب کا دارومدار انھیں پر ہوتا، وہ غلاموں کی طرح دن کاٹتے، بادشاہ کے خوان نعمت سے جو کچھ بچ رہتا بندہ اسی پر خوش ہوتے، اور شاہی افراد سے کچھ مل جاتا تو اس پر شکر ادا کرتے

اور اگر اس سے بھی محروم رہتے تو صبر و توکل اختیار کرتے، ان کی انسانیت مرجاتی تو ان کو افسوس نہ ہوتا اور وہ چاپلوسی اور موقع پرستی کا راستہ اختیار کر لیتے۔

یہ وہ عہد تاریخ ہے جو مشرق میں خوب پھلا پھولا اور اس نے سوسائٹی پر اثرات چھوڑے، ادبیات، شاعری، تمدن و اجتماع سب پر اثرانداز ہوا، عربی کتب خانہ پر اس کے گہرے اثرات پڑے، انھیں اثرات کا ایک جیتا جاگتا مرقع "الف لیلہ" کی کتاب ہے، جو اس عہد کی تصویر کشی کرتی ہے، جب بغداد کا کوئی خلیفہ یا دمشق اور قاہرہ کا کوئی بادشاہ سب کچھ ہوتا تھا، اس کی حیثیت افسانۂ زندگی کے ہیرو اور مرکزی نقطہ کی ہوتی تھی۔

یہ عہد جس کا نقشہ الف لیلہ کے قصوں اور کہانیوں میں کھینچا گیا ہے اور "آغانی" کی تاریخ و ادب میں جس کی تصویر لی گئی ہے وہ نہ اسلامی عہد تھا نہ عقل اور منطق کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا اس کو اسلام بھی ناقابل قبول قرار دیتا ہے اور عقل بھی اس کا انکار کرتی ہے، اسلام اس غیر فطری عہد کے زوال کا پیغام تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد کا نام "جاہلیت" رکھا اس پر نفرت کی، اس کے علمبرداروں اور فرمانرواؤں، کسریٰ و قیصر کے خاتمہ کی خبر دی۔

یہ عہد کسی زمانہ میں اور دنیا کے کسی حصہ میں بھی زندگی کی صلاحیت اور باقی رہنے کا استحقاق نہیں رکھتا، یہ اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب لوگ حالات سے بے بس اور مجبور ہو گئے ہوں یا بیداری اور شعور کی دولت سے محروم ہو چکے ہوں اور ان کی زندگی دم توڑ چکی ہو۔

اس صورت حال کو عقل برداشت نہیں کر سکتی۔ کون شخص اس کو پسند کرےگا

کہ چند افراد کو کھانے پینے کی زیادتی کی وجہ سے تخمہ ہو جائے اور دوسری طرف ہزاروں آدمی بھوک اور فاقہ کشی سے جاں بلب ہو رہے ہوں، کس کو برا لگے گا کہ ایک بادشاہ اس کے بیٹے مال و دولت کے ساتھ مجنونوں کی طرح کھیلیں اور لوگوں کو زندہ رہنے کے لیے ایک وقت کا کھانا اور ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا نصیب نہ ہو، اس پر کون راضی ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ جو اکثریت میں ہو اس کا کام تو صرف یہ ہو کہ پیداوار بڑھائے، زمین سے غلّہ پیدا کرے صبح سے شام تک بیل کی طرح جتا رہے اور ایک طبقہ جو انگلیوں پر گنا جاتا ہو اس کا کام یہ ہو کہ ان کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ کھائے اور ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور یہ سب شکر و احسان مندی کے ایک کلمہ کے بغیر اور احساس و شعور سے بالکل خالی ہو کر، یہ کون گوارا کر سکتا ہے کہ اہل صنعت و حرفت، اہل عقل و خرد، ارباب کمال اور مختلف صلاحیتیں اور ذہنی طاقتیں رکھنے والے لوگ ہمیشہ تکلیف ہی اٹھاتے رہیں اور وہ لوگ عیش کریں اور رنگ رلیاں منائیں جن کو اسراف و فضول خرچی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ جو فسق و فجور میں ڈوبے رہتے اور شرابیں پینے کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتے، یہ کس کی نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ اہلیت رکھنے والے، ارباب دانش، امین و دیانت دار، عالی دماغ اور دقیق النظر لوگوں سے اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جائے اور بادشاہ اور امراء و روساء کے اردگرد خسیس النفس دنی الطبع، بے دماغ، اور ضمیر فروشوں کی ایک ٹولی ہو جن کی سب سے بڑی فکر حصول دولت اور نفسانی خواہشات کی تسکین ہو، جنھوں نے اس دنیا میں چاپلوسی اور خوشامد اور بے گناہوں کے خلاف سازش کے علاوہ کوئی

فن نہ سیکھا ہو اور جن کی آنکھوں کا پانی مر چکا ہو اور ان کا شعور و احساس فنا ہو گیا ہو۔

یہ ایک غیر طبعی حالت ہے جس کو ایک دن بھی باقی نہ رہنا چاہیئے نہ کہ برسوں تک، اگر تاریخ کے کسی دور میں یہ صورت حال پیدا ہوئی اور عرصۂ دراز تک قائم رہی تو یہ قوم کی غفلت و لاپرواہی کا نتیجہ تھی، یا اس کی مرضی اور پسند کے خلاف زبردستی اس کے سر تھوپی گئی اور سلسلام کے ضعف اور جاہلیت کی قوت کی وجہ سے ایسا ہوا، لیکن جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، شعور بیدار ہوا اور قوم میں احتساب اور جائزہ کی شان پیدا ہو گئی تو یہ ساری عمارت فوراً منہدم ہو گئی۔

آج جو لوگ الف لیلیٰ کی دنیا میں رہتے ہیں وہ خواب کی دنیا میں رہتے ہیں وہ ایسے گھر میں بسیرا ڈالے ہوئے ہیں جو مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ہے، وہ ایسے گھر میں زندگی گزار رہے ہیں جو ہر وقت خطرات سے گھرا ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس پر کب کدال پڑنے لگیں اور کب چھت ٹوٹ کر گر پڑے۔

الف لیلیٰ کا زمانہ گیا اور اس کی بساط الٹ چکی عالم اسلام کو اپنے نفس کو دھوکہ نہیں دینا چاہیئے اور اپنے کو گاڑی کے اس پہیہ سے نہیں باندھنا چاہیئے جو ٹوٹ چکا ہے، خود غرضی اور نفس پرستی ایک چراغ سحری ہے جس کا تیل ختم ہو چکا ہے اس کا فتیلہ جل کر خاک ہو گیا ہے وہ بجھ جائے گا ہوا کا جھونکا آئے یا نہ آئے۔

اسلام میں اس طرح کی انانیت اور خود غرضی کی کوئی گنجائش نہیں، اس میں شخصی برتری یا خاندانی برتری اور خود غرضی کو پیر رکھنے کی بھی جگہ نہیں جو آج بعض

مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں پائی جاتی ہے اس میں اس وسیع اور منظم خود غرضی کی ابھی کوئی جگہ نہیں جو آج یورپ امریکہ اور روس میں نظر آتی ہے۔ یورپ میں اس کی شکل ایک پارٹی اور جماعت کے اقتدار و تسلط کی ہے اور امریکہ میں سرمایہ داروں کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، روس میں وہ اس چھوٹے سے گروہ کی شکل میں سامنے آتی ہے جو کمیونزم پر ایمان لاچکا ہے وہ اکثریت پر زبردستی سے حاوی ہے اور مزدوروں اور قیدیوں کے ساتھ اس سفاکی اور سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ سلوک کرتا ہے جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

یہ انانیت اور خود غرضی اپنی تمام صورتوں شکلوں کے ساتھ ختم ہوکر رہے گی، زخم خوردہ انسانیت اس سے سخت انتقام لے گی، دنیا کا مستقبل اب صرف عدل پسند، رحم دل، متوازن اسلام کے ساتھ وابستہ ہے، چاہے "خود غرضی" کو تھوڑی سی اور مہلت مل جائے، پہلے اس کی لگام ذرا ڈھیلی ہو جائے اور چاہے اس کو اپنی سرکشی، گمراہی، طغیانی میں گزارنے کے لیے کچھ دن اور مل جائیں۔

خود غرضی اور انانیت شخصی ہو یا خاندانی جماعتی ہو یا طبقاتی، قوم کی زندگی کے لیے ایک غیر طبعی چیز ہے جس سے اس کو پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرنا ہے، نہ اسلام میں اس کی کوئی جگہ ہے نہ اس بیدار سوسائٹی میں جو بلوغ اور رشد کو پہونچ گئی، مسلمانوں کے لیے اور عربوں کے لیے اور ان کے رہنماؤں اور حکمرانوں کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اس سے آزاد ہو جائیں اور اس سے اپنا تعلق منقطع کرلیں قبل اس کے کہ وہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے۔

مشرق میں بھی اب اس کوتاہ نظری کا چل چلاؤ ہے اور اس کا وقت ختم

قریب ہے اس کے عروج و اقبال کے تارے غروب ہونا شروع ہو گئے ہیں، یہ زید اور عمرو و بکر کا مسئلہ نہیں، یہ ایک عہد کا مسئلہ ہے جو ختم ہو رہا ہے، ایک مدرسۂ فکر اور مکتبِ خیال کا معاملہ ہے جس کا دم واپسیں ہے، جو ابھی تک اس کے سہارے جی رہے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سفینہ اب ڈوبنے والا ہے۔

صنعتی اور جنگی تیاری

عالم اسلامی کا کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا اگر اس کو اسلام کے پیغام کی اشاعت کی خواہش ہے اور وہ دنیا کی قیادت و رہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو اس کے لیے متناسب قوت اور تربیت، صنعت و علوم، تجارت اور فن حرب میں مکمل تیاری کی ضرورت ہوگی اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور اپنی ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا وہ اس سطح پر ہو کر اپنے لیے پہننے اور کھانے کا سامان کر سکے، اپنے لیے ہتھیار تیار کر سکے، اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو، اپنی زمین کے خزانے وہ خود برآمد کر سکے اور اس سے فائدہ اٹھا سکے اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ چلائے اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندروں میں اس کے بحری بیڑے اور جہاز شور کرتے ہوں، وہ دشمن کا مقابلہ اپنے یہاں کے جنگی ہوائی جہازوں، توپوں اور ہتھیاروں سے کرے، اس کی برآمد اس کی درآمد سے زیادہ ہو اور اس کو مغربی ممالک سے قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے اس کو اس کے کسی جھنڈے کے نیچے نہ آنا پڑے اور وہ کسی کیمپ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو۔

جب تک عالم اسلامی علم و سیاست صنعت و تجارت میں مغرب کا محتاج

رہے گا مغرب اس کا خون چوستا رہے گا، اسی کی زمین کا آبِ حیات نکالے گا اس کا سامان تجارت اور مصنوعات ہر روز اس کی منڈیوں، بازاروں اور جیبوں پر چھاپہ مارا کریں گی اور اس کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرتی رہیں گی، جب تک عالم اسلامی مغرب سے قرض لیتا رہے گا اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے، اہم اور کلیدی عہدوں کو پر کرنے، اپنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لیے مغرب کے آدمیوں کا رہینِ منت رہے گا، وہاں کا سامانِ تجارت و صنعت منگائے گا اور اس کو اپنا اتالیق اور استاد، مربی اور سرپرست حاکم اور سردار سمجھے گا اس کے حکم اور اس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا اس وقت تک وہ مغرب سے مقابلہ کرنا تو درکنار اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا۔

یہ علمی اور صنعتی زندگی کا وہ شعبہ تھا جس کے بارہ میں عالم اسلامی نے عہد ماضی میں کوتاہی سے کام لیا اور جس کی تعزیر میں اس کو طویل اور ذلیل زندگی کا مزہ چکھنا پڑا اور اس پر مغربی قیادت اور سرداری مسلط کی گئی جس نے دنیا میں تباہی، غارت گری، قتل و خون ریزی اور خودکشی برپا کی اب اگر اس موقع پر بھی عالم اسلامی نے علمی و صنعتی تیاری اور اپنی زندگی کے معاملات میں آزادی کے بارہ میں غفلت برتی اور اس مرتبہ بھی اس سے یہ چوک ہوگئی تو دنیا کی تقدیر میں بدنصیبی اور شقاوت لکھ دی جائے گی اور انسانیت کے ابتلا کی مدت اور طویل ہو جائے گی۔

نئی علمی تنظیم عالم اسلامی کے لیے ضروری ہے کہ علم کی اس طرح تنظیم جدید کرے جو اس کی روح اور اس کے پیغام سے مطابقت رکھتی ہو، عالم اسلامی نے قدیم دنیا پر اپنی علمی سیادت کا سکہ جما دیا تھا اور دنیا کی

عقلیت و ثقافت دکلچر کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا، اس نے دنیا کے ادب اور فلسفہ کے جگر میں نشیمن بنایا تھا، صدیوں متمدن دنیا اس کی عقل سے سوچتی رہی اسی کے قلم سے لکھتی رہی اور اسی کی زبان میں تصنیف و تالیف کرتی رہی، چنانچہ ایران، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے مصنفین اور اہل علم اگر کوئی اہم کتاب لکھنا چاہتے تھے تو عربی ہی میں لکھتے تھے اور بعض لوگ اصل کتاب عربی میں لکھتے اور اس کی تلخیص فارسی میں کرتے جیسا کہ امام غزالیؒ نے "کیمیائے سعادت" میں کیا، اگرچہ یہ علمی تحریک جو عہد عباسی کے آغاز میں شروع ہوئی تھی یونان اور عجم سے متاثر تھی اور اسلامی اسپرٹ اور اسلامی فکر کی بنیاد پر قائم نہیں تھی اور اس میں علمی و دینی حیثیت سے متعدد خامیاں اور کمزوریاں تھیں لیکن اپنی قوت اور تازگی کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر آندھی پانی کی طرح چھا گئی اور قدیم علمی نظام اس کے سامنے ٹھٹھر کر رہ گئے۔

پھر یورپ کی ترقی اور عروج کا زمانہ آیا اس نے اس قدیم نظام کو اپنے تجربات اور علمی تنقید سے تقویم پارینہ بنا دیا اور اس کی جگہ تعلیم و تدریس کا نیا نظام تیار کیا جو اس کی روح، عقلیت اور نفسیات کا کامیاب نمونہ تھا، جو طالب علم اس علمی ماحول سے فارغ ہو کر نکلتا اس کی رگ رگ میں یہ اسپرٹ کام کرتی ہوتی، دنیا نے دوسری بار اس تعلیمی نظام کے سامنے ہتھیار ڈال دئے اور عالم اسلامی کو بھی قدرتی طور پر اس کے سامنے سر جھکانا پڑا جو عرصہ سے علمی انحطاط اور فکری جمود کا بیمار تھا، اور احساس کمتری کی بنا پر اپنی نجات صرف یورپ کی تقلید میں منحصر سمجھتا تھا، اس نے اس تعلیمی نظام کو اس کی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قبول کر لیا اور پوری

نظام آج عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ پر حاوی ہے۔

اس نظام کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی نفسیات اور جدید نفسیات میں ایک کش مکش برپا ہو گئی اسلامی اخلاق اور مغربی طرز اخلاق میں رسہ کشی شروع ہوئی، اشیاء اور اس کی قدر و قیمت کی جدید میزان اور قدیم میزان میں ایک جنگ شروع ہو گئی، اس نظام کا ایک ثمرہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں شک اور نفاق، بے صبری، زندگی سے عشق اور بوالہوسی، نقد کی ادھار پر ترجیح کی ذہنیت پیدا ہو گئی اور اس طرح کے دوسرے عیوب پیدا ہو گئے جو مغربی تہذیب کا لازمہ ہیں۔

اگر عالم اسلامی کی خواہش ہے کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کرے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہو اگر وہ عالم گیر قیادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف تعلیمی خود مختاری ہی نہیں بلکہ علمی لیڈر شپ بھی بہت ضروری ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں، یہ مسئلہ بہت گہرے غور و فکر کا محتاج ہے اس کے لیے ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر تصنیف و تالیف اور علوم کی تدوین جدید کا کام شروع کیا جائے اس کام کے سربراہ کار عصری علوم سے اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں جو تحقیق و تنقید کے درجہ تک پہونچتی ہو اور اس کے ساتھ اسلام کے اصلی سرچشموں سے پورے طور پر سیراب اور اسلامی روح سے ان کا قلب و نظر معمور ہو، یہ وہ مہم ہے جس کی تکمیل کسی جماعت یا انجمن کے بس کی نہیں ہوگی، یہ اسلامی حکومتوں کا کام ہے، اس مقصد کے لیے اس کو منظم جماعتیں اور مکمل ادارے قائم کرنے ہوں گے اور ایسے ماہرین فن کا انتخاب کرنا ہوگا جو ہر فن میں دست گاہ رکھتے ہوں،

وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو ایک طرف کتاب سنت کے محکمات اور دین کے ناقابل تبدیل حقائق پر مشتمل ہو اور دوسری طرف مفید عصری علوم اور تجربہ و تحلیل پر حاوی ہو وہ مسلمان نوجوانوں کے لیے علوم عصریہ کی از سر نو تدوین کریں جو اسلام کے اصولوں اور اسلام کی روح کی بنیاد پر ہو، اس میں ہر ایسی چیز ہو جو نوخیز طبقہ کے لیے ضروری ہو اور جس سے وہ اپنی زندگی کی تنظیم کر سکے اور اپنی سالمیت کی حفاظت کر سکے وہ مغرب سے مستغنی ہو اور مادی و دماغی جنگ میں اس کے مقابلہ میں آسکے، اپنی زمین کے خزانوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے ملک کی دولتوں کو استعمال میں لائے، اسلامی ملکوں کی مالیات کی نئی تنظیم کرے اور اس کو اسلامی تعلیمات کے ماتحت اس طرح چلائے کہ طرز حکومت اور مالیاتی امور کی تنظیم میں یورپ پر اسلامی نظام کی برتری صاف ظاہر ہو جائے اور وہ اقتصادی مشکلات حل ہو جائیں جن کے حل کرنے کے معاملہ میں یورپ سپر ڈال چکا ہے اور اپنی بے بسی کا معترف ہے۔

اس روحانی، صنعتی اور فوجی تیاری اور تعلیمی آزادی کے ساتھ عالم اسلامی عروج حاصل کر سکتا ہے، اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے اور دنیا کو اس تباہی سے نجات دلا سکتا ہے جو اس کے سر پر منڈلا رہی ہے، قیادت، ہنسی کھیل نہیں، نہایت سنجیدہ معاملہ ہے اور منظم جد و جہد، مکمل تیاری، عظیم الشان قربانی اور سخت جانفشانی کی محتاج ہے۔

عالم عربی کی قیادت

عالم عربی کی اہمیت: دنیا کے سیاسی نقشہ میں عالم عربی بہت اہمیت رکھتا

ہے، وہ ان قوموں کا گہوارہ ہے جنھوں نے انسانی تاریخ میں سب سے اہم پارٹ ادا کیا اس کے سینہ میں دولت وطاقت کے عظیم الشان خزانے محفوظ ہیں اس کے پاس پٹرول ہے جو آج جنگی اور صنعتی جسم کے لیے خون کا درجہ رکھتا ہے اور یورپ وامریکہ اور مشرق بعید کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

وہ عالم اسلامی کا دھڑکتا ہوا دل ہے جس کی طرف روحانی اور دینی طور پر پورے عالم اسلامی کا رُخ ہے جو ہر وقت اس کا دم بھرتا ہے اور اس کی محبت و وفاداری میں سرشار رہتا ہے۔

اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کا امکان ہے کہ خدانخواستہ اس کو تیسری جنگ کا میدان بننا پڑے۔ وہاں طاقتور بازو ہیں، سوچنے سمجھنے والی عقلیں ہیں اور جنگجو جسم ہیں وہاں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں ہیں اور قابل کاشت زمینیں ہیں۔

مصر وہیں واقع ہے جو اپنی پیداوار، آمدنی، زرخیزی وشادابی دولت و ترقی، تہذیب وتمدن میں خاص درجہ رکھتا ہے جس کی گود میں دریائے نیل لہروں رواں ہے، یہاں فلسطین ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک ہیں جو اپنی آب وہوا کی لطافت حسن وخوبصورتی اور فوجی اہمیت میں ممتاز ہیں۔

اس کے پاس "عراق" کا ملک ہے جو اپنی بہادری، سخت جانی، شجاعت، عزم، اور بیڑدل کے ذخیروں کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔

یہاں جزیرہ عرب ہے جو اپنے روحانی مرکز، دینی اثر میں سب سے منفرد ہے جس کے حج کے سالانہ اجتماع کی نظیر دنیا میں نہیں، جہاں تیل کے چشمے سب سے زیادہ

تیل پیدا کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں ہیں جنھوں نے عالم عربی کو اہل مغرب کی نظر کا مرکز ان کی خواہشات کی آماجگاہ، اور قیادت و لیڈرشپ کے لیے مقابلہ کا میدان بنا دیا اور جس کا ردعمل یہ ہوا کہ ان ملکوں میں عربی قومیت اور وطن پرستی کا شدید احساس پیدا ہوگیا ہے۔

محمد رسول اللہ عالم عربی کی روح ہیں

ایک مسلمان، عالم عربی کو جس نظر سے دیکھتا ہے اس میں اور ایک یورپین کی نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بلکہ خود ایک وطن پرست عرب، عالم عربی کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔

مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کی عزت و افتخار کا عنوان، اور اس کا سنگ بنیاد ہیں، اگر اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا کردیا جائے تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالم عربی عالم وجود میں آیا، اس سے پہلے یہ دنیا منقسم اور منتشر اکائیوں، باہم دست و گریباں قبیلوں، غلام قوموں اور بے مصرف صلاحیتوں کا دوسرا نام تھی، اس پر جہل و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے، عرب رومی شہنشاہی سے جنگ مول لینے کا خواب بھی نہیں دیکھ

سکتے تھے اس کا تصور کرنا بھی ان کے لیے مشکل تھا، شام جو بعد میں عالم عربی کا بہت اہم حصہ قرار پایا ایک رومی نو آبادی تھی جو مطلق العنان حکومت اور سخت ترین ڈکٹیٹر شپ کے رحم و کرم پر تھی اس نے ابھی تک آزادی و انصاف کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا۔

عراق کیانی حکومت کی اغراض و خواہشات کا شکار تھا، نئے نئے محاصل اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے اس کی کمر جھک گئی تھی، رومی مصر کے ساتھ ایک گائے کا سا برتاؤ کرتے تھے جس کو دوہنے اور فائدہ اٹھانے میں وہ کمی نہ کرتے لیکن چارہ دیتے وقت حق تلفی اور بخل سے کام لیتے، پھر وہاں سیاسی استبداد کے ساتھ مذہبی استبداد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ دفعتاً اس متفرق منتشر، مظلوم دنیا پر اسلام کی بادِ بہاری کا ایک جھونکا چلا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اس وقت یہ عربی دنیا ہلاکت کے قریب تک پہونچ گئی تھی، آپ نے اس کی دستگیری فرمائی، اس کی نبضیں ڈوب رہی تھیں آپ نے اس کو زندگی بخشی، نئی روشنی عطا کی، کتاب و حکمت کی تعلیم دی تزکیہ کا سبق پڑھایا آپ کی بعثت کے بعد اس دنیا کی نوعیت بدل گئی، اب وہ اسلام کی سفیر تھی، امن و سلامتی کی پیامبر تھی، تہذیب و تمدن کی علمبردار تھی، قوموں کے لیے رحمت کا پیغام تھی، اب ہم شام کا بھی نام لے سکتے ہیں، عراق کا بھی ذکر کر سکتے ہیں اور مصر پر بھی فخر کر سکتے ہیں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت نہ ہوتی تو آج نہ شام کا کہیں پتہ ہوتا نہ عراق کا کہیں ذکر ملتا نہ مصر کا وجود ہوتا اور عالم عربی عالم عربی ہی نہ ہوتا، اور یہیں تک نہیں، دنیا بھی تمدن و شائستگی، علم و فن، تہذیب

ترقی کی اس سطح پر نہ ہوتی، اب اگر عرب قوموں اور حکومتوں میں کوئی دین اسلام سے مستغنی ہونا چاہتا ہے اور اپنا رخ مغرب کی طرف پھیرتا ہے یا عہد قدیم کی طرف حریصانہ نظر ڈالتا ہے یا اپنے نظام زندگی اور سیاست وحکومت میں مغربی دستور اور مغربی قوانین کی پیروی کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا قائد، امام، رہبر اور اسوہ ومعیار نہیں سمجھتا، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی نعمت کو فوراً واپس کردے اور اپنے پہلے دور جاہلیت کی طرف واپس چلا جائے، جہاں رومیوں اور ایرانیوں کا سکہ چلتا تھا، جہاں ظلم واستبداد کا بازار گرم تھا، جہاں سامراج کی فرمانروائی تھی، جہاں جہل وگمراہی تھی، جہاں غفلت اور بیکاری تھی، جہاں دنیا سے الگ تھلگ گمنامی کے گوشہ میں ایک جاہل زندگی گزاری جارہی تھی اس لیے کہ یہ شاندار اور روشن تاریخ، یہ تابناک تہذیب، یہ بازار ادب، یہ عرب سلطنتیں اور حکومتیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت کا فیض اور آپ کی آمد کا نتیجہ ہے۔

ایمان عالم عربی کی طاقت ہے اسلام عالم عربی کی قومیت ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے امام اور قائد ہیں، ایمان اس کی قوت کا خزانہ ہے جس کے بھروسہ پر اس نے دوسری قوموں کا مقابلہ کیا اور فتح یاب ہوا اس کی طاقت کا راز اور اس کا کارگر ہتھیار جو کل تھا وہی آج ہے جس کے ساتھ وہ دشمنوں سے جنگ کرسکتا ہے، اپنی ہستی کی حفاظت کرسکتا ہے اور دوسروں تک اپنا پیغام پہونچا سکتا ہے۔

عالم عربی کو اگر کمیونزم یا یہودیت سے جنگ کرنا ہے یا کسی دوسرے

دشمن کا مقابلہ کرتا ہے تو اس دولت کے بل بوتے پر جنگ نہیں کرسکتا جو برطانیہ اسکو عطا کرتا ہو یا امریکہ اس کو خیرات دیتا ہے، یا پٹرول کی قیمت کے طور پر اسکو حاصل ہوتی ہے، وہ اپنے دشمن کا مقابلہ صرف اس ایمان، معنوی قوت، اس روح اور اسپرٹ کے ساتھ کرسکتا ہے جس اسپرٹ کے ساتھ کبھی اس نے بیک وقت رومی و ایرانی حکومتوں کو جنگ کی دعوت دی تھی اور فتح حاصل کی تھی وہ اس دل کے ساتھ جنگ نہیں کرسکتا جس کو زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو، اس جسم سے مقابلہ نہیں کرسکتا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو، اس عقل کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا جس کو شک و شبہ کا گھن لگ چکا ہو، اور افکار و خواہشات باہم دست و گریباں ہوں، اسکو یاد رکھنا چاہئے کہ ضعیف الایمان اور متشکک قلب اور میدان میں ساتھ چھوڑ دینے والی قوت کے ساتھ میدان جنگ کبھی نہیں جیتا جاسکتا، عرب کے قائدین اور عرب لیگ کے ذمہ داروں کے لئے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ عربی فوج، کسانوں تاجروں اور جمہور کے ہر طبقہ میں ایمان کی تخم ریزی کریں، ان میں جہاد کا جذبہ، جنت کا شوق اور ظاہری آرائشوں کی تحقیر و اہانت کا احساس پیدا کریں، ان کو خواہشات یقین اور زندگی کی مرغوبات پر قابو حاصل کرنے، خدا کے راستہ میں مصائب اور تکلیفیں برداشت کرنے مسکراتے چہروں کے ساتھ موت کے استقبال اور اسپر پروانوں کی طرح گرنے کا سبق دیں۔

شہسواری اور فوجی زندگی کی اہمیت	یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ عربی اقوام نے اپنی بہت سی فوجی خصوصیات کو ضائع کردیا، خاص طور پر شہسواری ان کی زندگی سے بالکل

خارج ہوگئی، جو ایک بہت بڑا نقصان اور میدان جنگ میں عدم تربیت اور کمزوری کا بہت اہم سبب ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوموں کی فوجی اسپرٹ جو ان کا طغرائے امتیاز تھی ختم ہوگئی، جسم کمزور ہوگئے، لوگ ناز و نعم میں زندگی گذارنے لگے، موٹروں نے گھوڑوں کی جگہ لے لی اور قریب ہے کہ عربی گھوڑے جن کی دنیا میں دھوم ہے جزیرۂ عرب سے نیست و نابود ہو جائیں، لوگوں نے کشتی، شہسواری، جنگی مشقوں اور دوسری جسمانی ورزشوں کو فراموش کر دیا اور ان کھیلوں کا انتخاب کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے تعلیم و تربیت کے رہنماؤں کے لیے ضروری ہے کہ عرب نوجوانوں میں شہسواری، فوجی زندگی، سادگی، استقلال، جفاکشی اور مصائب پر صبر و استقامت کی اہلیت پیدا کریں۔

امیر المومنین عمر بن الخطاب عجمی ممالک میں اپنے عرب عمال کو لکھتے ہیں:۔

ایاکم والتنعم وزی	تن آسانی و راحت طلبی کی زندگی
العجم وعلیکم بالشمس	اور عجمی لباسوں سے ہمیشہ دور دور
فانہا حمام العرب	رہنا، دھوپ میں بیٹھنے اور چلنے
وتمعددوا واخشوشنوا	کی عادت برقرار رکھنا کہ وہ عربوں
واخلولقوا واعطوا	کا حمام ہے، جفاکشی سادہ زندگی صبر و
الرکب اسنتہا وانزوا	تحمل سے کام لو، گھوڑے پر جست لگا کر بیٹھنے کی عادی
نزوا وارموا الاغراض	رہو، گھوڑے پر جست لگا کر بیٹھنے
	کی مشق رہنی چاہیے، نشانے
	درست ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

ارموا بنی اسماعیل ۔	اے اہل عرب تیر اندازی کی مشق
فان اباکم کان	کرو اس لیے کہ تمہارے جد امجد
رامیاً[1]	(حضرت اسماعیل) تیر انداز تھے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:-

الا ان القوۃ	یاد رکھو جس قوت کے تیار رکھنے
الرمی الا ان القوۃ	کا قرآن مجید میں تاکید ہی وہ
الرمی[2]۔	تیر اندازی ہے، وہ تیر اندازی ہے۔

تعلیم وتربیت کے ذمہ داروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کا مقابلہ کریں جو مردانگی وشجاعت کی روح کو کمزور کر رہی ہو اور عجز وتخنث پیدا کرتی ہو، عریاں صحافت نگاری، فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں، جو نوجوانوں میں نفاق، بے حیائی، فسق وفجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کر رہا ہو، ان پیشہ وروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوجی کیمپ میں نہ داخل ہونے دیں، جو ملت اسلامیہ کے قلب واخلاق میں فساد برپا کرنا چاہتے اور فسق ومعصیت اور فحش پسندی کو چند حقیر پیسوں کے لیے خوبصورت اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی قوم میں مردانگی اور غیرت انسانی کو زوال ہوا، عورتوں نے اپنی نسائیت اور فطرت مادری کے خلاف بغاوت

---

[1] بخاری [2] مسلم

کی اور آزادی و بے حجابی کی راہ اختیار کی، ہر چیز میں مردوں کی مسابقت کی کوشش کی، خانگی زندگی سے نفرت و غفلت بڑھی اور ضبط تولید کی رغبت پیدا ہوئی، اس کا ستارۂ اقبال غروب ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے نشانات بھی مٹ گئے، یونانی، رومی، اور ایرانی اقوام کا انجام یہی ہوا اور یورپ بھی آج اسی راہ پر گامزن ہے جو اس انجام تک لے جاتی ہے، عالم عربی کو ڈرنا چاہیئے کہ کہیں اس کا انجام بھی ایسا نہ ہو۔

طبقاتی تفاوت اور اسراف کا مقابلہ

عربوں کو مغربی تہذیب کے اثر سے اور بہت سے دوسرے اسباب کی بنا پر عیش و عشرت، غیر ضروری لوازم زندگی کے شدید اہتمام، اسراف لذت و خواہش اور فخر و آرائش کے لئے فضول خرچی کی عادت پڑ چکی ہے، اس عیش و تنعم اور بیدردی کے ساتھ خرچ کے پہلو بہ پہلو فقر و فاقہ اور عریانی بھی موجود ہے، جب ایک شخص بڑے بڑے عرب شہروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور سر شرم سے جھک جاتا ہے، وہ دیکھتا ہو کہ ایک طرف وہ آدمی ہے جسکو اپنی ضرورت سے زائد، غذا، لباس کا مصرف نظر نہیں آتا، دوسری طرف اس کی نگاہ ایسے بدوی پر پڑتی ہے جسکو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کے لیے کپڑا بھی نصیب نہیں، ...... جب عرب کے امراء و اصحاب ثروت ہوا سے باتیں کرنے والی موٹروں پر سرگرم سفر ہوتے ہیں، اسی وقت چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچوں اور بچیوں کی ایک فوج سامنے آتی ہے جن کا لباس تار تار ہوتا ہے جو ایک پیسہ کے لئے ان کی موٹروں کے ساتھ دوڑنے لگتی ہے۔

جب تک عرب ملکوں میں فلک بوس محلوں، بہترین کاروں کے ساتھ ساتھ حقیر جھونپڑیاں اور تنگ و تاریک مکانات نظر آئیں گے، جب تک تخمہ و فاقہ ایک شہر میں شباب پر ہوگا اس وقت تک کمیونزم کے لئے دروازے کھلے ہوئے ہیں، ہنگامے، جھگڑے ہونا لازمی ہیں، کوئی پروپیگنڈا اور طاقت اسکو روک نہیں سکتی وہاں اگر اسلامی نظام اپنے جمال و اعتدال کے ساتھ قائم نہیں ہوگا تو تعزیر خداوندی کے طور پر اور ردِ عمل کے طریقہ پر اسکی جگہ ایک ظالم و جابر نظام کا قائم ہونا ضروری ہے۔

تجارت اور مالی نظام میں خود مختاری

عالمِ اسلامی کی طرح عالم عربی کے لئے ضروری ہو کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت و حرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے انھیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی صنعت و محنت کا نتیجہ ہوں، زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں، آلاتِ حرب کسی چیز میں وہ غیروں کے دست نگر اور مغرب کے پروردہ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ عالم عربی اگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مغرب سے جنگ کرنا چاہے تو وہ اس لیے جنگ نہیں کر سکتا کہ وہ اس کا مقروض اور اس کی امداد کا محتاج ہو، جس قلم سے وہ مغرب کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرتا ہو وہ قلم بھی مغرب ہی کا بنا ہوا ہے اگر وہ مقابلہ کرتا ہے تو میدان جنگ میں اسی گولی کو استعمال کرتا ہے جو مغرب کے کارخانہ کی تیار شدہ ہو، عالم عربی کے لئے یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ اپنے دولت کے ذخیروں اور قوت کے سرچشموں سے خود فائدہ

نہ اٹھا سکے، زندگی کا خون اس کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اسی کی رگوں سے دوسروں کے جسم میں پہونچتا ہو، اس کی فوجوں کی ٹریننگ مغرب کے ایجنٹ اور فوجی افسران کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی انھیں کے سپرد ہوں۔ عالم عربی کے لیے ضروری ہو کہ وہ اپنی ضروریات کا خود کفیل ہو، تجارت و مالیات کی تنظیم، درآمد برآمد، قومی صنعت، فوج کی ٹریننگ اور مشینوں اور آلات حرب کی تیاری پر اس کا مکمل قبضہ ہو، ایسے اشخاص کی تربیت کی جائے جو حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور سرکاری فرائض پوری واقفیت، فنی مہارت، دیانت اور خیر خواہی کے ساتھ انجام دیں۔

انسانیت کی سعادت کے لیے عربوں کی ذاتی قربانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس وقت ہوئی جبکہ انسانیت کی شقاوت و بدبختی انتہائی حد کو پہونچ چکی تھی، اس وقت انسانیت کی اصلاح کا مسئلہ ان افراد کی دسترس سے باہر تھا جن کی زندگی ناز و نعمت میں بسر ہو رہی تھی اور جو محنت و مشقت کے برداشت کرنے اور مالی وجانی نقصانات کو جھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور جن کے لیے ہمہ وقت عیش و نشاط کا سامان موجود تھا اس وقت انسانیت کو ایسے افراد درکار تھے جو انسانیت کی خدمت میں اپنے مستقبل کو قربان کر سکتے تھے اور منافع سے دست بردار ہو کر اپنے جان و مال عیش و آرام اور اپنے تمام دنیاوی مفاد کو خطرات و مشکلات کے مقابلہ میں پیش کر سکتے تھے، ان کو اپنے پیشہ و تجارت کی کساد بازاری اور کسی طرح کے مالی نقصان و خطرات کی پروا نہ تھی، جن کو اپنے آباء و اجداد اپنے دستوں اور

قرابت مندوں کی قائم کی ہوئی امیدوں پر پانی پھیر دینے میں تامل نہ تھا، صالح علیہ السلام کی قوم نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہی ان تعلق والوں کی زبان پر بھی جاری ہو جاتا۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ ــــــ اے صالح! تم سے تو ہماری بڑی

فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ ــــــ بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

جب تک دنیا میں ایسے مجاہد تیار نہ ہوں اس وقت تک انسانیت کا بقاو استحکام اور کسی اہم دعوت کا کامیاب ہونا ناممکن ہو، یہ کردار رکھنے والے گنتی کے چند افراد جو دنیا کی اصطلاح میں محروم اور کوتاہ قسمت سمجھے جاتے ہیں انھیں کی بلند ہمتی اور جذبہ قربانی پر انسانیت کی فلاح و کامرانی اور عیش و شادمانی کا دارومدار ہے وہ چند افراد جو اپنی جان کو مصائب میں ڈال کر ہزاروں بندگان خدا کے ابدی مصائب سے بچنے کا سبب بنتے ہیں اور دنیا کے ایک بڑے گروہ کو سرشکر خیر کی طرف لاتے ہیں، اگر چند افراد کی محرومی و ہلاکت ایک پوری ملت کے لیے خوشحالی اور سرفرازی کا باعث ہو اور اگر کچھ مال و زر اور تجارت و حرفت کے نقصان اور گھاٹے سے بیشمار اور لاتعداد انسانوں کے لیے دینی و دنیوی فلاح کا دروازہ کھلتا ہو تو یہ سودا ہر طرح سستا ہے۔

جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ یہ جانتا تھا کہ روم و فارس اور دنیا کی متمدن قومیں جن کے ہاتھ میں اس وقت عالم کی باگ ڈور ہے ہرگز اپنے عیش و نشاط کو نہیں چھوڑ سکتیں وہ اپنی ناز پروردہ زندگی کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتیں، وہ بے یار و مددگار انسانیت کی خدمت، دعوت و جہاد کے لیے مصائب و آلام کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتیں،

ان کے اندر اتنی استطاعت ہرگز نہیں کہ اپنی پر تکلف زندگی اور زیب و زینت کا ایک معمولی سا جزو بھی قربان کریں، ان میں ایسے لوگ بالکل مفقود تھے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھتے ہوں، اپنی حرص و طمع کو روک سکیں، اور جو تمدن کے لوازم اور تعیش کی پابندی سے بے نیاز ہو کر واجبی گزران پر اکتفا کر سکیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پیغام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے ایسی قوم کا انتخاب فرمایا جو دعوت و جہاد کے بوجھ کو اٹھا سکتی تھی اور ایثار و قربانی کے جذبہ سے بھرپور تھی یہ وہی عربی قوم تھی جو طاقتور، سادہ منش، اور جفاکش تھی، جس پر مصنوعی تمدن کا کوئی وار کارگر نہ ہوا اور دنیا کی رنگینیوں کا کوئی جادو نہ چل سکا یہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو دل کے غنی، علم سے بھرپور اور تکلفات سے کوسوں دور تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عظیم الشان دعوت کو لے کر اٹھے اور آپ نے جدوجہد و جانفشانی کا حق پوری طرح ادا کر دیا، اس دعوت کو ہر اس چیز پر ترجیح دی جو آپ کے لئے رکاوٹ کا سبب بن سکتی تھی، آپ خواہشات سے بالکل کنارہ کش تھے دنیا کی دلفریبیوں کا آپ پر کوئی جادو نہ چل سکا یہی وہ چیز تھی جو دنیا کے لئے اسوۂ حسنہ اور رہنما بنی۔ جب قریش کے وفد نے آپ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور آپ کے لئے وہ تمام چیزیں پیش کیں جو ایک نوجوان کے دل کو فریفتہ اور نفسانیت رکھنے والے انسان کو خوش کر سکتی تھیں، مثلاً حکومت و ریاست، عیش و عشرت، دولت و ثروت، تو آپ نے ان تمام چیزوں کو بے تامل ٹھکرا دیا، اسی طرح جب آپ کے چچا نے گفتگو کی اور چاہا کہ آپ کو اس دعوت کے پھیلانے اور اس میں حصہ لینے سے روک دیں تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ اے چچا خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج لاکر

میں بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں جب بھی میں اس کام سے باز نہیں آسکتا اور اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس دعوت کو غالب نہ کر دے یا میں خود اس سلسلہ میں کام نہ آجاؤں، یہی جد و جہد اور قربانی دنیا کی نفع اندوزذہنیت سے بے تعلقی اور پُرمسرت زندگی کے مقابلہ میں تکلیف و مشقت کی زندگی کی ترجیح اہل دعوت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک نمونہ اور اسوہ بن گیا، آپ نے اس سلسلہ میں اپنے اوپر تمام عیش و آرام راحت و آسائش کے دروازے بند کر لیے اور خود اپنے ہی اوپر نہیں بلکہ اپنے پورے خاندان، اہلبیت اور تمام عزیزوں کو بھی عیش و عشرت کے مواقع سے مستفید ہونے کا موقعہ نہیں دیا، وہی لوگ جو آپ سے زیادہ قریب و عزیز تھے زندگی کے عیش و راحت میں انھیں کا حصہ سب سے کم تھا اور جہاد و قربانی میں وہ سب سے آگے رکھے گئے تھے، جب آپ کسی چیز کی حرمت کا ارادہ کرتے تو اس کی ابتدا اپنے قبیلہ اور اپنے ہی لوگوں سے کرتے اور جب کسی حق کی باری آتی یا کوئی نفع پہونچانا ہوتا تو دور کے لوگوں سے شروع کرتے اور بسا اوقات آپ کے قرابت دار اور قبیلہ والے اس سے محروم ہی رہ جاتے، آپ نے جب سودی کاروبار ختم کرنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے کاروبار کو مٹایا اور ان کے تمام سودی منافع کو ختم کر دیا، اسی طرح جاہلیت کے انتقامات و مطالبات کو باطل کرنے اٹھے تو ربیعہ بن حارث ابن عبدالمطلب کے خون کو پہلے باطل کیا، اور جب آپ نے زکوٰۃ کا قانون جاری فرمایا (جو درحقیقت ایک بہت بڑی مالی منفعت ہے اور تاقیامت باقی رہنے والی چیز ہے) تو آپ نے اپنے قبیلہ بنی ہاشم کے لیے اس کو قیامت تک کے لئے حرام کر دیا، فتح مکہ

کے دن جب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ سے بنی ہاشم کے لیے سقایت زمزم کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کی کلید برادری کا مطالبہ کیا تو آپ نے شدت سے انکار فرما دیا اور عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر خانۂ کعبہ کی کنجی ان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ لے عثمان! دیکھو یہ تمھاری کنجی ہو تم اس کو لے لو، آج احسان اور وفا کا دن ہو، اور اب یہ تمھارے خاندان میں ہمیشہ رہے گی کوئی اس کو تم سے نہیں لے سکتا، الا یہ کہ کوئی ظالم اس کی جرأت کرے، آپ نے ازواج مطہرات کو زہد و عسرت اور روکھی پھیکی زندگی گزارنے کی ترغیب دی اور صاف صاف فرمایا کہ اگر تم فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے کے لیے آمادہ ہو تو میری رفاقت اختیار کر سکتی ہو ورنہ ناز و نعمت و راحت کے ساتھ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں اور اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھ کر سنایا:-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝	اے نبی آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجئے کہ تم اگر دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ متاع دیدوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اس کے رسول کو اور عالم آخرت کو، تو تم میں سے نیک کرداروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجر عظیم مہیا کر رکھا ہو۔

لیکن اس انتخاب میں آپ کے گھر والوں نے اللہ اور رسول ہی کو اختیار کیا؛

اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب سنا کہ آپ کے پاس کچھ غلام وخادم آئے ہیں اور جبکہ ان کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے گھٹے پڑ گئے تھے آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچیں کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ایک خادم عنایت فرمادیجئے تاکہ میں کچھ آرام حاصل کر سکوں تو آپ نے ان کو تسبیح وتحمید کی وصیت فرمائی اور کہا کہ تمہارے لیے یہ چیز خادم سے کہیں زیادہ بہتر ہو۔ یہی معاملہ آپ کا اپنے تمام قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ تھا اور جو جتنا ہی قریب ہوتا جاتا اسی قدر اس کی ذمہ داری بڑھتی جاتی۔

مکہ کے لوگ جب ایمان لائے تو ان کی اقتصادی زندگی کا نظام درہم برہم ہوگیا ان کی تجارت کسادبازاری کا شکار ہوگئی اور بعض اپنے اس المال سے بھی محروم ہوگئے تھے جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں جمع کیا تھا، ان میں ایسے بھی ایمان لانے والے تھے جو راحت وآرام کے سامان اور آرائش وزینت کے اسباب بھی ختم کرچکے تھے حالانکہ پہلے ان کی امتیازی شان یہی تھی کہ وہ زینت وآرائش کے دلدادہ تھے اسی طرح اس دعوت کے پھیلانے اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں بہتوں کی تجارت برباد ہوگئی اور کتنے اپنے آبائی دولت کے حقوق سے محروم ہوگئے۔

اسی طرح جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور انصار نے آپ کا ساتھ دیا تو اس کا اثر ان کے کھیتوں، ان کے باغات پر بڑا مگر باایں ہمہ جب انھوں نے اپنا کچھ تھوڑا سا وقت ان کی نگہداشت کے لیے چاہا تو اس کی اجازت نہیں ملی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو متنبہ کیا گیا، ارشاد ہوا:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ	اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

یہی حال عرب اور ان تمام لوگوں کا ہوا جو اس دعوت سے متاثر اور اس پر عمل پیرا ہوئے چنانچہ جہاد کی مشقت اور جان و مال کے خسارہ میں ان کا اتنا بڑا حصہ تھا جو دنیا کی کسی قوم کے حصہ میں نہیں آیا، اللہ تعالیٰ ان سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۔	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمھارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیبیاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول سے، اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجدے اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنیوالوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

مَا کَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا	مدینہ کے باشندوں کو اور ان اعرابیوں کو جو ان کے اطراف میں بستے ہیں لائق نہ تھا کہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں اور پیچھے رہ

يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ | جائیں اور نہ یہ بات لائق تھی کہ انکی جان کی
(التوبہ رع ۱۵) | پرواہ نہ کر کے محض اپنی جانوں کی فکر میں لگ جائیں

اس لیے کہ انسانی سعادت کی عمارت انھیں لوگوں کی قربانیوں کے ستونوں پر قائم ہونے والی تھی اور حالات کی تبدیلی میں صرف اسی بات کا انتظار تھا کہ یہ مہاجرین وانصار اپنے کو مٹا کر انسانیت کی سرسبزی اور قوموں کی ہدایت وفلاح کا فیصلہ حاصل کرلیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ | ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے کچھ خوف بھوک
نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ | مالوں جانوں اور پھلوں کی کمی اور نقصان کے ساتھ
(البقرہ ع)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا | کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان
اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ | لائے اور انکی آزمائش نہ کی جائے گی

اگر عرب اس سرفرازی کو قبول کرنے سے ہچکچاتے اور انسانیت کی اس عظیم خدمت میں تردد سے کام لیتے تو بدبختی اور عالم کے فساد کی مدت اور بڑھ جاتی اور جاہلیت کی تاریکی بدستور دنیا پر چھائی رہتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ | اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ پیدا
وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝ (الانفال ع ۱۰) | ہوگا اور بڑی ہی خرابی پھیلے گی۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہہ پر کھڑی تھی، اس وقت دو ہی راستے تھے، یا تو عرب کے لوگ اپنے جان و مال، آل اولاد اور تمام محبوب چیزوں کو خطرہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے کنارہ کش ہوکر اجتماعی مصلحت

کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی اور انسانیت کی قسمت بدلتی، جنت کا شوق ابھرتا اور ایمان کی ہوائیں چلتیں، یا پھر وہ اپنی خواہشات ومرغوبات اور اپنی انفرادی لذت وعیش کو انسانیت کی سعادت وفلاح پر ترجیح دیتے، تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی وبدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی اور غفلت و مدہوشی کے عالم میں پڑی رہتی، لیکن اللہ تعالیٰ کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لیے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی اور ان کو آخرت اور اس کے بے پایاں ثواب کی ترغیب دی، تو انھوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لیے پیش کر دیا اور اللہ کے ثواب، نوع انسانی کی سعادت کی امید میں انھوں نے دنیا کے تمام عیش و آرام سے آنکھیں بند کر کے اپنے جان و مال کو اللہ کے راستے میں جھونک دیا اور ان تمام چیزوں کو تج دیا جن پر لوگ حریصانہ نظریں اٹھاتے ہیں، انھوں نے پورے خلوص اور صداقت کے ساتھ راہِ خدا میں جانیں دیں اور تکلیفیں کیں، تو اللہ نے ان کو دنیا اور آخرت کے بہترا جر سے نوازا "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" (اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے)۔

آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اسی نقطہ پر پہونچ گئی ہے جہاں پر وہ چھٹی صدی عیسوی میں تھی یہ عالم پھر اسی دوراہہ پر نظر آ رہا ہے جس دوراہہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تھا آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کے لیے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش و ثروت دنیا کی نعمتوں،

ترقی و خوشحالی کے امکانات اور اپنے سامان راحت کو خطرہ میں ڈال دے تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے جس میں وہ مبتلا ہے اور زمین کا نقشہ بدل جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی تسربلندی، ترقی، عہدہ و منصب، تنخواہوں کی بیشی، آمدنی کے اضافہ اور کاروبار کی ترقی کی فکر میں رہیں اور سامان عیش اور اسباب راحت کی فراہمی میں مشغول رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اسی زہریلے تالاب میں غوطہ زن رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہو رہی ہے، اگر اچھے اچھے ذہین عرب نوجوان بڑے بڑے شہروں میں خواہشات کے غلام بن کر بیٹھے رہیں اور اگر ان کی زندگی کا محور صرف مادہ اور معدہ ہے اس کے علاوہ ان کی کوئی اور فکر نہیں ہو اور ان کی تمام جد و جہد صرف اپنی ذاتی زندگی اور اپنی مرفہ الحالی کے گرد چکر لگاری ہے تو ایسی صورت حال میں انسانی سعادت کا تصور بھی مشکل ہے، بعض جاہلی قوموں کے نوجوان ان سے زیادہ حوصلہ مند تھے اور ان کا ذہن ان سے کہیں زیادہ بلند تھا، جب کہ انھوں نے اپنے پسندیدہ مقاصد کی راہ میں اپنی تمام راحت و آرام اور اپنے مستقبل تک کو قربان کر دیا، جاہلی شاعر امراء القیس ان سے کہیں زیادہ باہمت تھا کہتا ہے:۔

ولو اننی اسعی لادنی معیشۃ — کفانی ولم اطلب قلیل من المال

ولکنما اسعی لمجد مؤثل — وقد یدرک المجد المؤثل امثالی

(اگر میں کسی ادنیٰ درجہ کی زندگی کے لیے کوشش کرتا ہوتا تو مجھے تھوڑا سا مال بھی کافی ہوتا اور اس کے لیے ایسی جد و جہد کی ضرورت نہ ہوتی۔)

(لیکن میں تو ایسی عظمت کا طالب ہوں جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور مجھ جیسے آدمی بھی ایسی عظمت کو حاصل کر لیتے ہیں)

دنیا کی سعادت و کامرانی کی منزل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے ایک پل تعمیر کریں، اس پل پر سے گزر کر دنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے، زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ و بار لاتی ہے، وہ وہی انفرادی خواہش و ہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اللہ کی زمین میں امن و سلامتی پھیلانے کے لئے قربان کریں، آج انسانیت کی افتادہ زمین کھاد مانگتی ہے، یہ کھاد راحت و آرام کے مواقع، انفرادی ترقی کے امکانات اور عیش کے اسباب ہیں جن کو مسلمان بالخصوص عرب اقوام قربان کر دینے کا ارادہ کر لیں، چند انسانی جانوں کی جد و جہد اور ان کی قربانیوں سے اگر انسانی گلہ آگ کی راہ سے نکل کر جنت کی راہ پر لگ جاتا ہے تو یہ بڑا سستا سودا ہے اس لئے کہ جو نعمت حاصل ہوگی وہ بہت ہی جنس گراں مایہ ہو اور اس کے لئے جو کچھ قربان کرنا پڑے وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہی معمولی اور ارزاں ہے ہے

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

عالم اسلامی کی توقع عالم عربی سے

عالم عربی اپنی خصوصیات محل وقوع اور اپنی سیاسی اہمیت کی بنا پر اسلام کی دعوت کی ذمہ داری اٹھانے کا حقدار ہے، وہ یہ کر سکتا ہے کہ عالم اسلامی کی قیادت کا بیڑہ اٹھائے اور مکمل تیاری کے بعد یورپ سے آنکھیں ملا سکے، اور اپنے

ایمان، دعوت کی طاقت، اور خدا کی نصرت سے اس پر غالب آجائے اور دنیا کو شر سے خیر کی طرف، تباہی و بربادی سے امن و سلامتی کی طرف لے آئے یا جس طرح مسلمانوں کے قاصد نے یزدگرد کی مجلس میں کہا تھا،

"انسانوں کی پرستش سے نکال کر خدائے واحد کی پرستش میں، دنیا کی تنگی سے دین کی کشادگی میں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کی عدل گستری میں داخل کرے"

عالم انسانی عالم اسلامی کی طرف اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے اور عالم اسلامی عالم عربی کی طرف اپنے لیڈر اور رہبر کی حیثیت سے نظریں اٹھائے ہوئے ہے، کیا عالم اسلامی عالم انسانی کی توقع کو پورا کر سکتا ہے اور کیا عالم عربی عالم اسلامی کے سوال کا جواب دے سکتا ہے؟ عرصہ سے مظلوم انسانیت اور برباد شدہ دنیا اقبال کے پُر درد الفاظ میں مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہے اس کو اب بھی یقین ہے، کہ جن مخلص ہاتھوں نے کعبہ کی تعمیر کی تھی وہی دنیا کی تعمیر نو کا فرض انجام دے سکتے ہیں ؎

ناموس ازل را تو امینی تو امینی ۔۔۔ دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی ۔۔۔ صہبائے یقیں درکش واز دیر گماں خیز

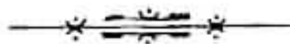
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

فریاد از افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ ۔۔۔ فریاد ز شیرینیٔ و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ — معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز!

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز



اشاریہ

(انڈکس)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

اشخاص

غ

کتابیات

مقامات

ادارے اور تحریکیں

INDEX